الوحی المحمدی ﷺ

ترجمہ
حافظ سید رشید احمد ارشد

مصنفہ
...ید رضا
...ار

دورِ حاضر کے تمدنی، علمی اور سیاسی و قومی مسائل اور رجحانات کے پس منظر میں
انسانوں کے سامنے مقاصد نبوت اور قرآن حکیم کی تعلیمات کا خلاصہ
جس میں اسلام پر مغرب کے اعتراضات کے مدلل جوابات دیے گئے ہیں۔

الوحی المحمدی ﷺ

مصنف
علامہ سید رشید رضا
مدیر المنار

ترجمہ
حافظ سید رشید احمد ارشد

حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ

الوحی المحمدی ﷺ

از

علامہ سید رشید رضا

ترجمہ

حافظ سید رشید احمد ارشد

اشاعت اول: 2009ء
کمپیوٹر لے آؤٹ: ندیم احمد سولنگی
طابع: ذکی سنز پرنٹرس کراچی
ناشر: حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ کراچی

ہدیہ: =/250 روپے

ایڈریس:
حکمتِ قرآن انسٹیٹیوٹ
6 سندھی جماعت کوآپریٹو سوسائٹی، جوگی موڑ بس اسٹاپ
نیشنل ہائی وے کراچی۔75030
رابطے کیلئے 021-4213117
0300-2707097

web:www.hikmatequran.org

فہرست

عرضِ ناشر

علامہ سید محمد رشید رضا شام کے رہنے والے تھے۔ 1897ء میں طرابلس الشام میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد عالم کی سند حاصل کی اور وہیں درس و تدریس میں مصروف ہو گئے۔ جمال الدین افغانی کے عربی مجلد 'العروۃ الوثقیٰ' سے متاثر ہو کر پان اسلامزم کے حامی بنے اور 1897ء میں قاہرہ، مصر پہنچ کر سید جمال الدین افغانی کی شاگرد مفتی محمد عبدہ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ وہاں تعلیم و تحریر کے ساتھ علامہ سید رشید رضا نے اپنے استاد کے مشورہ سے ایک مذہبی رسالہ 'المنار' کے نام سے 1898ء میں شائع کیا جس سے ان کو اپنے افکار مصر اور دیگر اسلامی دنیا میں فروغ دینے کا موقع ملا۔ انہوں نے تقریباً چودہ کتابیں لکھیں، لیکن ان میں 'تفسیر المنار' اور 'الوحی المحمدی ﷺ' کو زیادہ علمی شہرت ملی۔ 'تفسیر المنار' کا کام اس کے استاد مفتی محمد عبدہ نے شروع کیا تھا اور علامہ سید رشید رضا نے آگے بڑھایا اور بارہ پارے ہی مکمل کر پائے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔

یہ کتاب 'الوحی المحمدی ﷺ' اس پس منظر میں لکھی گئی ہے کہ مستشرقین جس طرح حضرت محمد ﷺ کی عظمت اور ایک مذہبی رہنما کے طور پر ان کی کاوشوں کے قائل تو نظر آتے ہیں لیکن وہ اس بات کے قائل نظر نہیں آتے کہ حضرت محمد ﷺ نے یہ کارنامے وحی الٰہی کے ذریعہ سر انجام دیے ہیں۔ اور یہ کہ قرآن کریم خدا کا کلام اور اس کی نازل کردہ کتاب ہے۔ وہ عقل اور سائنس کے ذریعے وحی الٰہی کی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہیں اور جو کچھ عقل کے معیار پر نہ اترے اسے وہ تسلیم نہیں کرتے۔ یہی وہ بنیادی اختلاف ہے جس کی ہر باب میں ایسے معقول دلائل کے ساتھ تردید کی گئی ہے جسے آج کل کے ترقی یافتہ زمانے کے مغربی علماء سمجھ سکیں۔ علامہ صاحب نے اس کتاب میں جابجا اپنے دلائل کو ثابت کرنے کے لیے قرآن حکیم کی آیات کے حوالے دیے ہیں اور مقاصد قرآن کی ایک گراں قدر علمی تفصیل بھی پیش کی ہے جس سے اس کتاب نے 'علوم القرآن' کے حوالے سے ایک شہ پارے کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔

علامہ سید رشید رضا بین الاسلامی قومیت کے زبردست حامی تھے۔ اپنے دور کی پان اسلامزم تحریک سے بہت متاثر رہے اور اس کا اثر ان کی اس کتاب سمیت تمام تحریروں میں

جابجا نظر آتا ہے۔ اسلامی بین الاقوامیت کی سوچ یا جذبہ اپنی جگہ پر ایک مسلمان کے ایمان کا لازمی تقاضا ہوتا ہے لیکن پان اسلامزم کے علمبرداروں نے جس طرح اس کو اقوام کے تشخص کی نفی میں ایک رد عمل کے طور پر پیش کیا اس کی غیر فطری تعبیر کی وجہ سے عملاً وہ سوچ مسلمان اقوام میں کوئی جگہ نہ بنا سکی۔ خود سید رشید رضا نے اتحاد اسلامی کے لیے 'الجامعۃ الاسلامیہ' کے نام سے ایک بین الاسلامی انجمن کی تجویز بھی پیش کی جس کا صدر مقام مکہ معظمہ ہو اور تمام اسلامی ممالک میں اس کی شاخیں ہوں لیکن وہ تجویز بھی عمل کی شکل اختیار نہیں کر سکی۔

اس کے برعکس برصغیر میں حضرت امام شاہ ولی اللہؒ بین الاقوامی سوچ کے سب سے بڑے داعی بن کر ابھرے لیکن انہوں نے قوموں کے وجود کو انسانوں کی تہذیبی ترقی کی لازمی اساس قرار دیا اور کہا کہ اقوام کی یہ وحدتیں باہم مل کر ایک بین الاقوامی نظریہ و فکر کے تحت بین الاقوامیت تشکیل دیں گی، ایسی بین الاقوامیت جس میں قومیں اپنا مستقل وجود رکھتی ہوں۔ لیکن اس فکر کے سائے میں وہ تمام اقوام اعلیٰ انسانیت کے مقاصد کو سب سے اہم سمجھتی ہوں۔

امام شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں ارتفاقات کی بحث میں انسان کے تہذیبی درجوں کی تفصیل میں اقوام اور بین الاقوامیت کے اختیار اور دائرہ کار کی وضاحت بھی بیان کی۔ امام شاہ ولی اللہ کے بعد اس کی پیدا کردہ جماعت نے برصغیر اور اس کے باہر ایسا بین الاقوامی نظام تشکیل دینے کی فکری و عملی کوششیں تاحال جاری رکھیں ہیں۔

بہر حال سید رشید رضا کی کتاب وحی محمدی کو علمی طور پر سمجھنے کے لیے عالم اسلام میں گراں قدر کوشش کی حیثیت حاصل ہے۔ اس سے استفادہ کے لیے کراچی یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے پروفیسر حافظ سید رشید احمد نے 1959ء میں اس کا انتہائی سلیس اردو ترجمہ کیا جو ایک مرتبہ ہی شایع ہوا۔ عرصہ دراز کے بعد عہد حاضر کے علوم القرآن کے طالبین کے لیے حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ کی طرف سے اس کو شایع کرنا ہم اپنے لیے صد افتخار سمجھتے ہیں۔

ابوالفضل نور احمد

ڈائریکٹر

حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ

پیش لفظ

یہ کتاب علامہ محمد رشید رضا کی مشہور کتاب "الوحی المحمدی" کا ترجمہ ہے۔ لہٰذا کتاب اور اس کے ترجمہ کے بارے میں کچھ لکھنے سے پیشتر یہ ضروری ہے کہ مصنف کے مختصر حالات بیان کیے جائیں۔

علامہ سید محمد رشید رضا شام کے رہنے والے تھے۔ وہ خاندان سادات کے چشم وچراغ تھے۔ طرابلس الشام کے ایک چھوٹے شہر قلمون میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے طرابلس الشام کے مشہور مدارس میں تعلیم حاصل کی۔ ان کے اساتذہ میں شیخ حسین الجسر زیادہ مشہور ہیں۔ جنہوں نے مشہور کتاب "الرسالۃ الحمیدیہ" تحریر فرمائی تھی جو ۱۸۸۹ء میں شائع ہوئی۔ غالباً شیخ موصوف شام ومصر میں سب سے پہلے عالم تھے جنہوں نے عقل وسائنس کے مطابق اسلامی عقائد وارکان کو پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور اس طرح اس زمانے کے نوجوانوں کے سامنے معقول دلائل سے اسلام کی صداقت کو ثابت کیا۔ انہوں نے اسے خلیفہ عبدالحمید خاں کے نام معنون کر کے رسالہ کا نام الرسالہ الحمیدیہ رکھا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ پہلے روشن خیال عالم تھے جنہوں نے علامہ سید رشید رضا میں روشن خیالی کی جھلک پیدا کی اور مفتی محمد عبدہ کی صحبت سے مستفید ہونے کے لیے راہ ہموار کی۔

علامہ موصوف نے ۱۸۹۷ء میں طرابلس الشام میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد "عالم" کی سند حاصل کی اور وہیں درس وتدریس میں مصروف ہو گئے۔ ابتدا میں ان پر تصوف کا اثر غالب تھا اور وہ روحانی اشغال واذکار میں مصروف رہتے تھے۔ وہ اپنے گاؤں میں قرآن کریم کا درس بھی دیتے تھے اور اپنے درس اور وعظ کی محفلوں میں لوگوں میں عذاب الٰہی کا ذکر کر کے ان میں تقویٰ اور خوف الٰہی پیدا کرتے تھے، جیسا کہ صوفی مشرب علماء کا عام طریقہ تھا۔ نیز قدیم علماء کی طرح پختہ مقلد بھی تھے۔ اس عرصے میں انہیں اپنے

والد صاحب کے ہاں سید جمال الدین افغانی کے عربی مجلۃ "العروۃ الوثقیٰ" کے مطالعہ کا موقع ملا۔ ان پرچوں کے پڑھنے سے ان کے خیالات میں تبدیلی ہوئی اور انہیں مزید پرچوں کے پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے استاد شیخ حسین الجسر کے ذریعے اور دیگر ذرائع سے العروۃ الوثقی کے تمام پرچے مہیا کر لیے اور نہایت غور و فکر سے ان کا مطالعہ کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سید جمال الدین افغانی کے بے حد معتقد ہو گئے اور اس طرح ان کے خیالات وافکار میں زبردست انقلاب آیا اور وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ موجودہ زمانے کے حالات کے مطابق مسلمانوں میں مذہبی، سیاسی اور معاشرتی انقلاب پیدا کرنے کے لیے جدوجہد اور منظم عمل کی ضرورت ہے۔ چنانچہ انہوں نے سید جمال الدین افغانی کو ایک خط لکھا اور ان سے ملاقات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ مگر حالات کچھ ایسے رونما ہوئے کہ ان کی سید موصوف سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ جب وہ سید جمال الدین افغانی کی ملاقات سے محروم ہو گئے تو ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ مصر جا کر سید جمال الدین افغانی کے شاگرد رشید مفتی محمد عبدہ کی صحبت سے مستفید ہوں۔ لہٰذا اپنی تعلیم کو مکمل کرنے کے بعد وہ ماہ رجب ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں مصر پہنچے اور دوسرے دن ہی صبح کے وقت وہ مفتی محمد عبدہ کے شاگرد ہو گئے۔ ان کے انتقال تک وہ انہی کے ساتھ رہے۔ وہ اپنے استاذ کے ہر درس میں شریک ہوتے تھے، ان کی تصانیف کو لکھتے اور انہیں شروح و حواشی کے ساتھ شائع کرتے تھے۔

مجلۃ المنار:

قاہرہ پہنچنے کے بعد علامہ رشید رضا نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا اور اپنے استاد کے مشورے سے ایک مذہبی رسالہ "المنار" کے نام سے ۲۲ شوال ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو شائع کیا۔ شروع میں یہ آٹھ صفحہ کا ہفتہ وار اخبار تھا مگر دوسرے سال سے ماہانہ مجلّہ کی صورت میں تبدیل کر دیا گیا۔ تین چار سال تک اس کی اشاعت بہت محدود رہی کیونکہ اس کے حریت آموز مضامین اور سیاسی اور مذہبی تنقیدوں کی وجہ سے شام اور ترکی کے تمام مقبوضہ علاقوں میں اس کی اشاعت بند تھی۔ تاہم رفتہ رفتہ پانچویں سال اس کی اشاعت میں اضافہ ہونے لگا۔ یہاں تک کہ بارھویں سال یعنی ۱۹۰۹ء میں اس کے پرانے پرچوں کی فرمائش اس قدر بڑھی کہ پہلی جلد کے بقایا پرچے اصل قیمت سے چوگنی قیمت پر

فروخت ہوئے۔ پھر بھی فرمائش ہوتی رہی یہاں تک کہ انہیں دوبارہ چھاپا گیا۔

مجلۃ المنار نے تمام اسلامی دنیا میں زبردست انقلاب برپا کیا۔ اس نے مذہب اسلام کو دنیا کے سامنے ایک ایسے عالمگیر مذہب کی حیثیت سے پیش کیا جس کے اندر عصر حاضر کی تمام مشکلات کا حل پوشیدہ ہے۔ علامہ موصوف نے اس مجلہ کے ذریعے نہ صرف اسلام کے اصلاحی پیغام کو دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچایا بلکہ اس میں خود مفتی محمد عبدہ کی تفسیر اور دوسرے مضامین شائع ہوئے تھے۔ ایک حصے میں دنیا کے ہر حصے کے فتووں کا جواب دیا جاتا تھا۔ اس مجلہ نے نہ صرف اندرونی طور پر مسلمانوں کے ہاں سے بری رسومات و بدعات کا قلع قمع کیا بلکہ غیر مسلموں میں بھی مذہب اسلام سے دلچسپی پیدا کی اور وہ اپنی تنگ نظری اور تعصب کو چھوڑ کر اسلام کا غیر متعصبانہ نقطہ نگاہ سے مطالعہ کرنے لگے۔

علامہ محمد رشید رضا نے نہ صرف اپنے قلم کے ذریعے اسلام کی خدمت کی بلکہ اس سلسلے میں عملی قدم بھی اٹھایا۔ انہوں نے اتحاد اسلامی کے لیے الجامعۃ الاسلامیہ کے نام سے ایک ایسی بین الاسلامی انجمن کی تجویز بھی پیش کی جس کا مرکزی مقام مکہ معظمہ ہو اور تمام اسلامی ممالک میں اس کی شاخیں قائم ہوں۔ مگر یہ اسلامی ملکوں کی نااتفاقی اور اغیار کی سیاسی چالوں کی وجہ سے ایسی تجویز جس کے لیے سید جمال الدین افغانی اور مفتی محمد عبدہ ساری عمر کوشاں رہے عملی جامہ نہیں پہن سکی۔ لہٰذا اس قسم کے حالات کے پیش نظر علامہ موصوف نے اپنی اصلاحی، مذہبی اور علمی تحریکات کو سیاست سے الگ رکھا، وہ مذہبی علماء اور قومی کارکنوں کو بھی یہی نصیحت کرتے تھے کہ اگر موجودہ حالات میں اپنی اصلاحی تحریکات کو کامیاب بنانا چاہتے ہیں تو انہیں سیاسیات میں عملی حصہ نہیں لینا چاہیے۔

جب مصر میں قومیت کا سیلاب امنڈ آیا تو اس موقع پر بھی علامہ رشید رضا نے نہایت بے باکی کے ساتھ قوم پرستوں کی اس روش پر ہمیشہ نکتہ چینی کی جو بین الاسلامی قومیت کے منافی تھی۔ وہ سخت سے سخت زمانوں میں بھی اسلامی اصولوں سے ایک انچ نہیں ہٹے اور تاریکی کے دور میں بھی اپنی اسلامی مشعل "المنار" کو پوری آب و تاب کے ساتھ روشن رکھا۔ گو انہوں نے اپنی کوئی مستقل جماعت نہیں قائم کی، تاہم مصر و شام میں ہر وہ آدمی جو اسلامی اصولوں پر مستقل مزاجی سے عمل پیرا ہو، وہ المنار پارٹی سے متعلق سمجھا جاتا تھا۔

جمعیۃ الدعوۃ والارشاد:

علامہ رشید رضا نے اپنے مجلّہ المنار کے ذریعے مصر اور دیگر اسلامی ممالک میں تعلیم کو عام کرنے میں بہت بڑا حصہ لیا۔ انہوں نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ تمام مدارس میں اسلام کے عقائد و فرائض کی تعلیم کا معقول بندوبست ہونا چاہیے۔ وہ ایسے مدارس کے قیام کو مساجد کی تعمیر سے زیادہ ضروری سمجھتے تھے جن میں مذہبی تعلیم کا بھی انتظام ہو۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے اعلیٰ مدرس اور مبلغ پیدا کرنے کے لیے انہوں نے "جمعیۃ الدعوۃ والارشاد" کی بنیاد ڈالی۔ ابتداء میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس تحریک کا مرکز آزاد ماحول میں ہو، جہاں استعماری طاقتوں کی ریشہ دوانیاں اسے نقصان نہ پہنچا سکیں، اس لیے اس کام کے لیے اس کا مرکز ترکی تجویز ہوا، اور سید رشید رضا اس مقصد کے لیے سال بھر تک قسطنطنیہ میں رہے۔ ترکی کی حکومت نے کسی قدر ترمیم کے بعد اس تحریک کو منظور کر لیا تھا مگر وزارت کے ٹوٹنے کی وجہ سے سارا منصوبہ ناکام ہو گیا۔ آخر کار اس انجمن اور اس کے تعلیمی ادارے کو قاہرہ ہی میں قائم کرنا پڑا۔ اس انجمن کے صدر محمود بے سالم اور نائب صدر سید رشید رضا مقرر ہوئے۔ وہ اس کے تعلیمی ادارے کے پرنسپل بھی مقرر کیے گئے۔ یہ تعلیمی ادارہ قاہرہ کے جزیرہ الروضہ میں قائم کیا گیا تھا اور اس کی رسم افتتاح ۱۲ ربیع الاول ۱۳۳۰ھ مطابق ۲ مارچ ۱۹۱۲ء میں ہوئی۔

اس تبلیغی کالج میں جدید قسم کے نصاب کے علاوہ مذہبی تربیت پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ اس میں ان فارغ التحصیل طلبہ کو داخل کیا جاتا تھا جن کی عمر بیس اور پچیس سال کے درمیان ہو۔ دور دراز کے ممالک کے طلبہ کو ترجیح دی جاتی تھی۔ جیسے چین، ہندوستان، ملایا وغیرہ۔ کیونکہ ان ممالک کے مسلمان مذہبی تعلیم و تبلیغ کے زیادہ محتاج تھے۔ لہٰذا جب اس قسم کے تبلیغی ادارے کی اطلاع دنیا کے مسلمانوں کو ہوئی تو مشرقی افریقہ، شمالی افریقہ، ترکی، روس، ترکستان، ہندوستان، انڈونیشیا اور ملایا تک کے مسلمان طلبہ اس تبلیغی کالج میں داخل ہو گئے۔ قدیم اسلامی مدارس کی طرح یہاں بھی تعلیم قیام وطعام طلبہ کے لیے مفت تھا۔ بلکہ ضرورت مندوں کو مالی امداد بھی دی جاتی تھی۔ یہاں کا ابتدائی نصاب تین سال کا تھا۔ اس کے فارغ التحصیل کو "مرشد" کی سند دی جاتی تھی۔ مذہبی معلم و مبلغ بننے کا حقدار ہو جاتا تھا۔ مزید تین سال کے نصاب کی تکمیل کرنے کے بعد ایسے طلبہ داعین کہلاتے تھے اور وہ غیر مسلموں میں تبلیغ کرنے کے لیے بھیجے جاتے

تھے۔ اس ادارے کے قیام سے علامہ موصوف کا اصل مقصد یہ تھا کہ مغربی مشنریوں کے مقابلے میں نہایت اعلیٰ درجے کے مبلغ تیار کیے جائیں۔

علمی مقام:

علامہ رشید رضا کا علمی مقام بہت بلند تھا اور یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ سید جمال الدین افغانی اور مفتی محمد عبدہ کے بعد دنیائے عرب میں اس قدر بلند مرتبہ عالم کوئی پیدا نہیں ہوا۔ ان کی وفات سے جو جگہ خالی ہوئی ہے موجودہ حالات میں اس کا پر ہونا بہت مشکل ہے۔ نہ صرف دنیائے اسلام کے علماء ان کی علمیت کا لوہا مانتے تھے بلکہ مغربی علماء اور مستشرقین بھی ان کی زبردست علمیت کے قائل تھے۔ چنانچہ مستشرق گولڈ سیہر جس نے جرمن زبان میں اسلامیات پر ایک زبردست کتاب لکھی ہے یہ تحریر کرتا ہے: [1] "مختلف احادیث کی جرح و تعدیل میں رشید رضا نے جس قابلیت کا ثبوت دیا ہے اس سے بعض اوقات قدیم نقاد محدثین کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔"

امیر شکیب ارسلان نے کئی صفحات علامہ رشید رضا کی علمی قابلیت کے بارے میں تحریر کیے ہیں جن کا اقتباس حسب ذیل ہے: [2]

"مفتی محمد عبدہ کا عالم اسلامی پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے علامہ سید رشید رضا کی المنار کے شائع کرنے میں معاونت فرمائی جو اس عظیم مصلح کے خیالات و افکار کا ترجمان ہے۔ علامہ رشید رضا مفتی محمد عبدہ کے صحیح جانشین ہیں۔ ان کی معلومات اسلامی علوم منقول و معقول میں اس قدر وسیع ہیں اور عہد حاضر کے ضروریات کے مطابق وہ اس قدر صحیح فتویٰ دیتے ہیں کہ اس سلسلے میں ہمیں ان کا کوئی جانشین نظر نہیں آیا۔ دنیائے اسلام میں کوئی عالم ایسا نہیں ہے جو ان کے بلند علمی مقام تک پہنچ سکے۔ ان کے مجلہ المنار اور ان کی تفسیر المنار نے ان کے نام کو غیر فانی بنا دیا ہے۔ انہوں نے اسلام کی حمایت اور ملحدوں کی تردید میں جو کچھ لکھا ہے، ہم میں سے کوئی اس بارے میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ہم ان کی اس تعریف میں کوئی مبالغہ نہیں کر رہے ہیں بلکہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ معاصر ہونے کی وجہ سے کسی کی حق تلفی کریں۔

---

[1] اسلام اور تحریک تجدد بمصر میں از چارلس آدم
[2] حاضر العالم الاسلامی جلد اول، صفحات ۲۸۴-۲۸۶

"سید محمد رشید رضا نے الاستاذ الامام (مفتی محمد عبدہ) کی دو بڑی جلدوں میں سوانح حیات تحریر فرمائی ہے جو دو ہزار صفحات سے زائد ہے اور عنقریب تیسری جلد بھی شائع ہونے والی ہے۔ اس کتاب میں جمال الدین افغانی اور دوسرے علماء کے حالات اور دیگر تاریخی معلومات بھی ہیں جو کسی دوسری کتاب میں نہیں پائی جاتیں۔ سید رشید رضا کا موجودہ زمانے میں سب سے بڑے محدثین میں شمار ہے۔ انہیں اس فن حدیث اور اس کی جرح و تعدیل میں زبردست کمال حاصل ہے۔ وہ جب تک کسی حدیث کی جملہ اسناد پر حاوی نہیں ہوتے اس وقت تک ان کے دل کو اطمینان نہیں ہوتا۔ وہ سلف صالحین کے طریقے کے مطابق احادیث کو پوری اسناد کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔"

"حال ہی میں ان کی ایک نہایت عمدہ تصنیف بعنوان "نداء الی الجنس اللطیف" شائع ہوئی ہے جس میں انہوں نے اسلام میں حقوق نسواں اور اسلام کے سماجی مسائل کو تحقیق کر کے تحریر کیا ہے۔ مثلاً تعدادِ ازدواج، غلامی، پردہ، طلاق وغیرہ۔ اس کتاب میں مصنف موصوف نے شریعت اسلامی کے مصالح کو واضح دلائل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ کتاب کی اصل حقیقت تو اس کے مطالعہ ہی سے معلوم ہو سکتی ہے تاہم نمونہ کے طور پر اس کے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔

"علامہ موصوف اپنے ایک باب بعنوان" اسلام میں غلامی کی صحیح حقیقت" میں اس طرح رقمطراز ہیں:

"قدیم اقوام میں جس طرح کنیزیں رکھنے کا طریقہ رائج تھا اور اس کے بعد حال کے زمانے تک جو طریقہ مروج رہا۔ وہ اسلامی شریعت میں زنا اور حرام کاری ہی کے مرادف ہے جس کا مرتکب سخت عذاب کا مستحق ہے۔ اور جو کوئی اس پوشیدہ یا علانیہ بدکاری کو جائز سمجھے، اس کا مذہب اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اسلام میں جو کنیزیں اور غلام جائز قرار دیئے گئے تھے وہ وہی تھے جو مذہبی جنگوں کے قیدی تھے۔ یہ اس وقت غلام بنائے جاتے تھے جبکہ خلیفہ اسلام انہیں غلام بنانے کا حکم دے اور وہ اس وقت حکم دے سکتا ہے جب ارباب حل و عقد کے مشورہ کے بعد اسے یقین ہو جائے کہ انہیں آزاد کرنے یا ان سے فدیہ لینے سے زیادہ انہیں غلام بنانا بہتر ہوگا۔ لہٰذا غلام بنانا اسلام میں ضروری نہیں ہے بلکہ یہ اس وقت جائز ہے جب کہ موجودہ معاشرہ کے

لیے مفید ہو اور کسی ضرر کا اندیشہ نہ ہو۔ للذا ہر اسلامی حکومت غلامی کا انسداد کر سکتی ہے، بلکہ اس کا انسداد کرنا اسلامی مقاصد کے عین مطابق ہے۔ اس لیے موجودہ زمانے میں کالے اور گورے لوگوں کو غلام بنانا اسلام کی رو سے قطعی ناجائز ہے۔ للذا ایسی عورتوں کو کنیزیں بنانا جنہیں دلال چھین کر یا چرا کر لے آتے ہیں یا جن کے والدین اور رشتہ دار انہیں فروخت کر دیتے ہیں یا جنہیں تاجر اور دوسرے ایجنٹ اغوا کر کے بیچ دیتے ہیں ان سب میں خدا اور رسول ﷺ کی نافرمانی ہے۔

"اس قسم کی تحریروں سے یہ پتہ چل سکتا ہے کہ سید محمد رشید رضا اسلامی شریعت کے اسرار و رموز سے جس قدر واقف ہیں کوئی دوسرا واقف نہیں ہے۔ اگر کوئی جامد عالم ہوتا اور اس سے اس معاملے میں سوال کیا جاتا تو وہ فوراً بلا تامل یہ جواب دیتا کہ غلام بنانا جائز ہے۔ بلکہ اسے منع کرنا حرام ہے اور کافروں کی عورتوں کو قید کرنا غیر مشروط طور پر جائز ہے اور اس کی ممانعت کرنا قطعی حرام ہے کیونکہ اسلام میں یہی طریقہ رائج رہا، للذا مذہبی اصولوں کو بلا چوں چرا قبول کرنا چاہیے۔

اگر ان سے یہ کہا جائے کہ یہ باتیں آج کل پسند نہیں کی جاتیں اور انہیں باقی رکھنے سے مسلم قوم کو نقصان پہنچتا ہے اور لوگ ان کے دشمن بن جائیں گے تو ان تمام باتوں کے جواب میں یہ جامد عالم صرف یہ ایک بات کہے گا "ہمارا یہ مذہبی اصول ہے اور ہم اس کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتے۔" وہ اس پر کبھی غور نہیں کرے گا کہ اس قسم کی باتوں سے اسلام کو کس قدر نقصان پہنچ سکتا ہے۔ بہر حال علامہ موصوف نے ایسے موقع پر اسلامی روح اور اس کے مزاج کو سمجھ کر وہ جواب دیا ہے جسے ہم اوپر نقل کر آئے ہیں۔"

امیر شکیب کے اس طویل اقتباس کو ہم نے اس لیے نقل کیا ہے تاکہ قارئین کرام کے سامنے موجودہ زمانے کے ایک اہم مسئلہ شرعیہ یعنی غلام کے بارے میں صحیح فتویٰ کا نمونہ مل سکے اور وہ علامہ رشید رضا کی روشن خیالی اور صحیح علمی تدبیر کا اندازہ لگا سکیں۔ اس بارے میں مجاہد ملت امیر شکیب ارسلان کی تحریر و تائید ہمارے لیے مزید ثبوت بہم پہنچاتی ہے۔ [o]

---

[o] مزید سوانح حیات کے لئے مجلہ المنار جلد ۱ صفحہ ۷۵۱، جلد ۲۸ صفحہ ۷۵۰ ملاحظہ فرمایئے۔

تصانیف:

ا۔ تفسیر المنار:

علامہ سید محمد رشید رضا کا سب سے بڑا کار نامہ اور شاہکار ان کی تفسیر المنار ہے۔ تفسیر کا یہ سلسلہ مفتی محمد عبدہ نے سید رشید رضا کے بے حد اصرار پر جامعہ ازہر میں خطبات کی صورت میں شروع کیا تھا جن کا مسودہ خود رشید رضا لکھا کرتے تھے اور مفتی محمد عبدہ کی ترمیم واصلاح کے بعد المنار میں شائع ہوتا تھا اور بعد میں یہ سلسلہ کتابی صورت میں انہی کی زندگی میں شائع ہونا شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے سورہ العصر کی تفسیر شائع ہوئی۔ اس کے بعد "عم یتسالون" کی سورتوں اور سورہ فاتحہ کی تفسیر شائع ہوئی۔

مفتی محمد عبدہ کی وفات کے بعد تفسیر قرآن کریم کا یہ بے نظیر سلسلہ سید رشید رضا نے جاری رکھا اور ان کی وفات تک اس کی بارہ جلدیں یعنی صرف بارہ سپاروں کی تفسیر شائع ہو سکی۔ آخری بارھویں جلد ماہ محرم ۱۳۴۵ھ میں شائع ہوئی۔ افسوس ہے علامہ موصوف کی وفات سے تفسیر کا یہ بے مثل سلسلہ مکمل نہ ہو سکا۔ تاہم جو کچھ ہے وہ بھی اس قدر اہم ہے کہ اسے قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے دنیا کی مشہور زبانوں بالخصوص اردو زبان میں جلد شائع کرنا چاہئے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ موجود کتاب اور اس میں جابجا اس کے حوالوں اور اقتباسات سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس تفسیر میں انہوں نے صحیح احادیث سے بہت مدد لی ہے اور موقع و محل کے لحاظ سے عصر حاضر کی مشکلات کا حل قرآن کریم کے ذریعے کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے اسرائیلی روایات کو قطعی طور پر نظرانداز کیا ہے۔ ان کی تفسیر میں مباحث اور دیگر مذہبی خیالات واذکار پر امام غزالی، ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد ابن القیم کے اثرات زیادہ غالب ہیں، مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ عصر حاضر کی بیماریوں کے بھی زبردست نباض ہیں۔

۲۔ تاریخ الامام:

ان کی دوسری اہم تصنیف ہے جس کا ذکر مذکورہ بالا اقتباس میں امیر شکیب ارسلان نے بھی کیا ہے۔ مفتی محمد عبدہ کی یہ مکمل اور مستند سوانح عمری تین جلدوں میں شائع ہوئی۔

۳۔ نداء الی الجنس اللطیف :

اس کا حوالہ اور اقتباسات موجودہ کتاب کے ایک آخری باب میں بھی آئے ہیں اور خود امیر شکیب ارسلان نے بھی اپنے مذکورہ مضمون میں اس کی تعریف کی ہے اور اس میں سے مذکورہ اقتباس نقل بھی کیا ہے۔

۴۔ الخلافۃ اوالامامۃ الکبریٰ :

مسئلہ خلافت کے بارے میں ہے۔

۵۔ ذکر المولد النبوی :

صحیح قسم کا میلاد شریف۔

۶۔ خلاصہ السیرۃ النبویہ۔

۷۔ المصلح والمقلد (الوحدۃ الاسلامیہ)

۸۔ الوھابیون والحجاز۔

۹۔ الصلب والفداء

۱۰۔ یسر الاسلام واصول التشریع العام

۱۱۔ المنار والازھر

۱۲۔ ترجمۃ القرآن ومافیھا من المفاسد

۱۳۔ شبھات النصاریٰ وحجج الاسلام

۱۴۔ الوحی المحمدی :

ان کے علاوہ مجلہ المنار کی تقریباً چوبیس جلدیں شائع ہو چکی ہیں جو ایک قسم کا اسلامی انسائیکلو پیڈیا ہے۔ نیز انہوں نے اپنے استاد مفتی محمد عبدہ کی بہت سی تصانیف مع شروح وحواشی شائع کیں اور بعض نایاب اسلامی کتب مثلاً تفسیر ابن کثیر، تفسیر بغوی، دلائل الاعجاز واسرار، البلاغۃ للجرجانی وغیرہ بڑی محنت وجانفشانی اور صحت کے ساتھ شائع کیں۔ نیز انہوں نے انجیل برناباس کا نایاب نسخہ بھی شائع کرایا جس سے عیسایت کی موجودہ اناجیل اور ان کے اصولوں کی تردید ہوتی ہے۔

الوحی المحمدی اور اس کا ترجمہ :

الوحی المحمدی کو ہم نے ان کی تصانیف کی فہرست میں سب سے آخر میں رکھا ہے مگر یہ ان کی مقبول اور اہم تصانیف میں شامل ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ خود مصنف کی زبانی اس کتاب کے تینوں ایڈیشنوں کے دیباچوں کے ترجمہ سے معلوم ہوگا۔ یہ ان کی شاہکار تصنیف تفسیر المنار کا خلاصہ اور لب لباب ہے اور اپنے زور بیان اور اسلامی جوش وخروش کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہے۔

اس کتاب میں مصنف نے قرآن کریم کو ناقابل تردید دلائل کے ذریعے خدا کا کلام ثابت کیا ہے۔ کیونکہ آج کل کے مستشرقین اور مغربی علماء حضرت محمد ﷺ کی عظیم شخصیت کے قائل ضرور ہیں، وہ قرآن کریم اور اسلام کے بعض قابل قدر اصولوں کی تعریف بھی کرتے ہیں اور قرون وسطی کی تاریخ میں مسلمانوں کے من حیث القوم انقلابی اثرات کو بھی تسلیم کرتے ہیں، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ تسلیم کرنے سے قاصر ہیں کہ حضرت محمد ﷺ نے یہ سب کارنامے وحی الٰہی کے ذریعے سرانجام دیئے ہیں اور یہ کہ قرآن کریم خدا کا کلام اور اس کی نازل کردہ کتاب ہے۔ وہ عقل اور سائنس کے ذریعے وحی الٰہی کی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہیں اور جو کچھ عقل کے معیار پر نہ اترے اسے وہ تسلیم نہیں کرتے۔ یہی وہ بنیادی اختلاف ہے جس کی ہر باب میں ایسے معقول دلائل کے ساتھ تردید کی گئی ہے جسے آج کل کے ترقی یافتہ زمانے کے مغربی علماء سمجھ سکیں۔

یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ دنیائے اسلام کی بڑی بڑی شخصیتوں نے اس پر تقریظیں لکھیں، جن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ تاہم اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے آخر میں بعض شخصیتوں کی تقاریظ درج کی گئی ہیں جن میں سے ہم سلطان عبد العزیز ابن سعود مرحوم (جو موجودہ حکمران کے والد ماجد تھے) اور سابق شاہ یمن امام یحییٰ۔ امیر فرقہ زیدیہ کی تقاریظ کا مقدمہ کے آخر میں ترجمہ درج کر رہے ہیں۔ اس کتاب کی مقبولیت اور تراجم کا حال خود مصنف نے اپنے تینوں ایڈیشنوں کے دیباچوں میں تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے، اس کا اعادہ غیر ضروری طوالت کا باعث ہوگا۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن عید میلاد النبی ﷺ کے موقع پر ۱۲ ربیع الاول ۱۳۵۲ھ میں شائع ہوا تھا جو چند مہینوں میں ختم ہو گیا۔ دوسرے سال ایک تہائی حصہ کے اضافہ اور

ترمیم کے ساتھ دوسرا ایڈیشن عرفہ کے دن شائع کیا گیا وہ ایڈیشن بھی سال بھر کے اندر ختم ہو گیا۔ لہٰذا تیسرا ایڈیشن اس سے بھی مزید اضافہ کے ساتھ ۱۳۵۴ھ میں شائع ہوا۔ یہ تیسرا ایڈیشن پہلے ایڈیشن کے مقابلے میں دوگنا ہو گیا تھا اور اس کی عبارت بھی بہت تبدیل ہو گئی تھی اور کئی باب اس میں بڑھائے گئے تھے۔ نیز زمانہ اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ جدید معلومات بھی پیش کی گئی تھیں۔ اس طرح یہ تیسرا ایڈیشن وہ مکمل ایڈیشن تھا جس پر مصنف کی زندگی میں کوئی اضافہ نہیں ہوا اور مصنف نے اس پر اپنا زور بیان سب سے زیادہ صرف کیا تھا۔

ہم قارئین کرام کے سامنے اس کتاب کے طبع پنجم کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں جو مصنف کی وفات کے بعد مصنف کے وارثوں نے دارالمنار سے ۱۳۷۵ھ مطابق ۱۹۵۵ھ میں شائع کیا ہے۔ یہ اس کے مکمل ترین تیسرے ایڈیشن کا چربہ ہے اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس کتاب کا سب سے آخری ایڈیشن ہے۔ اس طرح ہم نے مصنف کے مکمل ایڈیشن کا مکمل ترجمہ کیا ہے۔

دوسری زبانوں میں جن میں اردو زبان بھی شامل ہے پہلے ایڈیشن کا ترجمہ کیا گیا تھا۔ جو بہت نامکمل حالت میں تھا جیسا کہ خود مصنف نے طبع سوم کے دیباچہ میں تحریر کیا ہے۔ پہلے اور تیسرے ایڈیشن میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ نہ صرف اس میں نئے ابواب کا اضافہ کیا گیا ہے بلکہ ہر باب میں جابجا پیراگرافوں کی عبارت بدلی ہوئی ہے اور دلائل کو نئے انداز میں نئے زور الفاظ اور حوالوں کے ساتھ تبدیل کیا گیا ہے، اس طرح یہ تیسرا ایڈیشن پہلے ایڈیشن سے بہت مختلف ہو گیا ہے۔ علاوہ ازیں قدیم اردو ترجمہ کی عبارت جو پہلے نامکمل ایڈیشن کا لفظی ترجمہ تھا بہت گنجلک اور پیچیدہ تھی، جس سے اردو دان حضرات خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ ہم نے ایمانداری کے ساتھ مصنف کے اصل خیالات کو برقرار رکھنے اور مصنف کے زور بیان اور قوت استدلال کو اردو کی بامحاورہ زبان میں منتقل کرنے کی انتہائی کوشش کی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی رکھا ہے کہ ہر عام وخاص مصنف کے خیالات کو اچھی طرح سمجھ سکے اور اسے سمجھنے میں کوئی دقت پیدا نہ ہو اور بعض اوقات قوسین میں مزید تشریح بھی کی ہے اور موقع و محل کے لحاظ سے مصنف کے حواشی کا ترجمہ فٹ نوٹ اور قوسین میں درج کیا ہے۔ اس کے باوجود انتہائی کوشش یہ

کی گئی ہے کہ مصنف کے خیالات کا کوئی گوشہ چھوٹنے نہ پائے۔

مصنف نے اس کتاب میں جابجا اپنے دلائل کو ثابت کرنے کے لیے قرآن کریم کی آیات کے حوالے دیے ہیں، خاص کر آخری ابواب میں زیادہ تر قرآنی آیات اور ان کی تشریح ہے۔ اس سلسلے میں ہم نے نہایت صحت کے ساتھ اصل قرآنی آیات کے متن کو برقرار رکھا ہے اور آیات کے حوالے مصنف کی سورتوں کی ترتیب اور آیات کے نمبروں کے مطابق درج کیے ہیں۔ نیز آیات کے بالمقابل ان کا ترجمہ بھی تحریر کیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب قرآن کریم کے انمول خزینہ معلومات کی بیش بہا تفسیر بن گئی ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ کتاب مصنف کی تفسیر المنار کا بیش قیمت خلاصہ ہے، کیونکہ مصنف نے جابجا اسی تفسیر کے اقتباسات اور حوالے پیش کیے ہیں۔ آگے بڑھ کر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ مصنف نے اس کتاب میں اپنی سالہا سال کی اسلامی تحقیقات و تصنیفات کا نچوڑ اختصار کے ساتھ جمع کیا ہے یا یوں کہنا چاہیے کہ دریا کو کوزہ میں بند کر دیا گیا ہے۔

اس عظیم الشان شاہکار کے ترجمہ میں ہم کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا فیصلہ ہم قارئین کرام پر چھوڑتے ہیں۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ پاکستان میں وقت کی ایک اہم ضرورت ہے کیونکہ موجودہ دور میں پاکستان میں اسلامی اصولوں کو عملی شکل دینے کا کامیاب تجربہ ہو رہا ہے اور اسلامی قوانین اور دستور کے مطابق ایک صحیح اسلامی مملکت کی تشکیل کے بارے میں دیکھتے چلے آئے تھے۔ مگر ان کی زندگی میں وہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ مگر اب توقع ہے کہ پاکستان کی حکومت اور اس کے عوام اس خواب کو عملی حقیقت میں تبدیل کر سکیں گے۔

کراچی ۲۲ ربیع الاول ۱۳۷۹ھ
مطابق ۲۷ ستمبر ۱۹۵۹ء

رشید احمد ارشد

دیباچہ طبع سوم

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت کی سالگرہ کے موقع پر ماہ ربیع الاول میں ۱۳۵۲ھ میں شائع ہوا تھا، تاکہ آپ کے اس نور منور سے فیض حاصل کیا جائے جس نے تمام کائنات کو روشن کیا تھا اور آپ کو اس وحی الٰہی کے آفتاب نے طلوع ہو کر منور کیا تھا۔ اس کتاب کے شائع ہوتے ہی چند مہینوں میں اس کے تمام نسخے ختم ہو گئے۔ اس لیے اسی سال ترمیم واضافہ کے ساتھ اسے قارئین کرام کے لیے دوبارہ شائع کیا گیا۔ جس سے اسکا حجم ایک تہائی سے زیادہ ہو گیا۔ تاہم اگر قارئین کرام کی بددلی کا خوف نہ ہوتا تو میں اس کتاب کا حجم دوگنا یا چوگنا کر دیتا۔ اسی طوالت کے خیال سے میں نے وعدہ کیا کہ میں اس کا دوسرا حصہ تیار کروں گا، بہر حال اس کا دوسرا اڈیشن میں نے عرفہ کے دن شائع کیا جس دن حجۃ الوداع کے موقع پر خداوند کریم نے یہ آیت نازل کی تھی۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا

"آج کے دن میں نے تمہارے دین کو کامل بنایا اور تم پر اپنی نعمت پوری کی اور تمہارے لیے دین اسلام پر رضامند ہوا ہوں۔"

اس سے یہ نیک شگون حاصل کیا گیا تھا کہ یہ کتاب رسول کریم ﷺ کی دعوت اسلام کی تجدید کرے گی، چنانچہ دوسرا یوم عرفہ ۱۳۵۳ھ آنے نہیں پایا تھا کہ دوسرے ایڈیشن کے نسخے بھی ختم ہو گئے۔ اس لیے میں نے تیسرے ایڈیشن کی تیاری شروع کی اور پہلے کی طرح میں نے اس کی تکمیل میں تاخیر کی تاکہ وہ اس سال ۱۳۵۴ھ میں پہلے ایڈیشن کے وقت شائع ہو۔

گذشتہ سال کے دوران اس کتاب کا اردو زبان میں ترجمہ مکمل ہوا اور ہندوستان

میں شایع ہوا، یہ ترجمہ عربی کے پہلے اڈیشن سے ہوا تھا۔ اس کتاب کا چینی زبان میں بھی دومرتبہ ترجمہ ہوا۔ پہلا ترجمہ "قبودان" میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ اس کے مترجم ماہنامہ "ضیاء الھلال" کے مدیر محترم ہیں۔ دوسرا ترجمہ جناب بدرالدین چینی مکمل کر کے ہندوستان سے مصر لائے اور میرے سامنے پیش کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ اسے چھپنے کے لیے چین کے کسی دوسرے شہر میں بھیجا جائے۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ دوسرے اڈیشن میں جو کچھ اضافہ کیا گیا ہے وہ اس اضافہ کو بھی شامل کرلیں کیونکہ یہ زیادہ مکمل اور مفید ہوگا۔ غالباً یہ ترجمہ اس وقت طبع ہوگا جبکہ پہلے ترجمے کے نسخے ختم ہو چکے ہوں گے۔ ممکن ہے کہ وہ اس تیسرے ایڈیشن کے ساتھ مقابلہ کر کے اس میں ترمیم کرنا چاہتے ہوں، اس طرح یہ اور بھی زیادہ صحیح اور مکمل ہو جائے گا۔

ان لوگوں کے علاوہ اور کسی کے بارے میں مجھے علم نہیں ہوا کہ انہوں نے کسی دوسری زبان میں ترجمہ مکمل کیا ہے۔ اس ایڈیشن میں میں نے تھوڑی سی مفید باتوں کا اضافہ کیا ہے اور بعض مسائل کی وضاحت کی ہے اور عام طور پر انہیں حواشی میں درج کیا ہے جیسا کہ آپ صفحہ نمبر ۱۵۷ کے حاشیہ ثانیہ اور صفحہ ۱۵۸ کے حاشیہ اولیٰ اور حاشیہ (۲) صفحہ ۱۸۱ میں دیکھیں گے۔ اور جو کچھ میں نے فٹ نوٹ میں درج کیا ہے اس میں بھی عام طور پر اشارہ کیا ہے۔ جیسا کہ غیر مسلم غلام کی آزادی کی شرعی حیثیت۔ اس میں اصلی مضمون سے متعلق جو مقصود بالذات ہے کوئی چیز نہیں ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کو پورے دوسال گذر گئے ہیں۔ عربی زبان میں اس کی اشاعت مذہبی کتب کے معیار سے بہت زیادہ ہوئی۔ اس سال مصر کی وزارت تعلیم نے دارالعلوم عالیہ کے طلبہ کے استعمال کے لیے اس کتاب کو منظور کیا ہے اور یہ دمشق و بیروت کے بعض اسلامی مدارس میں داخل نصاب ہے۔

امید ہے کہ نئے تعلیمی سال میں جامعہ ازہر اور مصر کے مذہبی اداروں کے طلبہ میں بھی اس کی اشاعت ہوگی، کیونکہ شیخ الاسلام اور الاستاذ الامام (مفتی محمد عبدہ) کے جانشین شیخ محمد المصطفیٰ المراغی اس کے پرنسپل مقرر ہوئے ہیں۔ وہ سب سے پہلے انسان ہیں، جنہوں نے اس کی کماحقہ قدر کی اور اس کے نصف حصے کو ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا اور دوسری نشست میں اس کو ختم کر ڈالا۔ اس کے بعد اس کی تعریف میں وہ شاندار الفاظ تحریر

فرمائے۔ جنہیں قارئین تقاریظ کے آغاز میں ملاحظ فرمائیں گے۔ انہوں نے پیشن گوئی کی تھی یا بشارت دی تھی کہ یہ کتاب ہر سال چھپے گی۔

کتاب کے مغربی زبانوں میں تراجم:

مسلمانوں نے، حالانکہ ان کے لیے یہ ضروری تھا، یہ کوتاہی کی ہے کہ انہوں نے باقی ماندہ زبانوں میں اور خاص کر ان مہذب اقوام کی زبانوں میں جنہیں ہم نے اسلام کی دعوت دی ہے اس کتاب کا ترجمہ نہیں کیا۔ یہ زبانیں انگریزی، فرنچ اور جرمن ہیں۔ یہ کام فرض کفایہ ہے جس کی بہت سے اہل علم اور غیرت مند حضرات نے آرزو کی ہے اور بعض تقریظ نگار حضرات نے اس کی فرضیت پر زور دیا ہے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے یہ زیادتی کی ہے کہ انہوں نے مجھ سے اس کے ترجمے یا اس کے لیے کوشش کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ مگر کچھ لوگوں نے انصاف کرتے ہوئے مسلم قوم یا اس کی اسلامی انجمنوں سے اس بات کا مطالبہ کیا ہے۔

قوم اپنے لیڈروں یا انجمنوں ہی کے ذریعے قومی کاموں کے لیے کھڑی ہوتی ہے۔ مگر اس قسم کی انجمنیں ہمارے نزدیک دور طفولیت میں ہیں اور ایسے بڑے کاموں کے لیے ان سے توقع نہیں کی جاسکتی کیونکہ وہ اسلامی مرتدوں کی انجمنوں سے زیادہ نادار اور کمزور ہیں جیسے کہ بہائی ہیں یا نبوت اور مسیحیت کے دعویدار ملحد جیسے قادیانی ہیں۔ اس سلسلے میں عیسائیوں کے تعلیمی ادارے اور مشنری انجمنیں شامل نہیں ہیں جو کروڑوں پونڈ کی مالک ہیں اور یہ لوگ اپنی تعلیمات کی روئے زمین پر تمام ممالک میں نشر واشاعت کر رہے ہیں۔ اور مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی توقع کر رہے ہیں حالانکہ ان کی قومیں عیسائیت کے تسلط اور نظام سے تیزی کے ساتھ نکل رہی ہیں جیسے کہ جرمن قوم ہے۔ اس طرح وہ اسلام کے لئے راستہ ہموار کر رہے ہیں تاکہ وہ اس کی جگہ حاصل کرے۔

مصر کی اسلامی انجمنوں میں اس کام کے لیے سب سے زیادہ امیدیں "جمعیۃ الدفاع عن الاسلام" سے وابستہ تھیں جو اپنی تعمیر کی تکمیل سے پیشتر اسلام کے زبردست کدال کے ذریعے منہدم ہو گئی۔ درحقیقت یہ امیدیں اس کے صدر شیخ محمد المصطفیٰ المراغی سے وابستہ تھیں اور اس انجمن کو منہدم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ان کا نام مٹادیا جائے اور

مسلمانوں کو ان کی قابلیت سے محروم رکھا جائے۔ مگر خداوند تعالیٰ نے ان کی مدد کی اور ان کے دشمنوں کو ناکام بنایا اور گرانے والا کدال جن لوگوں کے ہاتھوں میں تھا وہ شیخ موصوف کے ہاتھ میں آکر اسلامی نصرت کی تلوار بن گیا اور اچانک عصائے موسوی فرعون کے سحر کو نگلنے لگا۔

فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١١٨﴾

"حق ثابت ہو گیا اور جو کچھ وہ کر رہے تھے باطل ہو گیا۔"

وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ﴿٤٠﴾ (سورۃ الحج۔40)

(جس کی خدا مدد کرتا ہے وہ ضرور خدا کی مدد کرے گا بے شک خدا طاقتور عزت والا ہے۔)

اگر ان سے اس وقت یہ امید وابستہ تھی جبکہ سرکاری طاقتیں ان کے خلاف سازشیں کر رہی تھیں کہ وہ کتاب الوحی المحمدی کے بعض مغربی زبانوں میں ترجمہ کرانے کے لیے کوشش کریں گے تاکہ ان زبانوں کے بولنے والوں میں اسلامی تبلیغ کی راہ ہموار کی جائے۔ تو اب جب کہ سرکاری وسائل اور ان کے پس پشت طاقتیں ان کے اختیار میں آگئی ہیں وہ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں بہت طریقے سے قادر ہیں۔ اسی کتاب کا ترجمہ اقوام عالم کے لیے اسی وقت قابل اطمینان ہو سکتا ہے جب کہ وہ شیخ الاسلام کی طرف سے اور ان کی نگرانی میں کیا جائے اور اس کی نشر واشاعت ان کی ہدایت اور اجازت سے کی جائے۔ یہ بات بھی معلوم ہے کہ اس کا مولف انہی کی ہاتھ کی قلم ہے اور انہی کی ایک نشانی ہے۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے انہیں دوبارہ شیخ الازہر بنا کر میرے اندر اور تمام قوم میں اس امید کی جھلک پیدا کر دی ہے کہ الاستاذ الامام (مفتی محمد عبدہ) کی وفات پر تیس سال سے ایک باعمل اسلامی قائد کی جو جگہ خالی تھی۔ وہ پر ہو جائے گی۔"

امام مفتی محمد عبدہ کی وفات سے نہ صرف قوم ایک بڑے اسلامی عالم سے محروم ہو گئی تھی بلکہ ایک مصلح اور ایسے قائد سے بھی محروم ہو گئی تھی جو اپنے زمانے کی

• سید مرحوم و شیخ مراغی کے بارے میں اس وقت یہی خیالات تھے اور آخر دونوں پر حق ظاہر ہو گیا۔ شیخ مراغی پہلے دشمنوں کی سازش کی وجہ سے اور اس وقت کے وزیر سے ناراض ہو کر شیخ الازہر کے عہدے سے مستعفی ہو گئے تھے۔ مگر ۱۹۳۱ء کے دستور نافذ ہونے کے بعد طلباء کے پر زور احتجاج پر شیخ مراغی کا دوبارہ اسی عہدہ پر تقرر ہوا اور آپ نے جامعہ ازہر میں اصلاحات کیں اسی طرف مذکورہ بالا عبارت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ مترجم

ضروریات سے واقف ہو اور اس نے قیادت اپنی عقل مندی، آزادانہ رائے، سوجھ بوجھ، بلند ہمتی اور بہادری سے حاصل کی ہو اور وہ خلوص اور صحیح معلومات کے بعد انصاف سے حقدار کو ان کا حق ادا کرتا ہو۔ ایسے قائد کو عام اصلاح کرنے کے لیے خود مختارانہ قیادت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ وہ صحیح معنوں میں کام کر سکے۔ ہم اب تک اسی کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ بہر حال ہر چیز کے لیے ایک خاص وقت ہوتا ہے اور ہر مدت مقرر ہوتی ہے۔

اسی وجہ سے یہ خدا کی حکمت تھی کہ کتاب "الوحی المحمدی" کو مغربی زبانوں میں وہ لوگ ترجمہ نہ کریں جو اس کے اہل نہیں ہیں تاکہ میں ان کی غلطیاں نکالنے پر مجبور نہ ہو جاؤں۔ اس طرح ان کا کام ضائع جائے گا یا ان کے ترجموں پر اعتماد کمزور ہوتا جائے گا۔ مگر علم و حکمت والے خدا نے یہ کام انہی کے لیے مخصوص کر رکھا ہے جو اس کے لئے زیادہ لائق اور اہل ہوں گے۔

آزاد مغرب اور مستشرقین کو اسلامی تبلیغ:

اسلامی تبلیغ اسی وقت صحیح ہو سکتی ہے جبکہ ان قوموں کے آزاد اور روشن خیال انسانوں کو ان کی زبان میں کی جائے۔ مستشرقین کے اکثر افراد جنہوں نے عربی کی تعلیم حاصل کی ہے وہ ان آزاد، مستقل مزاج منصف افراد میں شامل نہیں ہیں۔ کیونکہ انہوں نے عربی زبان اس لیے نہیں سیکھی ہے اور اسلامی کتاب کا مطالعہ اس لیے نہیں کیا ہے کہ وہ اسلام کی حقیقت سے واقف ہوں اور دوسروں کو بھی واقف کرائیں۔ بلکہ وہ اس میں خامیاں تلاش کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی قوموں کے سامنے اسے مسخ شدہ اور مکروہ صورت میں پیش کر کے انہیں نفرت دلائیں جیسا کہ ہم ان کی کتابوں کے مطالعہ کے بعد محسوس کرتے ہیں اور ان کی اس علمی ڈکشنری میں بھی دیکھتے ہیں جسے وہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ان کے علم اور تصنیفات سے ناامیدی کا ایک ثبوت یہ ہے کہ میں نے کتاب "مفتاح کنوز السنۃ" کو توقع اور اپنے اس بیان کے برخلاف پایا جو میں نے اس کی تعریف میں کہا تھا کیونکہ میں نے اس سے ذرا بھی فائدہ نہیں اٹھایا۔

ان میں آزاد خیال بہت کم ہیں اور ان کی عقلوں پر بھی مادی افکار کا بہت غلبہ ہے۔ یہ

خیالات ان کے نزدیک مسلم الثبوت ہیں گویا کہ ان میں بحث کی گنجائش نہیں ہے۔ ہم نے اپنے اور ان کے درمیان کی مسافت کو نزدیک کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کتاب میں علمی اور قطعی دلائل پیش کر کے ثابت کیا ہے کہ قرآن کریم محمد ﷺ کا کلام نہیں ہو سکتا نہ تو اس کا تعلق ان کی عقل کے ظاہری مدارک سے ہے اور نہ اس چیز سے ہے جس کا وہ "عقل باطن" نام رکھتے ہیں۔ وہ فرض کرتے ہیں کہ انسان کی ایک عقل باطن ہے جس کی حقیقت نہیں معلوم ہو سکتی ہے اور اس کے ذریعے غیب کا علم اور پوشیدہ باتیں معلوم ہو جاتی ہیں اور وہ حواس اور فکر کے ذریعے علم حاصل کرنے کے مشہور طریقوں کے معمول کے خلاف چیز ہے اور اسے وہ "خیالات کو پڑھنا" اور افکار کی پیغام رسانی سے تعبیر کرتے ہیں جیسے مسمریزم کے ذریعے کسی شخص سے پوشیدہ باتیں معلوم کی جاتی ہیں۔ حالانکہ ہم نے یہ بیان کر دیا ہے کہ الوحی المحمدی کو ثابت کرنے کے لئے یہ کافی نہیں ہیں۔ بہر حال پھر بھی اس پوشیدہ عقل کے درمیان جو انسان کے اندر فرض کی گئی ہے اور اس پوشیدہ عقل کے وجود کے درمیان جو اس کی طرح خارج میں موجود ہوتا ہے (جسے ہم فرشتہ کے نام سے پکارتے ہیں اور پہلی چیز کو روح کہتے ہیں) کیا فرق ہے؟ اس طرح حقیقی وحی ایک دوسرے کے ملنے سے پیدا ہوتی ہے جیسا کہ بجلی کے مثبت اور منفی تاروں کے ملنے سے روشنی پیدا ہوتی ہے۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآنی وحی محض محمد ﷺ) کی عقل باطن سے پیدا ہوئی ہے۔ یہ بالکل محال ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔ یہ دونوں دلائل میں سب سے زیادہ قریب ہے اور دونوں کے درمیان بہت کم فرق ہے۔ ایسے موقع پر صرف ناموں کا اختلاف ہے۔

اس کے علاوہ خدا کے وجود پر جو ہر چیز کا خالق ہے بہت سے دلائل ہیں جس پر ایمان لائے بغیر کائنات کے مسائل اور قوانین فطرت کی کسی چیز کے بارے میں قطعی طور پر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، بلکہ جب کبھی وہ کسی چیز کو ثابت کرتے ہیں تو دوبارہ اس کی تردید کرتے ہیں اور کسی معاملہ کو مستحکم کرنے کے بعد اسے توڑ دیتے ہیں۔ حقیقت میں ان قوموں کے آزاد انسانوں کے لیے ظہور حق کا وقت قریب آ گیا ہے۔ ہم اس کتاب کے ترجمے کے بعد عنقریب دیکھیں گے کہ وہ خدا کے دین میں جوق در جوق داخل ہوں گے کیونکہ اس کے علاوہ دیگر مذاہب پر سے ان کا اعتماد جاتا رہا ہے۔

غالباً کتاب "الوحی المحمدی" ان تمام مستشرقین کے پاس پہنچ گئی ہے جو عربی زبان جانتے ہیں، کیونکہ جن کے پتے مجھے معلوم تھے۔ میں نے انہیں ہدیہ کتاب بھیج دی تھی۔ میرے علاوہ اور لوگوں نے بھی انہیں کتاب بھیجی ہے۔ ان لوگوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ہر ایسی نئی کتاب پر جس کی کوئی اہمیت ہوتی ہے تبصرہ کرتے ہیں کچھ مستشرقین نے اس ہدیہ کے جواب میں صرف کلمہ شکر پر اکتفا کیا ہے جیسے ڈاکٹر وینسنک مؤلف مفتاح کنوزالسنۃ۔" ان میں سے تنہا جرمن ڈاکٹر مورتیس نے اس پر اظہار رائے کیا ہے۔ چنانچہ میں ان کے شکریہ میں خط کا متن شائع کر رہا ہوں جو انہوں نے ازراہ عنایت ارسال کیا تھا۔

برلن ۸ ستمبر ۱۹۳۳ء

جناب محترم علامہ سید محمد رشید رضا۔

سلام وآداب کے بعد عرض ہے کہ آپ نے ازراہ نوازش اپنی نئی کتاب "الوحی المحمدی" ارسال کی ہے۔ امید ہے کہ اس قیمتی اور نادر تحفہ کے جواب میں بہت بہت شکریہ قبول فرمائیں گے، بالخصوص اس بات کا کہ آپ شخصی طور پر نہیں بھولے ہیں۔ آپ کو یہ یقین دلانے کی ضرورت نہیں کہ میں نے بڑی دلچسپی کے ساتھ اس کا مطالعہ کیا ہے کہ بلاشک وشبہ میرے خیال میں عالموں کے حلقے میں اس قسم کی کتابیں بہت کم ہیں۔ اثنائے مطالعہ میں مجھے چند ایسے مسائل ونکات سے آگاہی ہوئی ہے جو قابل غور ہیں۔ مگر اس جواب کے حجم کو مدنظر رکھتے ہوئے اس بات کی گنجائش نہیں ہے کہ میں تمام کو بیان کروں۔ ان میں صرف ایک ہی پر اکتفا کروں گا یعنی نبی کے لفظ کے عبرانیوں کے نزدیک اصل معنی کیا ہیں۔ (صفحہ نمبر ۲۱) ان کے ابتدائی زمانے میں نبی کے معنی اونچی آواز میں بولنے والا تھے۔ پھر اس کے معنی ہوئے اپنی قوم کے مقدمات اور سیاسی کاموں میں بولنے والا یعنی نصیحت کرنے والا اور ہدایت کرنے والا مشیر۔ مگر آہستہ آہستہ اسرائیلی مذہب کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کا موقع اور محل استعمال بدلتا گیا اور اسے مذہبی امور میں ناصح اور واعظ کے معنوں میں استعمال کیا جانے لگا۔ کیونکہ اس کا یہ عقیدہ تھا کہ خدا کے حکم سے اس پر یہ فریضہ عائد کیا گیا ہے اور وہ خدا کا نمائندہ ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنی نبوت کے کلام کے آغاز میں یہ کلمات استعمال کرتا تھا۔ اسی طرح یاہو نے فرمایا ہے (یہ بنواسرائیل وغیرہ ان مشرقی قوموں کے خدا کا نام ہے جو حجاز اور شمالی شام کے درمیان پھیلی ہوئی تھیں) الخ.... آخر میں ضروری شکریہ دوبارہ مخلصانہ تمناؤں کے ساتھ ادا کرتا ہوں۔

مخلص:۔ ڈاکٹر مورتیس

یہ زبردست علامہ کہتا ہے کہ یہ "تحفہ بیش قیمت ہے اور یہ کہ اس نے کتاب کو بہت دلچسپ پایا اور اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ وہ علماء کے حلقے میں اس جیسی کوئی کتاب نہیں پاسکا۔ بہرحال ان علماء کے پاس دعوت اسلام پہنچ چکی ہے اور حضرت محمد ﷺ کی نبوت کے بارے میں جو چیلنج میں نے اس عظیم آیت کے ذریعے دیا تھا اور آپؐ پر قرآن کریم کی جو وحی نازل ہوئی تھی ان سب کو انہوں نے سمجھ لیا ہے اور کسی میں یہ ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اس کی تردید کر سکے جو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی وحی قرآنی کو اپنے اصلی اسلوب ومعانی کے ساتھ لانے کو ثابت کرتا ہے۔ اور اس میں وہ اعلیٰ ترین علوم پائے جاتے ہیں جن کا خلاصہ میں نے دس مقاصد میں بیان کیا ہے۔ ان کے ذریعے اس دین کامل اور اس طاقتور سلطنت کی دس سال میں بنیاد ڈالی گئی جس نے دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں اور مذاہب کو ایک تہائی صدی میں الٹ دیا تھا۔

ڈاکٹر موصوف نے نبی کے لفظ کے یہودیوں کے نزدیک اصلی معنی پر غور کرنے کے بارے میں جو تحریر فرمایا ہے وہ ڈاکٹر یوسط کی کتاب مقدمین کی ڈکشنری سے منقول ہے۔ میں نے اس معنی کا جس کی طرف انہوں نے نبوت کے بارے میں اشارہ کیا ہے دوسرے ایڈایشن میں (ص ۲۵) میں ذکر کیا ہے اور تیسرے ایڈیشن میں وہ صفحہ ۴ پر ہے۔

میری یہ خواہش رہی کاش وہ از راہ نوازش اس کے علاوہ اور کچھ تبصرہ کرتے خاص کر وہ اصلی اور بنیادی موضوع کے بارے میں گفتگو کرتے اس وقت میں ان کی عبارت کو نقل کر کے اس کا جواب دیتا۔

قوموں کی باہمی عداوت اور اسلام کی ضرورت:

یورپ اور امریکہ کی سلطنتیں اور قومیں جیسا کہ میں نے اسی کتاب کے مقدمہ میں ذکر کیا ہے بدبختی، اختلافات اور ریاکاری اور نااتفاقی کا شکار ہیں۔ انہوں نے ان دو سالوں میں کانفرنسوں کے بعد کانفرنسیں اور معاہدوں کے بعد معاہدے کئے مگر کولہو کے بیل کی طرح گردش میں رہے اور اسی جگہ پر کھڑے ہوئے ہیں۔ حق وصداقت کی ان کے نزدیک کوئی قدر وقیمت نہیں ہے، کیونکہ جب سے انہوں نے معاہدہ ورسائی کیا ہے اس سے وہ جرمنی کے شہزادہ بسمارک کا طریقہ چل رہے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ معاہدات سے طاقتور، کمزور پر اپنا ثبوت قائم کرتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ جرمنی کو پوشیدہ طور پر معاہدہ توڑنے

پر مجبور کرنے لگے جیسا کہ وہ خود علانیہ معاہدات توڑتے رہتے ہیں اور وہ جنگی اور فضائی قوت کو از سر نو تیار کر کے انہیں خوفزدہ کرنے لگا تو وہ حقوق اور بین الاقوامی عزت وشرافت میں اسے اپنا مساوی ماننے پر مجبور ہوگئے۔ اس سے پیشتر وہ اس سلسلے میں جھگڑتے تھے اور اپنی خوشی اور رضا مندی سے یہ حق دینے سے منکر تھے بلکہ اس کے حملہ سے خائف رہتے تھے اور اسی لیے دفاعی معاہدات کی تجدید ہوئی، جس کا نتیجہ گذشتہ جنگ عظیم کی صورت میں نمودار ہوا ہے۔ یہاں تک کہ وہ کمیونسٹ سلطنت کے ساتھ جو ان سب کی دشمن ہے معاہدہ کرنے کی ذلت برداشت کرنے پر مجبور ہوئے وہ کب تک کتاب اللہ کے فیصلہ سے گریز کرتے رہیں گے جس میں ایفائے عہد کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اسے مکر وفریب کا ذریعہ بنانے سے اس لیے روکا گیا تھا کہ ایک قوم دوسری قوم سے طاقتور نہ بن جائے۔ ایسی صورت میں معاہدات عذاب بن جائیں گے جسے توڑنا پڑے گا جیسا کہ ہم نے اس کے مقام پر بیان کیا ہے۔[1]

انہوں نے جرمنی کے خلاف بغاوت اور سرکشی اختیار کی حالانکہ وہ جانتے تھے کہ وہ علم صنعت وحرفت اور نظام سلطنت میں ان سے بڑھا ہوا ہے۔ وہ اس کی پوشیدہ جنگی تیاریوں سے لرزہ براندام ہو رہے تھے کیونکہ اس سے پیشتر وہ اس کے زبردست حملوں کا ذائقہ چکھ چکے تھے جو ان سب کو فنا کرنے والا تھا۔ مگر انہوں نے اپنے جھوٹے اور خطاکار معاہدات کے مکر وفریب پر بھروسہ کیا اور ان معاہدات کی تجدید کی جن کا مقصد یہ تھا کہ وہ متحد ہو کر اس کے برخلاف حملہ کریں اور وہ دنیا میں بے یار ومددگار تنہا رہ جائے۔ ان کے نئے لیڈر ہٹلر نے اسی معاہدہ کو پارہ پارہ کرنے کے لیے اور نئے فضائی اور بحری ہتھیار بندی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ انہیں اس سے خوف معلوم ہوا جیسے شیر دھاڑ کر بھیڑوں کو نگلنا چاہتا ہو۔ وہ کہتا ہے کہ یورپ کی صلح اور جنگ اس کے اختیار میں ہے اور اس کی آبادی اور خرابی اس کے اشاروں کی منتظر ہے۔ وہ اس کی ہونے والی تقریر کے بارے میں بھی سمع خراشی کرتے رہے۔ چنانچہ جب اس نے تقریر کی تو اس کے دلائل دشمنوں کے لیے دندان شکن تھے اور تین اتحادی طاقتوں کے باقی ماندہ آخری قلعہ (معاہدہ ستریزا) کے لیے تباہ کن تھے۔ لہٰذا برطانیہ جرمنی سے اس کی فضائی اور بحری طاقت کے

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ نمبر ۱۴۸ پہلا ایڈیشن، صفحہ نمبر ۲۵۲ دوسرا ایڈیشن، صفحہ نمبر ۲۰۷ تیسرا ایڈیشن۔

بارے میں گفت وشنید کرنے لگا۔ حالانکہ اس سے پہلے اس سے ناک بھوں چڑھاتا تھا۔ اور جب اٹلی نے جوان کے ساتھ جمعیۃ الاقوام کے معاہدے میں شریک تھا، حبشہ پر حملہ کرنے کے لیے لشکر اور سامان جنگ مہیا کیا تو برطانیہ نے اس کے خلاف دانت پیسے تھے، حالانکہ یہ معاہدہ بھی اس کی نظر میں مغربی معاہدوں کی طرح "کمزور پر طاقتور کی دلیل" تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ اس نے کیسے معاہدہ کو ٹھکرایا بلکہ جاپان اور جرمنی نے تو اس پر لات ماردی۔ مگر سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ ان طاقتوروں کے مفادات ایک دوسرے سے متصادم تھے۔ چنانچہ اطالیہ کا ڈکٹیٹر اپنی طاقت پر نازاں تھا اور حبشہ کو فتح کرنے یا اس کے حصے چاروں طرف سے کم کرنے پر اڑا ہوا تھا۔ مگر انگلستان اس سے زیادہ طاقتور اور مضبوط تھا۔ اسی طرح ان اتحادیوں کی تگڈم میں شگاف پڑ گیا۔ جو درست نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ یہ ڈکٹیٹر جو اپنے شخصی اختیارات پر مغرور تھا حملہ شروع کرنے کے بعد اس میں ناکامی کو اپنے اثرونفوذ کا خاتمہ سمجھتا تھا۔ اس کی قوم اضطراب اور پریشانی کی حالت میں تھی۔ لہٰذا اس مہم میں اس کی کامرانی ہی اس اضطراب اور پریشانی کو دور کر سکتی تھی۔ جرمنی کو بھی اپنے تمام نوآبادیات کو واپس لینے کی ضرورت تھی۔ اس وقت وہ فضا اور سمندر میں برطانیہ کو شکست دے سکتا تھا۔ ایسی حالت میں فرانس کیا کرے اگر برطانیہ اس کو چھوڑ دے؟

حاصل کلام یہ ہے کہ یہ سلطنتیں اور ان کی قومیں اسی طرح بگڑی ہوئی حالت میں ہیں جس کا ذکر ہم نے پہلے ایڈیشن کے مقدمہ میں کیا ہے۔ اسلام کی ہدایت کے بغیر جو اسلامی عالمگیر برادری، عدل وانصاف رحم اور سلامتی کا دین ہے، اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ اس لیے تبلیغ اسلام اور اس کے دلائل کو ثابت کرنے کے لیے تیز رفتاری کی ضرورت ہے۔ اسی نے مسلمان عقلاء کو اس دعوت عام دینے کے لیے تیار کر دیا ہے بشر طیکہ کوئی مسلمان لیڈر اس کی ذمہ داری اور اس کا نظام چلانے کے لیے تیار ہو جائے۔ قارئین اس کا ثبوت ان تقریظوں میں ملاحظہ فرمائیں گے جو ہم نے اس کے آخر میں شائع کی ہیں۔ سب سے پہلے شیخ الاسلام المراغی کا مولف کے بارے میں یہ قول "آپ کو دین اسلامی کی دعوت و تبلیغ کے لیے ایک نیا راستہ کھولنے میں کامیابی ہوئی ہے"، باقی تحریریں بھی ان کے قول کی تائید کرتی ہیں اور ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قوم میں اس کام کو انجام دینے کی قابلیت موجود ہے۔

اسلامی تبلیغ کے لیے مسلمانوں کی صلاحیت:

میں نے اپنے استاذ الاستاذ الامام (مفتی محمد عبدہ) کی تاریخ میں استاذ موصوف کی یہ رائے درج کی ہے (صفحہ ۹۳۹ ج ا) "مغرب کی مہذب قومیں اپنے تمدن کے فتنوں اور سیاسی مقاصد کا خمیازہ اٹھا کر اس سے نکلنے کا راستہ تلاش کرنے میں مجبور ہوں گی۔ اس وقت انہیں اسلام کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ملے گا۔ وہ اسلام، قرآن اور سنت کا اسلام ہو گا، متکلمین اور فقہا کا اسلام نہیں ہوگا۔" اس قسم کے خیالات کا اظہار انہوں نے بارہا جامعہ ازہر اور دوسرے مقامات کے لیکچروں میں کیا ہے۔

میرا کہنا یہ ہے کہ ابھی تک ان کے قول کی صدائے بازگشت نہیں سنائی دی اور مسلمانوں کی طرف سے کوئی ہدایت نظر نہیں آئی۔ اس لیے یہ رجحان غالب ہے کہ قرآن کریم کی ہدایت دوسری زندہ قوموں میں ظاہر ہو گی اور یہ جغرافی مسلمان قرآن وسنت کا اسلام انہی لوگوں سے حاصل کریں گے۔ اس معاملے میں وہ ان کی ویسی تقلید کریں گے جیسی کہ وہ زیب وزینت، امور مباح اور اسراف میں ان کی تقلید کر رہے ہیں جس سے وہ بہت بگڑ گئے ہیں۔

اس قسم کے خیالات میں نے استاد مراغی اور دیگر افراد سے بھی سنے ہیں۔ غالباً دنیا کے مسلمانوں کے بارے میں میری معلومات اور جانچ ان سب لوگوں سے زیادہ ہے اور اس لیے مجھے ان سے زیادہ ان مسلمانوں سے بدگمانی ہے۔ مگر ان کے عقلمند انسانوں نے کتاب "الوحی المحمدی" کو جس ایمانی جذبہ اقرار وامید وثناء اور دعا کے ساتھ قبول کیا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قرآنی ہدایت اور اس کی تبلیغ کے لیے ان کی صلاحیتوں کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔

کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ مصر شام اور عراق اور دیگر ممالک کے تقریظ نگار کہنے والوں کے اس قول میں ہم آواز ہیں۔ اس سے پہلے وہ ہمیشہ ایسی کتاب کے متمنی رہے ہیں جو اسلام کی تبلیغ کا کام دے سکے مگر وہ نہیں ملتی تھی۔ اب جب انہوں نے اس کتاب کو دیکھا تو انہیں وہ گمشدہ چیز مل گئی جس کی وہ تلاش کر رہے تھے۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ ان خیالات میں اسلامی ائمہ اور متقی بادشاہ بھی شریک ہیں۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں صحیح زندگی اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے

جس صورت میں ان کے بزرگان سلف نے روح قرآنی اور سنت رسول ﷺ پر چل کر اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا جیسا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے:

"اس امت کے آخری انسانوں کے لیے بھی وہی چیز بہتر ہو گی جو اس امت کے پہلے انسانوں کے لیے بہتر تھی۔"

یہ صورت اسی وقت ہو سکتی ہے کہ انہیں قرآن کریم کا علم ہو اور انہیں یقین ہو کہ وہ تمام عالم انسانیت کا مصلح ہے اور قرآن پر عمل کرنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ عالم انسانیت کے رہبر اور ہادی بنیں اور مادی تہذیب و تمدن نے لوگوں کے جو عقائد و اخلاق خراب کیے ہیں ان کی اصلاح کریں۔ اگر انہیں اس بات کا یقین نہیں ہے تو دین و دنیا میں ان کی بھلائی کی امید نہیں ہے۔ بہر حال اس قسم کا یقین پیدا کرنے کے لیے ایک ایسے نظام اور قیادت کی ضرورت ہے جس پر ہر خاص و عام بھروسہ کر سکے۔ اس دعوت کی نشر و اشاعت اس سال ہو جائے گی۔ اس وقت ہم جان و مال سے اس کی تائید کے ذریعے ان کی صلاحیتوں کا اندازہ لگا سکیں گے۔ خدا نے چاہا تو ہم اسے دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ﴿۱۵﴾ (سورہ حجرات۔15)

"حقیقت میں مومن وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔ پھر اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں کیا اور اپنے مال اور جانوں سے خدا کی راہ میں جہاد کرتے رہے۔ یہی لوگ سچے ہیں۔"

محمد رشید رضا

مدیر ماہنامہ المنار

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًاۢ بِالْقِسْطِؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِؕ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْاۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ

(خدا، فرشتے اور اہل علم انصاف پر قائم ہو کر یہ شہادت دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں مگر وہی جو زبردست حکمت والا ہے۔ سچا دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے اور اہل کتاب تو (صداقت اسلام) معلوم ہو چکنے کے بعد اس کے مخالف صرف ضد کے مارے ہو گئے ہیں، جو آدمی اللہ کی آیات کا منکر ہو تو اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔ پھر اگر (اے پیغمبر) وہ تم سے جھگڑا کریں تو کہہ دو میں نے اور میرے ماننے والوں نے اللہ کے آگے سر تسلیم جھکا دیا ہے اور اہل کتاب اور عرب کے امیوں سے دریافت کرو کیا تم نے بھی سر جھکا دیا ہے؟ پھر اگر انہوں نے سر تسلیم خم کیا تو وہ راہ پا گئے اور اگر وہ پھر گئے تو تیرا کام صرف پیغام پہنچانا ہے اور خدا بندوں کو دیکھ رہا ہے۔)

انسان کی مادی ترقی اور اخلاقی تنزل مذہب کی ضرورت:

یہ یقینی طور پر معلوم ہو چکا ہے اور جو اس سے ثابت شدہ حقیقت ہے کہ کائنات کے مادی علوم اس زمانے میں تیزی کے ساتھ ترقی کر رہے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ چھلانگیں لگا رہے ہیں۔ ان کی بدولت انسان نے قدرتی وسائل پر قابو پالیا ہے اور اسی کا پختہ ثمرہ یہ بر آمد ہوا ہے کہ تمام عالم ایک شہر بن گیا ہے اور تمام ممالک اس (عالمی) شہر کے گھر بن گئے ہیں گویا کہ تمام قومیں ان گھروں میں ایک برادری کے کنبے اور خاندان کی حیثیت سے آباد

ہیں۔ اب ان کے لیے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ وہ تعاون اور محبت کے ساتھ وہاں خوشگوار زندگی بسر کریں، اگرانہیں دینی ہدایت ملے۔

اس بات کا بھی یقین کے ساتھ علم ہو گیا ہے کہ عالم انسانیت، مادی علوم میں ترقی کرنے اور ان کے ثمرات سے لطف اندوزی کے ساتھ ساتھ ادب واخلاق میں پیچھے کی طرف لوٹتے ہوئے اسی نسبت کے ساتھ ترقی معکوس کر رہی ہے۔ یہ لوگ برائیوں میں حد سے بڑھ گئے ہیں، جرائم کے ارتکاب میں ان کی جرات بڑھتی جا رہی ہے، بہیمانہ خواہشوں کی دلچسپیوں میں بھی اضافہ ہوتا جارہاہے۔ زوجیت کے عہد وپیان توڑے جا رہے ہیں۔ رشتہ داروں کے باہمی تعلقات منقطع ہو رہے ہیں۔ والدین کی نافرمانی بڑھتی جارہی ہے اور مذاہب کی ہدایت کو پس پشت ڈالا جارہاہے۔ یہاں تک کہ وہ ان تمام پابندیوں سے قطعی طور پر آزاد ہونا چاہتے ہیں جو مذہب، اخلاق، سوسائٹی اور عقل کی طرف سے ان کی خواہشات کو روکتی ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے ممالک میں جو علم وتمدن میں بہت زیادہ ترقی یافتہ ہیں، بعض لوگ برہنہ اور عریاں زندگی کو پسند کرنے لگے ہیں جس طرح قدیم وحشیوں میں سے باقی ماندہ انسان افریقہ کے جنگلوں اور بعض دور دراز کے بحری جزیروں میں زندگی گذارتے ہیں۔

یہی ایک حقیقت ہے کہ اس تمدن کی بڑی بڑی سلطنتوں کی قوموں نے نہ صرف اپنے اوپر سخت ظلم کیا ہے بلکہ تمام وسائل اور ذرائع کو اس عالمگیر جنگ کی تیاری میں استعمال کیا ہے جو چند مہینوں اور چند دنوں میں تہذیب وتمدن کی ان بلند عمارتوں کو تباہ برباد کر دیتی ہے جنہیں کئی صدیوں میں مستحکم کیا گیا ہے۔ یہ جنگ لاکھوں جنگ نہ کرنے والے پرامن انسانوں، عورتوں بچوں اور بوڑھوں کو فنا کرتی ہے۔ یہ قومیں جنگوں میں اور ان کمزور قوموں پر ظلم کرنے میں جو ان کے پنجہ واقتدار میں ہیں اپنی دولت کا بہت بڑا حصہ صرف کرتی ہیں۔ اس طرح ان کی دولت اور ان کی دینی ودنیاوی آزادی کو سلب کرتی ہیں۔

ان سرکش اور بدنیت سلطنتوں کی سیاست کی وجہ سے تمام عالم انسانیت بد بختی کے گڑھے میں گر گیا ہے۔ ان خطروں کو دور کرنے کے لیے جو کانفرنسیں منعقد کی گئیں ان سے ان کی آگ اور بھڑکتی گئی۔ اگر ان کی نیتیں درست ہوتیں اور یہ لاکھوں روپے جو

قوموں کی کمائی سے چھینے گئے عالمگیر انسانیت کی اصلاح میں صرف ہوتے تو انسانیت دولت وخوشحالی کے اعلیٰ درجے پر پہنچ جاتی۔ جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ یقینی طور پر معلوم ہے اور ایک کھلی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس مادی تہذیب وتمدن کی تاریخ کی چھان بین سے یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ سب برائیاں اسی تہذیب کا لازمی جزو ہیں۔ اور اس کی نشوونما کے ساتھ بڑھتی جاتی ہیں۔ للذا یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ محض انسانی علوم وفنون انسان کو دنیاوی زندگی میں کامیاب بنانے کے لیے بھی ناکافی ہیں چہ جائیکہ وہ آخرت کی زندگی کے لیے کامیاب ثابت ہوں۔ دنیا اور آخرت کی فلاح، دینی ہدایت ہی سے مکمل ہوتی ہے۔ انسان فطری طور پر تمدن کا خوگر ہے اس کے ساتھ ساتھ وہ فطری طور پر دیندار بھی ہے جسے اسلام نے فطرت سے تعبیر کیا ہے۔

اسی وجہ سے یورپ کے بعض دانشوروں نے اس بات پر غور کیا ہے کہ دینی ہدایت کی پناہ حاصل کی جائے کیونکہ وہی اس مادی تہذیب کی بیماریوں کا علاج ہے اور اس کے زہر کا تریاق ہے۔ ان کی یہ آرزو ہے کہ کاش مغرب یا مشرق میں کوئی نیا رسول نئے مذہب کے ساتھ معبوث ہو جس کی ہدایت سے خدا فتنہ وفساد کی اصلاح کرے اور اس کی تبلیغ کی جائے کیونکہ موجودہ مذاہب اس زمانے کے مناسب نہیں ہیں جبکہ تمام اہل مذاہب کی حالت خراب ہو گئی ہے[1] کچھ لوگ اس قسم کے دین کو دین محبت کے نام سے موسوم کرتے ہیں جو باری تعالیٰ کے اس قول کے مصداق ہے:

وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ

(اور ہم نے ان کے درمیان عداوت اور دشمنی قیامت کے دن تک ڈالے رکھی ہے۔)

(اس وجہ سے وہ باہمی دشمنی کو دور کرنے کے لیے محبت پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں) مگر یہ مفکرین قرآنی مذہب کی حقیقت سے ناآشنا ہیں۔ یہ عالمگیر دین الٰہی ہے مگر تین پردے (حجابات) اس سے واقف ہونے کی راہ میں حائل ہیں جن کی وجہ سے وہ اس پر صحیح طور پر غور نہیں کر سکتے اور قرآن کریم کو جیسا سمجھنا چاہیے نہیں سمجھ سکتے۔ وہ کون سے پردے اس راہ میں حائل ہیں؟ انہیں مختصر طور پر بیان کیا جاتا ہے:

---

[1] اس رائے کو سب سے پہلے اخبار السیاسۃ نے چند سال پہلے نقل کیا تھا پھر اس کی نقل بار بار ہوئی۔

یورپ اور حقیقت اسلام کے درمیان حجابات:

حجاب اوّل:

کلیسا، جو دعوت اسلام کے آغاز ہی سے اس کا دشمن ہے اور اس وقت سے وہ اسلام کو مسخ شدہ باطل صورت میں پیش کر رہا ہے۔ اس کے پروپیگنڈے میں اس قدر جھوٹ، دروغ گوئی اور بہتان تراشی ہے کہ اس کی نظیر کسی زمانے میں قوموں کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس سلسلے کی جس قدر کتابیں، رسالے گیت اور اشعار لکھے گئے ہیں ان کے جھوٹ سے ہر وہ مورخ واقف ہے جسے حقائق کا علم ہے۔ عیسائی کلیسا نے تلبیس افترا پردازی اور اسلام دشمنی کو اپنے تمام مدارس میں اور ان اداروں میں جہاں لوگ معلمی کے پیشے کے لیے فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں، تعلیم تربیت کا ضروری حصہ قرار دے رکھا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان مدارس میں ان کے پیروؤں میں سے جو لوگ تعلیم حاصل کرتے ہیں ان کا یہ عقیدہ ہو جاتا ہے کہ تمام مسلمان حضرت مسیح اور تمام عیسائیوں کے دشمن ہیں اس لیے جہاں تک ممکن ہو ان سے دشمنی رکھنی چاہیے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اسلام عیسائیت کا دوست ہے اور اسی کی ہدایت کی تکمیل کرنے والا ہے اور محمد مصطفےٰ ﷺ وہی فارقلیط اور صداقت کی روح ہیں جس کی حضرت مسیح علیہ السلام نے بشارت دی تھی۔

حجاب ثانی:

دوسرا حجاب یورپ کے سیاستدان ہیں۔ انہیں اسلام دشمنی کلیسا سے ورثہ میں ملی ہے اور اسلام پر طعن کرنے کے سلسلے ان کی افترا پردازیوں کو انھوں نے قبول کر لیا ہے: مسلم قوموں کو غلام بنانے اور استمار پسندی کی طمع نے ان کی اسلام دشمنی اور عداوت کو دو چند کر دیا ہے۔ جب کہ ان کے مذہبی پیشواؤں نے دنیا بھر میں اسلام کے خلاف جھوٹ اور افترا پردازیوں کا طومار باندھ دیا ہے۔ حالانکہ مذہب کی بنیاد صداقت، حق گوئی، محبت، رحم، عدل وایثار پر ہے، تو سیاست داں جن کی بنیاد جھوٹ پر ہے اس کے برعکس نمونہ کیسے پیش کر سکتے ہیں۔ ان لوگوں کی بنیاد ہی جور و ستم، سنگدلی، خود غرضی اور مکر و فریب پر ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جنہیں ہم روزانہ مغربی نو آبادیوں میں اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں اور اس کی خبریں اپنے کانوں سے سن رہے ہیں بلکہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ مذہبی رہنماؤں کی افترا پردازیوں کا اصل سبب سیاست ہے مذہب نہیں ہے اور ان کا مشہور قاعدہ "اصل

مقصد ذرائع کو جائز قرار دیتا ہے" سیاست پر مبنی ہے مذہبی قانون پر نہیں ہے۔ کیونکہ کوئی مذہب جرائم اور برائیوں کو اس لیے جائز قرار نہیں دیتا ہے کہ انہیں لوگوں کے مفادات کا ذریعہ بنایا جائے خواہ وہ دینی مفاد ہی کیوں نہ ہو۔

حجاب ثالث:

تیسرا حجاب ان آخری صدیوں میں مسلمانوں کی بری حالت ہے کیونکہ ان کی حکومتیں اور قومیں بگڑ گئی ہیں اور ان کے مذہب کی اصل حقیقت اور ان کے دفاعی مصالح پر جہالت غالب آگئی ہے یہاں تک کہ ان کے دشمنوں کو بہانہ کے طور پر یہ ثبوت مل گیا ہے کہ نہ تو ان مسلمانوں میں کوئی خوبی ہے اور نہ ان کے دین میں۔ ان دشمنوں کے لئے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ وہ اس وجہ سے ان لوگوں کو ورغلائیں جو ان کے ملحدانہ سیاسی مدارس اور مشنری سکولوں میں ان کے ہم قوم یا ہم جنس وغیرہ تعلیم پاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ مسلم نونہالوں کو بھی ورغلاتے ہیں اور ان نونہالوں میں سے اسی قسم کے افراد کا انتخاب کرتے ہیں جو حکومت کے سرکاری عہدوں اور مدارس میں تعلیم کے فرائض انجام دے سکیں۔ ایسے افراد ہر ملک میں ان سلطنتوں کے اثرات سے جو کسی نام سے موسوم ہوں متاثر رہتے ہیں۔ جیسے فتوحات، غیر ملکی قبضہ، استعمار پسندی، انقلاب وغیرہ۔ یا یہ لوگ ان کے سیاسی اور تعلیمی اثرات کے تابع ہوتے ہیں جیسا کہ ترکی اور ایران میں ہوا تاکہ یہ لوگ ہر اسلامی چیز کا خواہ وہ مذہبی عقائد یا ادب ہو یا شرعی استحکام، خاتمہ کرنے میں ان کی مدد کریں۔

سید جمال الدین افغانی جو اسلام کے بہت بڑے مفکر اور مشرق کو بیدار کرنے والے تھے یہ فرماتے تھے کہ یہ حجاب یورپ کی آزاد قوموں اور اسلام کے درمیان سب سے گہرا اور کثیف حجاب ہے، مجھ سے ایک معتبر آدمی نے بیان کیا ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم یورپ کے آزاد انسانوں کو اپنے مذہب کی دعوت دیں تو ہمارا فرض ہوگا کہ سب سے پہلے ہم انہیں قائل کرائیں کہ ہم مسلمان نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ قرآن کریم کو ہمیں دیکھ کر سمجھنا چاہتے ہیں۔ یہ کہہ کر آپ نے اپنی ہتھیلیوں کو اٹھایا اور ان کی انگلیوں کو کشادہ کیا۔ وہ قرآن کریم کے پس منظر میں ایسی قوموں کو دیکھتے ہیں جن میں جہالت اور ذلت چھائی ہوئی ہے اور وہ خود اعتمادی کو کھو بیٹھی ہیں۔ وہ کہتے ہیں "اگر یہ کتاب صداقت پر مبنی ہوتی اور اصلاح کرنے والی ہوتی تو اس کے ماننے والے ایسے نہ ہوتے

جیسا کہ ہم مشاہدہ کر رہے ہیں۔" ہم اس بات سے انکار نہیں کرتے ہیں کہ بعض مغربی آزاد خیال علماء تاریخ اسلام سے اس سے زیادہ واقف ہیں جتنا کہ اکثر مسلمان اپنی تاریخ سے واقف ہیں۔ انہوں نے مخصوص تاریخی مباحث میں اور علم و تمدن اور مذہب کے عام مباحث میں انصاف سے کام لیا ہے اور ان میں کچھ لوگ بصیرت اور دلائل کے ساتھ صحیح راستے پر پہنچے ہیں، مگر ان لوگوں نے جو کچھ لکھا وہ اسلام کی مکمل حقیقت کا اظہار نہیں کرتا ہے اور اس سے ان کی قوم کے چند افراد ہی واقف ہیں۔ وہ لوگ جو ان کی تحقیقات سے واقف ہیں ان پر ان کا زیادہ سے زیادہ اثر یہ ہوا ہے کہ انہوں نے ان لوگوں پر تنقید کی ہے جنہوں نے مسلمانوں کی تاریخ لکھنے کے سلسلے میں تاریخی غلطیاں کی ہیں۔ اس طرح وہ تینوں حجابات جو اسلام کی حقیقت کی راہ میں حائل ہیں دور نہیں ہو سکے ہیں۔

جہاں تک ان کی قرآنی نافہمی کا تعلق ہے تو اس سے میری مراد وہ سوجھ بوجھ ہے جس کے ذریعے اعجاز قرآنی اور اس کی تشریعی، ادبی اور اصلاحی حیثیت معلوم ہو اور یہ بھی واضح ہو کہ وہ خدا کا آخری دین کامل ہے، جس کے ہوتے ہوئے عالم انسانیت کو کسی دوسری کتاب اور دوسرے نبی کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن کریم کے نہ سمجھنے کے مذکورہ عام حجابات کے علاوہ مندرجہ ذیل چار خاص اسباب بھی ہیں۔

قرآن کریم کو نہ سمجھنے کے اسباب:

ا۔ عربی زبان کی اس بلاغت سے ناواقفیت ہے جس کی بدولت قرآن کریم اپنے طرز بیان، ترتیب اور مسلمانوں اور کافروں پر یکساں تاثیر کے لحاظ سے حد اعجاز تک پہنچ گیا ہے اس طرح اس نے نہ صرف عربوں میں ذہنی اور اجتماعی انقلاب برپا کر دیا تھا بلکہ عالم انسانیت میں بھی عام انقلاب پیدا کیا جیسا کہ ہم نے اس کی وضاحت اس کتاب میں کی ہے۔ لوگ اس بلاغت کو اس قدر بلند سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے اکثر عالموں نے قرآن کریم کے دوسرے معجزوں کو چھوڑ کر اس کو قرآن کریم کا چیلنج قرار دیا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ خالص عرب اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہو گئے تھے ان کے بعد وہ علماء جو عرب میں پیدا ہوئے تھے اور عربی زبان کی عملی قابلیت اور نظری قابلیت یعنی علم نحو و بیان دونوں سے واقف تھے وہ بھی (اس کے مقابلہ سے) عاجز ہو گئے تھے۔ لہٰذا حضرت محمد ﷺ کی نبوت

کو ثابت کرنے کے لیے یہ سب سے بڑی حجت ہے۔

اب کئی صدیوں سے معدودے چند افراد کے علاوہ خود عرب بھی عربی زبان کی عملی اور نظری استعداد سے محروم ہو گئے تو غیر عرب کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے؟ للٰذا اس زمانے کے مسلم علماء ان کے عجز سے استدلال کرتے ہیں۔ مگر یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ وہ خود بھی اس اعجاز قرآنی کے بھید سے واقف ہیں۔ یا اس کے لطف سے آشنا ہیں۔ بعض قدیم عالموں نے یہاں تک کہا ہے کہ اعجاز قرآنی کا سبب عقل میں نہیں آ سکتا بلکہ خداوند تعالیٰ نے اپنی قدرت سے لوگوں کو اس کے مقابلے سے روک دیا ہے حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ کچھ لوگوں نے اس کا مقابلہ کرنا چاہا مگر عاجز رہے۔ وہ خیال کرتے تھے کہ قرآن کریم کا اعجاز اس کی آیات کے آخری حصوں کی بدولت ہے جو مسجع عبارت کے مشابہ ہیں اس لیے انہوں نے اس کی نقل کرنی چاہی مگر رسوا ہوئے۔ متاخرین میں سے بھی کچھ لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا جیسے ہندوستان کا قادیانی مسیح دجال ہے۔ کچھ لوگوں نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا ہے، جیسے بہا، مگر اس کے پیروؤں نے اس کی کتاب "الاقدس" پوشیدہ کر دی ہے تاکہ وہ لوگوں میں ذلیل و رسوا نہ ہو جائیں۔ اس سے زیادہ کمزور اور بیہودہ بیان اس کے استاد باب کا ہے۔

۲۔ قرآنی ترجموں کی کوتاہی اور کمزوری:

قرآن کریم کے وہ ترجمے جن پر مغربی علماء قرآن فہمی کے سلسلے میں اعتماد رکھتے ہیں وہ سب کے سب ان معانی کے ادا کرنے سے قاصر ہیں جو قرآن کریم کی اعلیٰ عبارت اور معجزانہ طرز بیان سے ظاہر ہوئے ہیں۔ یہ ترجمے معانی کے کچھ حصے کو پیش کرتے ہیں جنہیں مترجم سمجھ سکا ہے بشرطیکہ وہ سمجھے ہوئے مطلب کو بیان کرنا چاہے، مگر ہم پر یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ بعض مترجمین نے قصداً معانی میں تحریف و تبدیلی کی ہے۔ اس کے باوجود بہت کم لوگ قرآن کریم کو مکمل طور پر صحیح سمجھ سکے ہیں اور یہ ناسمجھی غیر مسلموں میں بہت زیادہ ہے۔ ہر مترجم میں دو خامیاں ضرور ہوتی ہیں: اپنی سمجھ کا قصور اور زبان کی کوتاہی۔ اس کا اعتراف مجھ سے اور دوسروں سے مسٹر محمد پکتھال نے کیا جو قرآن کریم کا انگریزی میں ترجمہ کر چکے ہیں اور تین سال ہوئے مصر آئے تھے۔ انہوں نے بعض

انگریزی دان عرب علماء کے سامنے ترجمہ کے وہ مقامات پیش کیے جن کا وہ ترجمہ نہیں کر سکے تھے چنانچہ ان کی مدد سے انہوں نے ان مقامات کے ترجمہ کی اصلاح کی۔ ❶

اس کوتاہی کا اعتراف ان سے پہلے فرانسیسی مستشرق ڈاکٹر ٹاور لیس نے بھی کیا جنہیں فرانس کی وزارت خارجہ اور وزارت تعلیم نے ان باسٹھ لمبی سورتوں کے ترجمہ پر مقرر کیا تھا جن میں مطالب کی تکرار نہیں ہے، انہوں نے یہ ترجمہ کیا اور اپنے ترجمہ ۱۹۲۶ھ کے دیباچہ میں تحریر کیا ہے:

''قرآن کریم کا اسلوب بیان خود خداوند تعالیٰ کا اسلوب بیان ہے۔ وہ طرز بیان جو کائنات کے خالق کی حقیقت کو ظاہر کرتا ہو ضرور خدائی اسلوب ہوگا۔ یہ حقیقت ہے کہ سب سے زیادہ شک رکھنے والے اہل قلم بھی اس طرز بیان کے جادو بھرے اثر کے سامنے جھک گئے ہیں۔ اس قرآن کا اثر تمام دنیا میں پھیلے ہوئے تیس کروڑ مسلمانوں پر اس حد تک ہے۔ کہ اجنبی پادریوں کو متفقہ طور پر اعتراف کرنا پڑا ہے کہ اب تک کوئی ایسا صحیح واقعہ نہیں پیش آیا جس میں کوئی مسلمان اپنے دین سے مرتد ہوا ہو۔ ❷ ابتداء میں عرب بدویوں کے کانوں میں پڑنے والا یہ طرز بیان، بہت عمدہ نثر پر مشتمل تھا جو نہایت عمدہ ترتیب اور ہم آہنگی کے ساتھ بے حد دلکش تھا۔ وہ باہم یکسانیت کے ساتھ مسجع تھا۔ ہر عربی دان سامع کے دل پر اس کا گہرا اثر ہوتا تھا۔ اس لیے یہ بیکار اور بے سود کوشش ہے کہ کوئی انسان اس قدر عمدہ نثر کے اثرات کو جس سے کان پہلے سے ناآشنا تھے دوسری زبان میں ادا کرنے کی کوشش کرے، خاص کر فرنچ جیسی تنگ، سخت اور سنگدل اکھڑ زبان میں جس میں اس قسم کے لطیف احساسات کی گنجائش نہیں ہے، جو اپنی مخصوص روش سے ہٹنا نہیں چاہتی ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ فرنچ اور اس زمانے کی دوسری زبانیں مذہبی زبانیں نہیں ہیں۔ ان میں الوہیت کے مسائل کبھی بیان نہیں کیے گئے۔''

اس کے بعد مترجم موصوف نے بیان کیا ہے کہ وہ لگاتار نو برس کوشش کرتے رہے کہ قرآن کریم کا کچھ حصہ فرنچ زبان میں اس صورت سے منتقل کریں کہ اصل متن

---

❶ ابھی تک ان کا ترجمہ ناقص ہے۔ مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ وہ دوبارہ اس کی تصحیح کریں گے۔

❷ بعض مسلمانوں کے عیسائی ہونے کے بارے میں جو سنا جاتا ہے وہ بعض جاہل عوام کو زبردستی یا بعض غریبوں کو مال کے لالچ سے بہکایا جاتا ہے۔

کی بلاغت بر قرار رہے، مگر ہمیشہ یہ سوال ان کے سامنے آتا رہا کہ آیا وہ ان مشکلات پر غالب آگئے ہیں یا نہیں؟ یعنی انہیں اس بارے میں ہمیشہ شک رہا۔

۳۔ قرآن کریم کا نرالا طرز بیان :

قرآن کریم کا نرالا طرز بیان دوسروں کے طرز بیان سے مختلف ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ عقائد، مواعظ، حکمت، آداب واخلاق کو مختلف سورتوں میں متفرق آیات میں ملا کر دیتا ہے، اس کی اصل وجہ اور مصلحت ہم نے اس کتاب میں بیان کر دی ہے۔ بہر حال اس عجیب وغریب طریقہ نے بڑے بڑے علماء اور مفسرین کو قرآنی علوم ومقاصد کو الگ الگ باب میں جمع کرنے سے روکے رکھا۔ انہوں نے عبادات ومعاملات کے سلسلے کے عملی احکام کی الگ تدوین کی۔ مگر قرآن کریم نے اجتماعی سیاسی اور مالی قوانین واصول کو جن کا نمونہ قارئین اس کتاب میں دیکھیں گے الگ الگ مرتب نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت انہوں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی جیسی ضرورت آج کل ہم محسوس کر رہے ہیں۔

بعض مغربی علماء [1] نے فرانسیسی زبان میں ایک کتاب تیار کی ہے جس میں معانی اور مضامین کے لحاظ سے آیات قرآنی جمع کی گئی ہیں اور انہیں اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق ایک باب یا خاص ابواب میں شامل کیا گیا ہے۔ مگر ان مضامین میں اکثر مقامات پر غلطی کی ہے، جن چیزوں کا اسے علم ہے اس میں اس نے کوتاہی کی اور جن باتوں سے وہ ناواقف ہے وہ بہت زیادہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آیات قرآنی سے عام اصول وقواعد کا استنباط نبی کریم ﷺ کی سیرت اور سنت پر موقوف ہے، انہی کے ذریعے قرآن کریم کی تشریح اور آپ کے احکام نافذ کرنے کا علم ہوتا ہے، نیز خلفا اور اہل علم صحابہ کے آثار واقوال کا علم بھی ہونا چاہیے۔ اسے وہی سمجھے گا جو اس کے بعد ان آیات کریم کا مطالعہ کرے گا، جو ہم نے قرآنی مقاصد کے سلسلے میں اس کتاب میں اختصار کے ساتھ بیان کی ہیں اور ان کی تفصیل تفسیر المنار میں بیان کی ہے۔

---

[1] وہ مستشرق علامہ موسیو جول لا بوم ہے۔

۴۔ اسلامی مملکت کی ضرورت :

اسلام کی کوئی سلطنت ایسی نہیں ہے جو قرآن کریم اور سنت نبوی کو حکومت کے ذریعے قائم کرے اور علم کے ذریعے اس کی اشاعت کرے، ایسی مذہبی جماعتیں بھی نہیں ہیں جن کی نگرانی میں دلائل کے ساتھ اسلام کی دعوت دی جائے۔ نیز اہل اسلام کا کوئی مذہبی اور علمی ادارہ بھی نہیں ہے جس کی طرف قرآن کی تشریح وہدایت کے سلسلے میں رجوع کیا جاسکے اور انسانی سیاست اور عام مصلحتوں کے سلسلے میں جو روز مرہ واقعات کی تبدیلی سے اور علوم وفنون کی نئی ایجادوں کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی رہی ہے ہدایت دے سکے اور ان علوم اور قرآنی عبارت میں اختلاف کی صورت میں رہنمائی کر سکے، نیز مغربی علماء بھی اپنی مشکلات کو حل کرنے میں اس کی طرف رجوع کر سکیں۔

اس سے بھی زیادہ عجیب وغریب واقعہ یہ ہے کہ خود مسلمانوں نے بھی قرون اولی کے بہترین زمانے کے بعد مذہبی استفادہ الہامی قرآن کریم اور سنت رسول کریم سے چھوڑ دیا ہے حالانکہ خداوند تعالیٰ نے انہیں حکم دیا تھا۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ

(اے پیغمبر! ہم نے آپ پر یاد دلانے والی چیز (قرآن) کو اس لیے نازل کیا ہے کہ آپ لوگوں کو وہ سب کھول کر بتادیں جو ان کی طرف خدا نے اتارا ہے تاکہ وہ غور کر سکیں۔)

مسلمان قرآن وسنت کی ہدایت کو چھوڑتے گئے یہاں تک کہ وہ ان دونوں سرچشموں سے بالکل بے نیاز ہوگئے اور وہ اپنے عقائد متکلمین کی کتابوں سے اور عبادات ومعاملات کے احکام غیر مجتہد مذہبی علماء کی کتابوں سے اخذ کرنے لگے، حالانکہ یہ کتابیں انسانوں پر اللہ تعالیٰ کی حجت کو ثابت نہیں کرتی ہیں۔ خصوصاً اس زمانے کے انسانوں پر جبکہ تمام عقلی اور قانونی علوم نے بہت ترقی کی ہے۔ یہاں تک کہ ہمارے مسلمانوں نے بھی ان لوگوں سے علم حاصل کرنا شروع کیا ہے جس طرح ان کے آباء واجداد ہم سے علم حاصل کیا کرتے تھے۔

صرف یہی نہیں ہوا بلکہ ان کتابوں میں متکلمین اور فقہا کے ایسے خیالات ہیں اور جھوٹے اور ضعیف راویوں کی ایسی ایسی روایتیں پائی جاتی ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ثبوت کے طور پر پیش ہوسکتی ہیں۔ جس طرح مسلمانوں کی بد حالی، ان کی

عام جہالت اور ان کی حکومتوں کی ابتری اور تباہ حالی ان کے مذہب کے خلاف ثبوت کے طور پر پیش کی جاچکی ہے اس طرح مسلمان ان کافروں کو اسلام سے بیزار کرنے کا سبب بن گئے ہیں۔

جب مسلمانوں کی قرآن فہمی اور ہدایت کا یہ حال ہے تو ان قوموں کا کیا حال ہوگا جنہوں نے دوسرے مذاہب میں رہ کر نشو و نما پائی ہو اور ان سے مانوس ہوئے ہوں۔ ان کے مذہبی رہنما انہیں اسی مذہب کے مطابق تربیت دیتے ہیں اور دوسرے مذہب سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ زبردست جنگی سلطنتیں ہیں جو صدیوں سے اسلام کی ایسی دشمن ہیں کہ اگر وہ ایسی معاندانہ کوششیں پہاڑوں کے خلاف کرتیں تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتے اور صفحہ ہستی سے مٹ جاتے مگر اسلام زندہ اور ہمیشہ قائم رہنے والے خدا کا دین ہے۔ وہ اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک انسان روئے زمین پر زندہ ہیں، وہ فنا نہیں ہوگا خواہ سب انسان فنا ہو جائیں۔

یہ واضح اسباب ہیں جن کی بدولت اسلام کی اصل حقیقت موجودہ تہذیب کے اجنبی علماء اور خود مسلمانوں سے بھی پوشیدہ ہے۔ وہ آرزو کر رہے ہیں کاش کوئی نیا نبی خدا کی طرف سے عالمگیر ہدایت لے کر آئے جو ان سب کی اصلاح کے لیے کافی ہو۔

چونکہ اسلام انسانیت کا عالمگیر اور مستقل مذہب ہے جس کے ذریعے تمام قوموں کی دینی و دنیاوی ضروریات پوری ہو جاتی ہیں۔ اس لیے تمام آزاد خیال دانشوروں اور آزاد علماء کا جو ان مادی مفاسد سے جن کی برائیاں اس زمانے میں پھیل گئی ہیں رنجیدہ ہوتے ہیں یہ فرض ہے کہ وہ ان حجابات کو اٹھانے کی کوشش کریں جو اسلام کو چھپائے ہوئے ہیں اور ان تمام رکاوٹوں کو دور کریں جو اسلام کی حقیقت کو سمجھنے سے روک رہی ہیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ تمام قوموں کو اسلامی برادری کی طرف آنے کی دعوت دیں اور اسلام کی ہدایت کے ذریعے انسانی تمدن و تہذیب کی تکمیل کریں۔

اس تمہید کے بعد میں انہیں یہ کتاب پیش کرتا ہوں، اس میں وحی محمدی کو ثابت کیا گیا ہے اور قرآن کریم کو خدائے عزوجل کا کلام ظاہر کیا گیا ہے۔ اس میں ہر وہ چیز موجود ہے جس کی انسان کو دینی، سماجی، سیاسی، مالی اور جنگی اصلاح کے لیے ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے ان بنیادی مقاصد کی تشریح میں کسی قدر طوالت اختیار کی ہے اس کی وجہ یہ ہوئی کہ

یہی چیزیں تمام فتنہ وفساد کا سبب ہیں جس کی اس زمانے کے دانشور شکایت کر رہے ہیں۔
اس موضوع کا پورا حق تو ایک بڑی کتاب یا کتابوں ہی میں ادا کیا جاسکتا ہے جس میں قرآن کریم کے تمام مقاصد جمع کر دیئے جائیں اور یہ بتایا جائے کہ انسانوں کو دنیا اور آخرت کے معاملات میں اس کی بے حد ضرورت ہے۔ یہ باتیں میں تفسیر المنار میں اس طرح بیان کر رہا ہوں کہ ہر سورت کی آیات کی مفصل تشریح کے بعد ہر سورت کے اصول و قواعد کو سورت کے آخر میں اجمالی طور پر بیان کرتا ہوں۔

میں نے یہ بحث ابتداء میں قصداً اس مقصد کے لیے نہیں لکھی تھی بلکہ اتفاقیہ طور پر میں نے سورہ یونس۔ ۲ کی اس ابتدائی آیت

اَکَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَیْنَآ اِلٰی رَجُلٍ مِّنْهُمْ

(کیا لوگوں کے لیے یہ بات عجیب تھی کہ ہم نے انہی کے ایک آدمی کی طرف وحی نازل کی)

کی تفسیر شروع کی تھی، اس میں قطعی دلائل کے ساتھ میں نے یہ ثابت کیا تھا کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی وحی ہے۔ محمد ﷺ بھی دوسرے لوگوں کی طرح اپنے علم اور زبان کی قوت تاثیر سے ایسی چیز از خود نہیں پیش کر سکتے تھے۔ یہ نفسیاتی وحی نہیں تھی جو آپ ﷺ کے قلب سے اور آپ ﷺ کی کوشش سے پھوٹ پڑی ہو، جیسا کہ بعض مغربی علماء کا خیال ہے بلکہ یہ قرآنی وحی تمام سابقہ وحیوں سے زیادہ عالمگیر، مکمل اور زیادہ پائیدار ہے۔ اس کے دلائل سب کو ماننے پڑیں گے خواہ لوگ شرعی وحی کو مانتے ہوں یا نہیں؟

اس کے بعد دوران تحریر میں مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ اس بحث کو الگ کتابی صورت میں پیش کروں اور اس کے ذریعے میں مادی تہذیب کی مغربی اقوام اور جاپان کو اسلام کی دعوت دوں۔ سب سے پہلے اسے آزاد خیال علماء کے سامنے پیش کروں تاکہ جب وہ ہدایتیاب ہو جائیں تو وہ اپنی اپنی زبان میں اپنی قوم اور سلطنتوں کو دعوت اسلام دیں۔ اس وجہ سے میں نے مزید تشریح و تفسیر کے ساتھ اس میں اضافہ کیا ہے۔ آخر میں خاتمہ ہے جس میں دعوت اسلام کی تشریح کی گئی ہے، اسی کو میں نے اصل مقصد قرار دیا ہے۔ اگر شروع ہی سے اس موضوع کو لکھنے کا قصد کرتا تو میں اس کی دوسری ترتیب قائم کرتا جس میں بعض مقامات کی طوالت و تکرار سے محفوظ رہتا اور ہر مسئلہ کی اسی کے موقع و محل ہی پر تحقیق ہوتی۔ گو بعض مقامات پر تکرار قصداً ہے، تاہم یہ واقعہ ہے کہ میں نے اس کتاب کو

متفرق اوقات میں تکلیف وپریشانی کے حالات میں لکھا ہے اور کسی موضوع کو تحریر کرتے وقت اس کے پہلے کے مباحث پر غور نہیں کر سکا۔ بلکہ قرآن کریم کے مضامین کو جو اس کی سورتوں میں متفرق ہیں۔ بر وقت حوالہ دینے میں دقت پیدا ہوئی۔ البتہ بعض احادیث کی تصحیح اور راویوں کے سلسلے میں کتابوں کی طرف رجوع کیا گیا۔ آخر میں قارئین کو مشورہ دوں گا کہ کسی مسئلہ کے اجمال کی صورت میں اس کی تفصیل تفسیر المنار میں ملاحظہ فرمائیں اور جہاں کوئی اشکال ہو تو مولف کی طرف رجوع کریں۔

میں نے یہ مقدمہ رسول اکرم ﷺ کی سالگرہ کی رات کو ماہ ربیع الاول ۱۳۵۲ھ میں لکھا۔ (محدثین کے نزدیک قابل ترجیح تاریخ ولادت نو ربیع الاول ہے یہ کتاب آج ۱۲ ربیع الاول کو شائع ہوئی جو آپ کی ولادت کی مشہور تاریخ ہے)

محمد رشید رضا

مدیر ماہنامہ المنار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فصل اوّل:

وحی اور نبوت کی حقیقت

وحی کی تعریف:

اساس میں تحریر ہے۔ اَوْحیٰ اِلَیْہِ وَاَوْحیٰ اِلَیْہِ کے ایک معنی ہیں وَحیت اِلَیْہ اور اَوْحَیْتَ کا مفہوم یہ ہے کہ تم نے کسی سے پوشیدہ باتیں کیں۔ اس طرح یہ استعمال ہے اَوْحیٰ اللہُ اِلیٰ اَنبیَائِہٖ۔ (۱۶:۶۸) واوحیٰ رَبُّکَ اِلَی النَّحلِ

امام راغب نے فرمایا ہے وحی کے اصل معنی الاشارۃ السریعۃ ہے۔ اسی سرعت کے مفہوم کی وجہ سے "امر وحی" اس کلام کو کہا جائے گا جو رمز واشارہ کے طور پر ہو۔ کبھی اس کا ترکیب سے خالی آواز، بعض اعضاء کے اشارہ اور تحریر پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔ اسی مفہوم میں حضرت زکریا کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤی اِلَیْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّ عَشِیًّا۝ (۱۹:۱۱)

(وہ محراب سے اپنی قوم کی طرف برآمد ہوئے اور انہیں اشارہ کیا کہ خدا کی تسبیح صبح وشام کیا کرو)

یعنی انہوں نے ان کی طرف اشارہ کیا اور گفتگو نہیں کی اور وحی یاء کی تشدید کے ساتھ سریع کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔ وحی بمعنی اشارہ میں شاعر کے یہ اشعار ہیں:

نظرت الیہا نظرۃ فتحیرت　　دقائق فکری فی بدیع صفا تہا

فاوحی الیہا الطرف انی احبہا　　فاثر ذاك الوحی فی وجنا تہا

۱۔ میں نے اس کی طرف نگاہ کی تو میرے رفیق خیالات اس کی عمدہ صفات کے بارے میں حیران رہ گئے۔

۲۔ نظر نے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اس اشارہ (بمعنی وحی) نے اس کے رخساروں پر بڑا اثر کیا۔

اس طرح وحی کے لغوی معنی میں فیصلہ کن امر یہ ہے کہ وہ پوشیدہ جلد، مخصوص اطلاع ہے جو دوسروں سے پوشیدہ رہے۔ فطری الہام کا مفہوم بھی اس سے ماخوذ ہے، جیسے شہد کی مکھی کو وحی اور پاکیزہ روح سلیم الفطرت انسانوں کے دلوں میں جو اپنے خیالات ڈالے جاتے ہیں جیسے حضرت موسیٰ کی والدہ کو وحی (جس کا قرآن کریم میں ذکر ہے وَ اَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی اَنْ اَرْضِعِیْهِ ۔ یعنی ہم نے حضرت موسیٰ کی والدہ کو وحی بھیجی (یعنی دل میں بات ڈال دی) کہ تم اسے دودھ پلاؤ، اس کے بر خلاف شیطانی وسوسوں کے مفہوم میں بھی متشمل ہے۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَاِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓی اَوْلِیٰٓئِهِمْ لِیُجَادِلُوْكُمْ (۶:۱۲۱)

(شیطان اپنے دوستوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتے ہیں کہ وہ تم سے جھگڑا کریں۔)

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ یُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا (۶ : ۱۲)

(اس طرح ہم نے ہر نبی کے انسانوں اور جنات کے شیطانوں میں سے دشمن بنائے ہیں جو ایک دوسرے کے دل میں جھوٹ سے آراستہ اور دھوکہ کے وسوسے ڈالتے ہیں)

انبیاء کی طرف خدا کی وحی میں اس مفہوم کے دو اصلی معنی ملحوظ رکھے گئے ہیں یعنی خفا اور سرعت۔ یہ اس کے مصدری معنی ہیں مگر متعلقات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے یعنی وحی اسم مفعول کے معنوں میں اس پیغام کو کہیں گے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں پر اتارا، جس میں غیب کی خبریں، شریعت اور احکام شامل ہیں۔ کچھ پیغمبروں کو کتاب یعنی لکھی ہوئی شریعت دی جاتی ہے اور کچھ کو نہیں دی جاتی۔

اللہ تعالیٰ جب فرشتوں کو کسی کام کا حکم دیتا ہے تو ان کی طرف وحی بھیجتا ہے جیسے ارشاد ہے:

اِذْ یُوْحِیْ رَبُّكَ اِلَی الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّیْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۸:۱۲)

(جب تمہارا خدا فرشتوں کو یہ وحی بھیج رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں اس لیے ان لوگوں کو ثابت قدم رکھو جو ایمان لائے)

خدا فرشتے کی طرف وحی نازل کرتا ہے اور وہ رسول کے پاس وحی پہنچاتا ہے جیسے

ارشاد ہے:

فَاَوۡحٰۤی اِلٰی عَبۡدِہٖ مَاۤ اَوۡحٰی ؕ (۵۱ : ۱۰)

(یعنی خدا نے اپنے بندے جبرئیل علیہ السلام کو وحی بھیجی اور انہوں نے وہ وحی حضرت محمد ﷺ کی طرف پہنچائی۔)

ہمارے شیخ الاستاذ الامام مفتی محمد عبدہ رسالہ التوحید میں وحی کی لغوی تعریف کے بعد ارشاد فرماتے ہیں "علماء نے اس کی شرعی تعریف یہ کی ہے کہ خدا اپنے کسی نبی کو شرعی حکم یا اس کے مشابہ امر کی اطلاع دے۔" لیکن ہم اپنی شرط کے مطابق اس کی یہ تعریف کرتے ہیں "وحی وہ علم ہے جو کسی شخص کو اس تعین کے ساتھ ہو کہ وہ اللہ کی طرف سے واسطہ کے ذریعے یا بغیر واسطہ اسے حاصل ہوا ہے۔" پہلی صورت میں کبھی کوئی آواز کانوں کو سنائی دیتی ہے اور کبھی بغیر آواز کے یہ صورت حاصل ہوتی ہے۔ وحی اور الہام کے درمیان یہ فرق ہے کہ الہام ایک وجدانی کیفیت ہے جس میں نفس کو یقین اور طلب ہوتی ہے اس احساس کے بغیر کہ یہ کیفیت کہاں سے آئی۔ اس کی صورت ایسی ہی ہے جیسے انسان بھوک پیاس غم اور خوشی محسوس کرے۔

یہ تعریف وحی کی ان تینوں قسموں کو شامل کر لیتی ہے جن کا ذکر اس آیت میں آیا ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحۡيًا اَوۡ مِنۡ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوۡ يُرۡسِلَ رَسُوۡلًا فَيُوۡحِىَ بِاِذۡنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِىٌّ حَكِيۡمٌ ۝ (۴۲ : ۵۱)

(کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ اللہ سے گفتگو کرے مگر یا تو وہ وحی ہو یا وہ پردہ کے پیچھے ہو یا وہ ایک قاصد بھیجے اور وہ اس کی اجازت سے جیسا وہ چاہے وحی پہنچاتا ہے۔ درحقیقت وہ بہت بلند اور حکمت والا ہے)۔

وحی سے مراد یہاں دل میں بات ڈالنا ہے۔ پردہ کے پیچھے گفتگو کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص خدا کو دیکھے بغیر اس کی گفتگو کو سنے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے درخت کے پیچھے آواز سنی تھی (جب وہ مدین سے واپس جا رہے تھے اور اس وقت وہ آگ لینے کو گئے مگر پیغمبری مل گئی۔ مترجم)۔ تیسری صورت یہ ہے کہ خدا کا بھیجا ہوا فرشتہ رسول کے پاس پہنچے اور وہ اسے کسی آدمی کی شکل میں دیکھے یا وہ کسی شکل و صورت کے بغیر ہو اور وہ اس کی آواز کو سنے یا اس کی باتوں کو دل میں محفوظ کرے۔

ان کی اس تعریف میں (اگر وحی کے اور الہام کے درمیان فرق نہ کیا جائے) وہ صورت بھی شامل ہو جاتی ہے جسے بعض لوگ "وحی نفسی" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ وہ الہام ہے جو اعلیٰ درجے کی طبیعتوں کو ان کی استعداد کے مطابق حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض مغربی علماء نے ہمارے نبی ﷺ کے لیے بھی یہ چیز ثابت کی ہے اور کہا ہے محمد (ﷺ) نے صحیح مذہب، انصاف پسند شریعت اور بلند ادب پیش کیا ہے، اس لیے یہ محال معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان چیزوں میں (نعوذ باللہ) جھوٹے ہوں۔ جو لوگ عالم غیب کا یقین نہیں رکھتے یا ظاہری دنیا سے اس کے تعلق کے قائل نہیں ہیں انہوں نے یہ تصور پیش کیا ہے کہ آپ ﷺ کی معلومات، افکار اور امنگوں نے آپ ﷺ کے اندر ایک الہامی طاقت پیدا کر دی تھی جسے آپ کی عقل باطن سے فیض حاصل ہوتا تھا یا نفس کی پوشیدہ بلند روحانی طاقتوں کا عکس آپ ﷺ کی بلند قوت متخیلہ پر نمودار ہوتا تھا اور آپ ﷺ کے اعتقادات آپ ﷺ کی آنکھوں پر منعکس ہوتے تھے اور آپ ﷺ ایک فرشتہ کو اپنے سامنے کھڑا دیکھتے تھے اور کانوں میں اس کی آواز سنتے تھے اور یہ فرشتہ جو کچھ بیان کرتا تھا اسے یاد کر لیتے تھے۔

ہمارے اور ان لوگوں کے درمیان اختلاف اسی صورت سے ہے کہ ہم شرعی وحی کو نبی کریم ﷺ کے نفس سے خارج جانتے ہیں اور اسے آسمان سے نازل سمجھتے ہیں۔ داخلی اور اندرون نفس سے فیض حاصل کرتے ہوئے نہیں سمجھتے ہیں جیسا کہ وہ خیال کرتے ہیں۔ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ ایک روحانی مستقل فرشتہ اللہ کی طرف سے محمد ﷺ پر نازل ہوتا تھا جیسا کہ خدائے عزوجل نے کہا ہے:

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۹۲﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹۵﴾ (۲۶:۱۹۲)

(حقیقت یہ ہے کہ تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے نازل شدہ وحی ہے جسے الروح الامین (جبریل علیہ السلام) نے تمہارے دل پر نازل کیا ہے تاکہ تم ڈرانے والوں میں سے ہو جاؤ۔ یہ صاف عربی زبان میں ہے۔ ان کے خیالات میں یہ فرشتہ محض ایک تخیل ہے۔)

آگے چل کر ہم ان خیالات اور شبہات کی تشریح کر کے اسے باطل ثابت کریں گے اور بتائیں گے کہ یہ قرآن کریم خداوند تعالیٰ کی وحی ہے جو بلند آسمانوں کے اوپر سے

نازل ہوا ہے اور یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ حضرت محمد ﷺ کے نفس کا فیض ہو، ہماری کتاب کا موضوع بھی یہی ہے۔ یہ معلوم رہے کہ متکلمین نے اللہ کے کلام کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے: پہلا کلام نفسی اور قدیم ہے اور خداوند تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہے نہ وہ حرف ہے نہ آواز ہے، نہ اس میں ترتیب ہے اور نہ وہ کوئی زبان ہے۔ دوسرا وہ کلام لفظی ہے جو انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوا ہے۔ چاروں الہامی کتابیں بھی اسی میں شامل ہیں۔ ان کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ یہ کلام مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ یہ سب فلسفہ اور نظریاتی خیالات کی بدعتی اصطلاحیں ہیں جن کا کتاب وسنت میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس طرح خدا کی ذات وصفات کے بارے میں تحلیلی بحث چھڑ جائے گی اور شیطانی وسوسے پیدا ہوں گے جن سے پرہیز ضروری ہے۔ تمہارے یقین کے لیے یہ کافی ہے کہ کلام ایک کمالی صفت ہے اس کا ہر اس چیز سے تعلق ہے جس کا تعلق علم سے ہے، مگر علم کے تعلق کا مطلب یہ ہے کہ عالم پر معلومات ظاہر ہو گئی ہیں اور کلام کا مطلب یہ ہے کہ عالم اپنے علم کو جیسے ظاہر کرنا چاہے ظاہر کرتا ہے۔ چنانچہ خداوند تعالیٰ بھی علم وتعلیم، کلام وتکلم کے اوصاف سے متصف ہے۔ اس قسم کے اوصاف کو خداوند تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ باتیں اس کی شان کے خلاف اس لیے ہیں کہ یہ بندوں کے نقائص کے اوصاف ہیں اور اس سے یہ لازم آئے گا کہ اس نے اپنے بندوں کو جو کمالات دیے ہیں اس کے مشابہ اس کے کمالات بھی ہو جائیں کیونکہ اسماء اجناس نقص وکمال کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بہت سی باتوں میں مختلف ہوتے ہیں، خاص کر جب کہ یہ اوصاف خالق ومخلوقات کے درمیان مشترک ہوں۔ خداوند تعالیٰ کی ذات ان کی ذات سے زیادہ مکمل ہے اور اس کا وجود ان کے وجود سے اعلیٰ ہے اور اس کی صفات ان کی صفات سے بلند تر ہیں۔ ان کی صفات وافعال کے بارے میں خدا اور رسول زیادہ جانتے ہیں۔

تمہارے لیے لازم ہے کہ تم صفات وافعال کے مثبت اور منفی پہلو جو صحیح ثابت ہوں ان پر ایمان لاؤ، ان میں کمی بیشی اور تمثیل وتاویل نہ کی جائے۔ اس کی ذات وصفات کی حقیقت کے بارے میں تمہیں اپنی رائے اور عقل سے کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہئے اور نہ خدائی نداء اور رسولوں سے کلام کے بارے میں اور نہ اس کی حقیقت کو معلوم کرنے کے

سلسلے میں رائے زنی ہو کہ خدا کس چیز کے ساتھ قائم ہے اور اس سے کیا باتیں صادر ہوتی ہیں۔ رسول اللہ کے صحابی اور تابعی علماء اسی مسلک پر قائم تھے اور متکلمین کی بدعتوں کے ظہور سے پہلے ائمہ حدیث وفقہ کا بھی یہی خیال تھا۔

نبی اور رسولوں کی حقیقت:

النبی عربی زبان میں النباء سے صفت ہے۔ اس کے معنی ہیں مفید خبر جس کی اہمیت ہو اس میں فاعل و مفعول دونوں معنی درست ہو سکتے ہیں کیونکہ وہ اللہ کی طرف سے مخبر بھی ہے اور اللہ کی طرف سے اسے خبر بھی دی جاتی ہے۔ نبی کا باالتشدید استعمال زیادہ ہے اس میں ہمزہ کو یا سے بدل دیا گیا ہے۔ یا یہ لفظ النبوۃ سے ماخوذ ہے جس کے معنی بلند اور شرافت کے ہیں۔

اہل کتاب کے نزدیک اس کا اطلاق اس الہام والی شخصیت پر ہوتا ہے جو مستقبل کی پوشیدہ باتوں کی اطلاع دے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ قدیم عبرانی زبان میں اس کے اصل مادہ کا معنی یہ ہے "مطلق بلند آواز سے بولنے والا یا شرعی امور میں بولنے والا۔" ہمارے نزدیک نبی اس کو کہیں گے جس پر اللہ تعالیٰ اپنی وحی نازل کرے۔ اگر خدا اسے تبلیغ کا حکم دے تو اسے رسول کہا جائے گا، اس لیے ہر رسول نبی ہے مگر ہر نبی رسول نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (۴۰ : ۳۳)

(محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر وہ اللہ کے رسول اور تمام نبیوں کو ختم کرنے والے ہیں)۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نبوت اور رسالت دونوں محمد مصطفےٰ ﷺ کے بعد ختم ہو گئیں۔ اس لیے آپ ﷺ کے بعد جو شرعی وحی کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا اور گمراہ کن ہے۔ بہت سے لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا مگر ان کا جھوٹ ظاہر ہو گیا۔

محمد ﷺ کے بعد جس کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا وہ کوئی مذہبی اصلاح جس کی انسان کو ضرورت ہوتی ہے نہیں پیش کر سکے بلکہ ان کی کتابیں اور اقوال صرف اپنی تعریف میں مبالغہ آمیز باطل دعوؤں کے ساتھ بھرے پڑے ہیں، جن کا مقصد عوام کو مرعوب کرنا

اور انہیں غلام بنانا ہے، جیسا کہ ہم ولایت، غیب دانی اور روحانی تصرفات کے جھوٹے دعو یداروں کو ملاحظہ کرتے ہیں۔ ان جیسے لوگوں کے دعووں کو قرآن کریم کی آیات باطل کرتی ہیں جس میں تمام رسولوں کے اور خاص کر خاتم النبیین کے فرائض بیان کیے گئے ہیں جیسا کہ تم اس کتاب میں ملاحظہ کرو گے۔ علاوہ ازیں علم تواتر سے یہ معلوم ہو گیا کہ رسول کریم کے شمائل اور اخلاق حسنہ میں تواضع شامل تھی۔ آپ ﷺ شیخی خوری اور جھوٹ سے سخت نفرت کرتے تھے اور ان چیزوں سے آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

قارئین کتاب میں ملاحظہ فرمائیں گے کہ کتاب اللہ اور سنت نبوی انسانوں کی ضروری ہدایت کے لیے کافی ہیں اور ان کے علاوہ انہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

رسالت کی ضرورت اور مذاہب کے بنیادی اصول:

انسانوں کو انبیاء علیہم السلام کی ہدایت کی ضرورت اس لیے ہے کہ ان کی رسالت کے بنیادی اصول تین ہیں جن کی تکمیل میں ان کے حواس اور عقل کا دخل نہیں ہے بلکہ ان معاملات میں وہ اپنے رب اور خالق کے حکم کے تابع ہیں۔

ا۔ ایمان بالغیب:

اس کی بنیاد اللہ کی توحید، اس کی صفات و آیات پر ہے جو اس کے کمالات اور نقائص سے پاک ہونے کو ثابت کرتی ہیں اور اس کی عبادت شکر اور شکر کو ضروری قرار دیتی ہیں کیونکہ ان کے ذریعے نہایت عمدہ طریقے سے نفس پاکیزہ ہو جاتا ہے اور اس کی برائیوں کا میل کچیل دھل جاتا ہے۔ اس طرح نفس اپنے فطری کمال تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ فرشتوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے کیونکہ ان کے ذریعے وحی اور امر خداوندی اور مخلوقات کا نظام وابستہ ہے۔ اس سلسلے میں اس حد میں رہنا چاہئے جو نص قرآنی میں بتائی گئی ہے۔

محاسبۂ نفس:

انبیاء نے عالم غیب کی خبروں کے سلسلے میں جنات اور شیاطین کا ذکر بھی کیا ہے، اس طرح لوگ اپنے دلوں میں بڑے خیالات اور شر و باطل کے محرکات کی تقویت محسوس کرتے ہیں یہ سب شیطانی وسوسے ہیں۔ ان چیزوں کی خبر دینے کی مصلحت یہ ہے

کہ لوگوں کو ہدایت کی جائے کہ وہ اپنے خیالات کا محاسبہ کریں اور ان کے حق وباطل اور خیر شر میں تمیز کریں۔ یہ محاسبہ ان کی روحانی تربیت اور تزکیہ نفس کے لیے بہت بڑا مددگار ثابت ہوگا۔ اسے ہم نے اپنی تفسیر میں دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے اور اسے ہم نے مادی دنیا کے پوشیدہ عالم کی مثال سے جسے جراثیم کہتے ہیں واضح کیا تھا اور بتایا تھا کہ ان جراثیم کا اثر جس طرح اجسام پر ہے اسی طرح شیاطین کا روحوں پر اثر ہے۔ حالانکہ عالم انسانیت پر ہزاروں سال گذر گئے تھے مگر انسان تندرستی، بیماریوں اور کھانے پینے میں ان جراثیم کے زبردست اثرات سے ناواقف تھے۔ یہاں تک کہ اس زمانے میں ان کا انکشاف ہوا۔ لہٰذا اگر لوگ شیطانی وسوسوں سے بچنے کے لیے اپنے نفس کا محاسبہ کرلیا کرتے جیسا کہ وہ اپنے جسم کی حفاظت کے لیے ان جراثیم سے پرہیز کرتے ہیں تو نفس کو شر وفساد سے محفوظ کرنے میں اس تقویٰ اور پرہیزگاری کا اس سے زیادہ اثر ہوتا ہے جو ہم جسم کو جراثیم کے ذریعے بیماریوں سے بچانے کے سلسلے میں محسوس کیا کرتے ہیں۔

اٹھارویں صدی میں بعض مادہ پرستوں نے یہ انکشاف کیا جیسا کہ نبیوں نے خبر دی ہے انسانوں کی مستقل روحیں ہوتی ہیں اس طرح انہوں نے غیر مادی جنات کو معلوم کرنے کا ذریعہ بھی ڈھونڈ نکالا جو ان کے عقیدے کے مطابق مردوں کی روحیں ہیں۔ مگر ہمارا گمان غالب یہ ہے کہ وہ ان کے شیطانوں کی روحین ہیں۔ بہر حال اسی مسئلہ میں صحیح بات بتانے کی اس فصل میں گنجائش نہیں ہے کیونکہ یہ اخلاقی مسئلہ بنا ہوا ہے۔ ہمارا یہاں اصل مقصد اجمالی طور پر رسالت سے واقف کرانا ہے۔ یہ بات مشہور ہے کہ دنیا کے معاملات میں عقل ورائے کے لحاظ سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ انسان یورپ کے بین الاقوامی سیاست داں ہیں۔ مگر ان کی سیاستدانی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی قوم کی دولت اور اپنے علوم وفنون کے نتائج کو باہمی عداوت اور قتل اور تباہ کاری کے لیے استعمال کریں۔ کیا یہ شیطانی سیاست خداوند تعالیٰ کے اس قول کے مصداق نہیں ہے؟

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ (پ۱۴۔۶۳،۶۴)

(خدا کی قسم! ہم نے تم سے پہلے قوموں کے پاس رسول بھیجے تو شیطان نے ان کے کاموں کو مزین

کر کے ظاہر کیا چنانچہ آج شیطان ہی ان کا سرپرست ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ہم نے تم پر کتاب نہیں نازل کی مگر اس لیے کہ تم انہیں وہ باتیں بتاؤ جس میں انہوں نے اختلاف کیا ہے اور یہ ایمان لانے والی قوموں کے لیے رحمت اور ہدایت ہے۔)

۲۔ موت کے بعد دوبارہ اٹھنا اور ایمان و عمل کے جزااور حساب پر عقیدہ رکھنا ضروری ہے۔ یہ ایمان اور خدا کی شناسی کے بعد حق کی پیروی کرنے، وانصاف اور نیکی کے کام کرنے اور برائیوں کے دور کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

۳۔ شرعی کاموں کے ان اصول وحدود پر عمل کرنا جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس میں ذاتی رائے اور خواہشوں کا کوئی دخل نہیں ہے تاکہ اتحاد پیدا ہو سکے اور تفرقہ دور ہو۔ ان اصولوں کی پوشیدہ اور علانیہ پیروی کی جائے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ انسانیت کی مذہب کے ذریعے تہذیب وترتیب ایمان بالغیب پر موقوف ہے اور اس سلسلے میں اسی حد میں رہنا چاہئے جو انبیاء علیہم السلام نے بتائی ہے۔ ان کی اصلاح وتہذیب صرف مادی علوم کے ذریعے نہیں ہو سکتی۔ یہی وہ خیال ہے جسے ہم اس کتاب میں بار بار بیان کریں گے۔

انبیاء کی معصومیت:

انبیاء کو انسانوں کی طرف ہدایت کے لیے بھیجا گیا تھا تاکہ ان کا تزکیہ نفس ہو اور دنیا میں ان کی حالت بہتر ہو جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس دنیا کی زندگی سے (آخرت کی) اعلیٰ زندگی کی تیاری کر سکیں۔ یہ مقصد اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک کہ خود انبیاء اس بات کے اہل نہ ہوں کہ ان کے اعمال اور سیرت میں ان کی پیروی کی جائے اور شریعت وآداب واخلاق کے جو احکام وہ اپنے رب کی طرف سے پہنچاتے ہیں ان پر عمل ہو۔ اسی وجہ سے ہمارے علماء نے کہا ہے کہ انبیاء کا گناہوں اور برائیوں سے معصوم ہونا ضروری ہے۔ بعض نے یہاں تک اصرار کیا ہے کہ عہد نبوت سے پہلے اور اس کے بعد دونوں زمانوں میں وہ کبیرہ وصغیرہ گناہوں سے محفوظ ہوں۔ مگر بعض علماء نے کہا ہے کہ وہ ان صغیرہ گناہوں سے معصوم ہونے چاہئیں جن سے خست اور کمینہ پن ظاہر ہوتا ہے۔

اہل کتاب انبیاء کی معصومیت کے قائل نہیں ہیں۔ ان کی مقدس کتابیں بعض بڑے بڑے پیغمبروں پر فحش گناہوں کے ارتکاب کا الزام لگاتی ہیں جو ان کے اسوہ حسنہ

کے منافی ہے، بلکہ اس سے شر وفساد کی جرات پیدا ہوتی ہے۔ نصاریٰ پیغمبروں کے گناہوں کو اپنے اس عقیدہ کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام معصوم ہیں کیونکہ وہ رب اور معبود ہیں اور وہی لوگوں کو ان گناہوں کے عذاب سے نجات دلائیں گے جو اولاد آدم کو ورثہ میں ملے ہیں۔ حضرت مسیح کے علاوہ اور کوئی سفارش کرنے والا اور نجات دہندہ نہیں ہو سکتا کیونکہ گنہگار گناہگاروں کو نجات نہیں دے سکتا۔ مگر یہ عقیدہ بت پرستوں جیسا عقیدہ ہے جو پیغمبروں کے دین ان کی کتابوں اور عقل کے بھی خلاف ہے اور ہندی صنم پرستوں کے مذہب کے مطابق ہے۔

علاوہ ازیں ان کے مقدس قدیم وجدید عہد ناموں میں بھی جو ہمارے نزدیک تحریف شدہ شکل میں ہیں تمام نبیوں پر برائیوں کا الزام نہیں ہے۔ چہ جائیکہ کہ وہ گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوں۔ ان کتابوں میں یوحنا معمدان پر کسی برائی کا الزام نہیں لگایا گیا ہے بلکہ انجیلوں میں اس بات کی شہادت ہے کہ وہ معصومیت میں حضرت مسیح سے بڑھے ہوئے تھے۔ لوقا کی انجیل میں ہے۔(۱:۶۵) "وہ (یوحنا) رب کے سامنے عظمت والے ہوں گے وہ شراب اور نشہ والی شے نہیں پیتے تھے اور اپنی ماں کے پیٹ ہی سے مقدس روح سے لبریز تھے اور رب کا ہاتھ ان کے ساتھ تھا۔" خود حضرت مسیح نے ان کے بارے میں کہا ہے (متی ۱۱:۱۱) "میں تم سے سچ بات کہتا ہوں کہ عورتوں نے یوحنا (المعمدان) سے زیادہ عظمت والا بچہ نہیں جنا۔ یوحنا ایسی حالت میں آئے کہ وہ نہ کھاتے تھے نہ پیتے تھے۔ لوگ کہنے لگے اس میں شیطان ہے۔ مگر جب فرزند انسان کھاتا پیتا آیا تو وہ کہنے لگے یہ کھانے والا انسان ہے اور بہت شراب پینے والا ہے نیز محصول وصول کرنے والوں اور خطاکاروں سے بھی محبت کرتا ہے۔"

بلکہ انجیلیں شہادت دیتی ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنی والدہ اور بھائی کی توہین کی، اور انہیں ملنے کی اجازت نہیں دی جبکہ انہوں نے ان سے گفتگو کرنے کی اجازت مانگی تھی۔ لوگوں نے اس کی تاویل یہ کی ہے کہ وہ ان کے باپ کے مرضی کے مخالف تھے جیسا کہ متی کی انجیل کی بارہویں فصل کے آخر میں اور مرقس کی انجیل کی تیسری فصل کے آخر میں ہے۔ لوقا کی انجیل کی عبارت اس طرح ہے:

(۸:۲) انہوں نے خبر دی تمہاری والدہ اور بھائی باہر کھڑے ہیں وہ تم سے ملنا

چاہتے ہیں انہوں نے جواب دیا۔ میری ماں اور بھائی وہ ہیں جو اللہ کے کلام کو سنتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔

یہ بات ہم مانتے ہیں کہ ان کے بھائی ان پر ایمان نہیں لائے جیسا کہ دوسری جگہ تصریح کی گئی ہے، لیکن کیا ان کی والدہ بھی ایسی تھیں؟ کیا والدہ سے انہیں ایسا سلوک کرنا چاہیے تھا؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ والدین کے ساتھ خواہ وہ مشرک ہی کیوں نہ ہوں اچھے سلوک کی ہدایت کرتا ہے چہ جائیکہ وہ حضرت مسیح کی والدہ ہوں جنہیں تمام دنیا کی عورتوں پر فضیلت حاصل ہے۔ ماں کی توہین کرنا تمام قوموں کی شریعتوں اور آداب واخلاق میں گناہ سمجھا گیا ہے۔

یہاں تک کہ بہت زیادہ شراب پینا بھی ان شریعتوں میں برا ہے جنہوں نے اسے قطعی حرام نہیں کیا۔ انہی انجیلوں میں یہ مذکور ہے کہ شیطان ان (مسیح علیہ السلام) پر چالیس دنوں تک مسلط رہا انہیں آزماتا رہا اور انہیں اپنی عبادت کی طرف بلاتا رہا جیسا کہ آپ متی کی انجیل کی چوتھی فصل کے شروع میں ملاحظ فرمائیں گے۔ ایسا واقعہ دوسری انجیلوں میں بھی ہے مگر ہم ان واقعات سے بیزاری کا اعلان کرتے ہیں۔

انجیلیں اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ یوحنا لوگوں کے پاس توبہ اور گناہ بخشوانے جاتے تھے اور حضرت مسیح کے پاس بھی گئے تھے۔ ان کے والد زکریا اور والدہ الیصابات (الزبتھ) دونوں خدا کے سامنے نیک تھے اور خدائی احکام کی پیروی کرتے تھے (لوقا: ۴: ۱) ان کی عمل معصومیت کی شہادت ہے۔

اس طرح دوسرے انبیاء بھی ہیں جن کی عہد قدیم کی مقدس کتاب نے نیکی کی شہادت دی ہے اور ان کی طرف معمولی غلطی بھی منسوب نہیں کی۔ حضرت آدم نے جب غلطی کا ارتکاب کیا تھا اس وقت وہ کسی کے بھیجے ہوئے پیغمبر نہیں تھے اور نہ ان کے ساتھ ایسی جماعت تھی جن کے لیے وہ برا نمونہ بن سکتے۔ وہ مخصوص درخت کا پھل کھانے کی مخالفت کو بھول گئے تھے اس طرح وہ اس بات کا نمونہ بن گئے کہ نوع انسانی میں اطاعت کی طرح معصیت کا امکان بھی ہے خواہ وہ سہواً ہو یا عمداً۔ (اور یہ بات بھی بتائی گئی ہے کہ معصیت کا علاج توبہ سے ہو سکتا ہے اور اس طرح خدا گناہ معاف کر دیتا ہے۔ ان کے دونوں بیٹے قابیل وہابیل (نیکی وبدی کی) دونوں طاقتوں کا نمونہ تھے اور ان کے نزدیک بھی

کتاب مقدس کی یہ شہادت ہے کہ ہابیل نیک تھے حالانکہ وہ نبی نہیں تھے مگر اس کے باوجود انہوں نے کوئی برائی نہیں کی۔

قرآن کریم تمام الہامی کتابوں پر حاوی ہے جیسا کہ ہم نے حضرت آدم کے معاملے میں مختصر طور پر بیان کیا۔ اس نے انبیاء اور رسولوں کے قصے بیان کرتے ہوئے یہ بتایا کہ وہ سب کے سب نیک تھے اور نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ان کی اقتداء کی جاسکتی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۚ

(ہم نے انہیں امام (پیشوا) بنایا وہ ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کرتے تھے ہم نے ان کی طرف اچھے کاموں، نماز قائم کرنے اور زکوۃ دینے کی وحی نازل کی اور وہ ہمارے عبادت گذار تھے۔)

اس کے بعد مشہور انبیاء کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ (٦:٩٠)

(یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی ان کی ہدایت کی اقتدا تم بھی کرو۔)

خاتم الانبیاء (حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ) کے بارے میں جو ان سب کی ہدایت کی تکمیل کرنے والے ہیں خداوند تعالیٰ کا قول ہے۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ

(ہم نے تمہیں زبردست فتح دی تاکہ خدا تمہارے اگلے پچھلے گناہ معاف کردے۔)

یہ ارشاد بھی ہے:

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ (٤٧:١٩)

(اپنے گناہ اور مسلمان مرد اور عورتوں کے گناہوں کی معافی طلب کر۔)

ان مقامات میں ذنب کا لفظ اپنے لغوی معنی میں مستعمل ہے جو ذنب الدآبۃ سے مشتق ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ہر وہ کام جس کا انجام مضر یا مصلحت کے منافی ہو یا افضل شے کے برخلاف ہو اس میں وہ اجتہادات بھی شامل ہیں جو شرعاً کسی کام کے بارے میں ہوں۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے بعض منافقین کو غزوہ تبوک سے پیچھے رہنے کے سلسلے میں اجازت دے دی تھی جس پر خداوند تعالیٰ کی طرف سے اس آیت میں عتاب نازل ہوا

تھا:

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾ (۹:۴۳)

(اللہ نے تمہیں معاف کیا مگر تم نے انہیں جازت کیوں دی جب تک کہ سچ اور جھوٹ تم پر ظاہر نہ ہو جائے اور تمہیں ان کا علم ہو جاتا۔)

انبیاء کی گناہوں سے معصومیت اسی صورت میں ہے کہ وہ وحی الٰہی کی مخالفت نہیں کر سکتے کیونکہ اگر وہ بھی نافرمانی کریں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کے ماننے والوں کو اللہ کی طرف سے گناہ کرنے کا حکم مل گیا ہے کیونکہ لوگوں کو انبیاء کا اتباع کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے ہمارے رسول اکرم ﷺ کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿۲۱﴾ (۳۳:۲۱)

(در حقیقت تمہارے لیے رسول اللہ کی ذات عمدہ نمونہ ہے اس کے لیے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اور اللہ کو بہت یاد کرتا ہو۔)

عقل و علم ہدایت کے لیے ناکافی ہیں:

کہا جاتا ہے کہ ایمان بالغیب اور خدا کے وجود کا تصور انسانی فطرت میں طبعی طور پر موجود ہے جیسا کہ آپ نے تحقیق کے ساتھ بیان کیا یا وہ ایک ایسی الہامی شے ہے جو افراد انسانی کے دلوں میں عقل و سمجھ کے نشوونما کے ساتھ ساتھ خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جب عقلمند فلسفی اپنے علوم میں اس قدر ترقی یافتہ ہو جاتے ہیں کہ وہ خدائے واجب الوجود کے وجود، اس کی علم و حکمت اور اس کی تعظیم و عبادت اور شکر نعمت کے وجود کو زبردست دلائل سے ثابت کرتے ہیں اور بعض یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ انسانی روح مرنے کے بعد زندہ رہتی ہے اور اسے یا تو ہمیشہ آرام و سکون ملتا ہے یا وہ ہمیشہ دردناک عذاب میں مبتلا رہتی ہے اور اسی طرح انہوں نے عوام کے لیے ضابطہ اخلاق و آداب بھی تیار کر رکھا ہے جس سے انسانیت کی فلاح و بہبودی اور سماجی رشتے قائم ہیں۔

میں اس کے جواب میں یہ کہتا ہوں کہ بے شک یہ سب باتیں درست ہیں کہ

گذشتہ تاریخ اسے ثابت کر چکی ہے اور دور حاضر بھی اس کی شہادت دیتا ہے مگر انبیاء کی ہدایت اور حکماء کے علم و حکمت کے درمیان بنیادی فرق ہے۔ ان کے ضابطہ اخلاق کی صحت اور ان کی حقیقت پر یقین کرنے اور عوام کے تمام طبقوں کے دلوں پر ان کا کہاں تک اثر ہوتا ہے؟ (ان سب باتوں کا لحاظ کرتے ہوئے ان میں اور انبیاء کی ہدایت میں بہت بڑا فرق ہے)۔

حکماء کا علم و حکمت انسانوں کے ناقص خیالات ہیں۔ ایسے خیالات ہیں جو عالم غیب کے متعلق صرف اتنا بتاتے ہیں کہ وہ موجود ہے مگر اس کی حقیقت معلوم نہیں ہے نیز اس میں بھی غلطی اور مخالفت کا امکان ہے۔ اس پر بھی ان باتوں کو لوگوں کا صرف ایک مخصوص حلقہ ہی سمجھ سکتا ہے اور جو سمجھ لے ضروری نہیں ہے کہ وہ اسے تسلیم بھی کر لے اور اگر کوئی انہیں تسلیم کرے اور صحیح مان بھی لے تو ضروری نہیں ہے کہ انہیں اپنی خواہشات پر ترجیح دے۔ کیونکہ ان کے وجدانی جذبات پر غالب آنے والا کوئی نہیں ہے اس لیے ان افکار و خیالات کو دینی و مذہبی حیثیت حاصل نہیں ہو گی کہ ان کے سامنے عبادت سمجھ کو سر تسلیم خم کیا جائے۔ وجہ یہ ہے کہ نوع انسانی کی فطری طبیعت اور مزاج کچھ اس قسم کا ہے کہ کوئی اپنے جیسے بشر کے سامنے بندہ بن کر سرنگوں نہیں ہو سکتا خواہ وہ علم و حکمت میں اس سے کتنا ہی بڑھا ہوا کیوں نہ ہو۔ کیونکہ وہ اس کا مطیع و فرمانبردار ہو گا جس کے بارے میں اسے اعتقاد ہو کہ اس کے پاس غیبی طاقتیں موجود ہیں جو اس کی ذات کو نفع و نقصان پہنچانے کی طاقت رکھتی ہیں۔ وہ نظام کائنات کے معمولی طریقوں سے مرغوب نہیں ہو گا جن کا تمام لوگوں سے تعلق ہے۔

میں (اس مسئلہ کی وضاحت میں) ایک مثال پیش کروں گا۔ شیخ الرئیس بو علی سینا کا ایک طالب علم خادم تھا جو اس کے علم اور فلسفہ کا بہت دلدادہ تھا۔ وہ تعجب کرتا تھا کہ وہ محمد ﷺ کے مذہب کو کیسے مانتا ہے اور اس کی کیوں کر پیروی کرتا ہے حالانکہ وہ ان سے زیادہ عالم اور ترقی یافتہ ہے۔ اس خیال کا اس نے بو علی سینا سے متعدد بار اظہار بھی کیا، مگر وہ اس سے کنارہ کشی کر لیتا تھا، یا اسے دھمکا دیتا تھا۔ ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ وہ دونوں اصفہان کے شہر میں ایسے وقت ٹھہرے جب کہ رات کو بہت سردی پڑ رہی تھی اور بہت برف باری ہو رہی تھی۔ شیخ الرئیس نے صبح کے وقت اپنے خادم کو جگایا اور اس سے وضو

کے لیے پانی طلب کیا۔ اس پر اس نے سخت سردی اور صبح نہ ہونے کا عذر کیا۔ اس کے بعد شیخ الرئیس نے صبح کی اذان کے وقت اسے جگایا اور پانی مانگا، اس وقت بھی اس نے سخت سردی کا عذر پیش کیا، یہاں تک کہ موذن نے کہا اشھد ان محمد رسول اللہ۔ شیخ الرئیس نے اپنے خادم سے کہا سنو موذن کیا کہہ رہا ہے اس نے کہا وہ کہہ رہا ہے۔ اشھد ان محمد رسول اللہ۔ بو علی سینا نے کہا اب وقت آگیا ہے کہ تمہاری قدیم گمراہی سے تمہیں آگاہ کروں۔ دیکھو تم میرے خادم ہو، میری خدمت کے سوا تمہارا اور کوئی کام نہیں ہے اور تم مجھے سب لوگوں سے زیادہ پسند کرتے ہو اور سب سے زیادہ میری عزت واحترام کرتے ہو۔ یہاں تک کہ تم مجھے رسول اللہ ﷺ سے بھی افضل سمجھتے ہو اور تمہیں یہ بات ناپسند ہے کہ میں ان پر ایمان لے آؤں اور ان کی اتباع کروں۔ ان تمام باتوں کے باوجود تم ایک کمترین خدمت کے سلسلے میں جو گھر کے اندر ہی کی جائے سخت سردی کا بہانہ کر کے میرے حکم کی مخالفت کرتے ہو۔ مگر یہ ایرانی موذن فجر سے پہلے اپنے گھر سے نکلتا ہے اور اس منارہ پر چڑھتا ہے جہاں شہر کی ہر جگہ سے زیادہ ٹھنڈک ہے۔ یہاں تک کہ جب صبح صادق نمودار ہوتی ہے تو وہ اپنی اذان میں محمد عربی کو ان کی رحلت سے چار سو برس سے زیادہ کی مدت گذرنے کے بعد بھی بلند آواز سے پکارتا ہے۔ یہ ایمان یقین شہادت وثواب کا جذبہ ہے اس پر خوب غور کرو۔ اس وقت تمہیں عوام پر نبوت کی حکومت اور علم وفلسفہ کی حکومت کا فرق سمجھ میں آجائے گا۔

مذہبی وحی کی ہدایت کو علم سے حاصل کی ہوئی ہدایت پر ترجیح حاصل ہے کہ مومنین کے تمام طبقے عبادت سمجھ کر اس کی اتباع کرتے ہیں اور اگر اس مذہب کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے اور اس کے ساتھ ایمان راسخ ہو تو اس کی حیثیت تمام متبعین کے لیے مسلم الثبوت ہوگی اور مخالفت وضد کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم یہ ملاحظہ کرتے ہیں کہ وہ قومیں جو دین کا غلط مفہوم سمجھتی ہیں اور ان کا ایمان متزلزل ہو گیا ہے اور ہو رہا ہے ان کے لیے عالموں کا علم اور حکماء کی حکمت بے سود ثابت ہوتی ہے جیسا کہ اس زمانے میں علم وحکمت نے بہت ترقی کی ہے اور تعلیم اس قدر عام ہو گئی ہے کہ ایسی کسی زمانے میں نہیں تھی۔ مگر اس کے باوجود لوگ کسی بادشاہ، کسی حاکم، بہت بڑے عالم، کسی بڑے مشہور فلسفی یا ماہر قانون کی بات نہیں مانتے۔ بلکہ اخلاق وآداب اور سماج میں بدنظمی

کا دور دورہ ہے۔ کسی کی جان ومال اور آبرو محفوظ نہیں اور ایسا زمانہ آگیا ہے کہ اس کی نظیر پہلے زمانہ میں نہیں ملتی۔ اس کی وجہ سے قومیں اور سلطنتیں زبردست فتنہ وفساد کا شکار بن گئی ہیں۔ اکثر انسان خدا کے وجود اور اس کے علم وحکمت پر ایمان رکھتے ہیں اور موجودہ تعلیم یافتہ خدا کی وحدانیت کے قائل ہیں اور انبیاء علیہم السلام کے بعض نام نہاد جاہل پیروں کے سوا شرک کہیں باقی نہیں رہا ہے۔ یہ مذاہب بھی صحیح مذہب نہیں ہیں۔ ان کی سب سے بڑی بنیاد جو توحید مطلق ہے منہدم ہو گئی ہے چنانچہ ان کی اولیاء پرستی اور اس سے متعلقہ خرافات اور بدعقیدگی سے ان کے مذہب کے صحیح ہونے پر لوگوں کو شبہ پیدا ہو گیا ہے اور ان کی اتباع سے لوگوں میں بیزاری پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اکثر انسان یا تو انبیاء کو مانتے ہیں اور ان خرافات کو بھی تسلیم کرتے ہیں یا کافر ہیں اور اس بات سے منکر ہیں کہ مذہب خدائی وحی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا فریقین کو صحیح مذہب کی ہدایت کی طرف لوٹانا ضروری ہو گیا ہے۔ وہ صحیح مذہب صرف اسلام ہے۔

مذہب جس کی طرف موجودہ قوموں کی اکثریت منسوب ہے عیسائیت کا مذہب ہے۔ یہ مذہب بھی ان میں اس لیے باقی رہ گیا ہے کہ ان کی حکومتوں نے اسے ان کے سماجی نظام زندگی میں شامل کر دیا ہے ورنہ اس کا روحانی تسلط تو صرف عورتوں اور جاہل عوام میں باقی رہ گیا ہے۔ اس فصل کی طباعت سے پیشتر ہمارے پاس یہ خبریں آئی تھیں کہ جرمن قوم جو روئے زمین پر علوم وفنون اور تمدن میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوم ہے اس کے لیڈروں نے مذہب کے خلاف بغاوت کر دی ہے، جس کا مقصد کتاب مقدس کے عہد قدیم کی کتابوں کی بنیاد کو منہدم کرنا اور عہد جدید کی تعلیمات میں ترمیم کرنا ہے۔ اس طرح وہ جرمنی قوم کو ایسی جرمن نسل کے ساتھ وابستہ کرنا چاہتے ہیں جو آرین ہے اور وہ ہر سامی چیز سے بیزاری کا اعلان کر رہے ہیں حالانکہ ان کے انبیاء رسول اور مسیح ومعبود سب سامی نسل سے تھے۔ (مگر نسلی قومیت کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے) وہ جنگ کے شہداء اور اپنے قدیم جرمن بزرگوں کو مقدس بنانا چاہتے ہیں۔ یہ بھی اہل جاپان کی طرح ایک قسم کی بت پرستی ہے جو ان کے اور اہل یورپ کے درمیان عداوت کی آگ کو بھڑکا دے گی۔

لہٰذا اس زمانے میں عالم انسانیت کو بچانے کا کوئی راستہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ

وحی محمدی کو ثابت کیا جائے جو عالم انسانیت کو متحد کر سکتی ہے اور اس کا تزکیہ نفس کر کے ان کی فطرت کی تکمیل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، اس طرح اور اس کے ذریعے انہیں دنیا اور آخرت کی سعادت حاصل ہو گی۔ ہم نے اس کتاب میں بیان کیا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ اور خاتم النبیین تمام دنیا کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ آپ ﷺ تمام جہانوں کے لیے رحمت ہیں۔ یہ آپ ﷺ ہی کی شخصیت ہے جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے دین کو مکمل کیا اور انسانی برادری کو متحد کرنے کے لیے نسلی اور وطنی تعصبات کو دور کیا، چنانچہ اس دین کی اتباع موجودہ روحانی اور سماجی مہلک زہروں کا مجرب تریاق ہے۔ امید ہے کہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ ہدایت کے دروازے ہر آزاد خیال طالب حق اور اصلاح پسند انسان پر کھول دے گا اور وہ اس پر غور و خوض کریں گے، اسی قسم کے لوگوں کو خداوند تعالیٰ نے ان آیات میں مخاطب کیا ہے۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِیْنٌ ۝ یَّهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ یَهْدِیْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ (پ ۶،۲۰ رکوع)

(تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور کھلی ہوئی کتاب آئی ہے جس کے ذریعے اللہ اس کو جو اس کی رضا مندی چاہے سلامتی کے راستے دکھاتا ہے اور انہیں اپنے حکم سے تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکال لاتا ہے اور انہیں سیدھے راستہ پر چلاتا ہے۔)

فصل دوم:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا اثبات

آزاد خیال اور معقول انسانوں میں سے جس کسی نے اہل کتاب یہود و نصاری کی مقدس کتابیں عہد قدیم و عہد جدید کے ساتھ ساتھ قرآن، کتب سنت اور سیرت محمدی کا مطالعہ کیا ہے اس کی عقل اور ضمیر یہ ماننے پر مجبور ہو گا کہ جو کوئی ان کتابوں کو خدا کی وحی مانے گا اور ان کے انبیاء کو معصوم جانے گا وہ ضرور قرآن کریم کو خدا کی وحی اور محمد ﷺ کو معصوم نبی تسلیم کرے گا، جیسے کوئی فقیہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ سے انکار نہیں کر سکتا اس طرح کوئی نحوی سیبویہ اور ابن جنبی کی نحو کا منکر نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی شاعر رضی اور بحتری کی شاعری کا انکار نہیں کر سکتا ہے، اسی طرح جلیب فلسفی ریاضی دان اور ماہر فلکیات کے بارے کہا جا سکتا ہے ہر ایک اپنے علمی رہنماؤں کا ساتھ دے گا، چنانچہ نا ممکن ہے کہ آنکھوں والا اپنی بینائی کو بڑا سمجھ کر چاند اور ستاروں کی روشنی کو آفتاب کی روشنی پر ترجیح دے یا چراغ کی روشنی کو دن کی روشنی سے اچھا سمجھے۔ خدا ابو صیری کا بھلا کرے جس نے یہ شعر کہے۔

الله اکبر ان دین محمد وکتابه اقوی واقوم قیلا
لاتذکروا الکتب اسرا فقف عنده طلع الصباح فاطفا القند بلا۔

(اللہ اکبر! محمد کا دین اور اس کی کتاب سب سے زبردست اور سب سے زیادہ مستند ہے اس کے سامنے اگلی کتابوں کا نام نہ لو صبح نے طلوع ہو کر چراغ بجھا دیئے۔)

اس بات کی ان مغربی علماء نے بھی تصریح کی ہے جنہوں نے عیسائیت میں پرورش پائی اس سے اچھی طرح واقف ہونے کے بعد اسلام کا بھی صحیح علم حاصل کیا، اگرچہ وہ

نا مکمل رہا۔ جنیوا یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کے پروفیسر مستشرق اور ار مونیتہ قرآن کریم کے فرنچ ترجمہ کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"محمد (ﷺ) ایسے ہی سچے تھے جیسے قدیم زمانے میں بنو اسرائیل کے پیغمبر تھے، نبیوں کی طرح وہ بھی خواب دیکھتے تھے اور خدا کی وحی ان پر نازل ہوتی تھی، مذہبی عقیدہ اور خدا کے وجود کا زبردست تصور ان کے دل پر اس طرح چھایا ہوا تھا جس طرح گذشتہ نبیوں پر مسلط تھا اور انہی کی طرح اس تصور کے اثر سے انہیں الہام نفسی ہوتا تھا اور اس سے ان کی شخصیت دوبالا ہو جاتی تھی جس کی بدولت وہ خدا کی تجلیات، وحی اور روحانی مراتب حاصل کرتے تھے۔"

یہ آزاد خیال مغربی عالم کہتا ہے کہ بنو اسرائیل کے انبیاء کی جو خصوصیات تھیں وہ سب محمد (ﷺ) کو حاصل تھیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ میں نبوت کی تمام خصوصیتیں مکمل ترین صورت میں صحیح روایات کے ساتھ پائی جاتی تھیں، جن میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں تھی جیسا کہ ہم عنقریب واضح کریں گے مگر اس نے ان خصائص کی جو توجیہ کی ہے، وہ وہی ہے جو مادہ پرست وحی مطلق کی توجیہ میں بیان کیا کرتے ہیں جس پر ہم تیسری فصل میں بحث کریں گے۔

اس عالم نے اسلامی کتابوں کی مدد سے محمد ﷺ کی نزول وحی کا حال اس طرح تحریر کیا ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی روایت کو صحیح مانتا ہے۔ اس کے بعد فرانسیسی مستشرق امیل در منگھم نے اپنی کتاب حیات محمد ﷺ میں اس طرح تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ جیسے وہ بھی ان روایات اور اس کے موضوع کو صحیح مانتا ہو۔ اس کتاب میں اس نے انسانی اصلاح کے سلسلے میں آپ ﷺ کی نبوت کے اثرات کی تشریح کی ہے نیز مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان اتفاق کی خواہش کا اظہار اور ان کی باہمی نااتفاقی پر افسوس ظاہر کیا ہے۔

یہاں ہم ایک ایسے مغربی عالم کے حوالہ سے وحی نبوت اور معجزات کی تعریف پیش کرتے ہیں جو موجودہ علوم کے ساتھ ساتھ مذہبی اور تاریخی علوم کا بھی ماہر ہے، اس کا نام ڈاکٹر جارج پوسٹ ہے، اس نے عربی زبان میں کتاب مقدس (بائیبل) کی ایک لغت بھی تحریر کی ہے۔ یہ ہم اس لئے کر رہے ہیں کہ آزاد خیال انسان بنو اسرائیل کے پیغمبروں اور ان کی وحی کے بارے میں صحیح فیصلہ کر سکیں۔

عیسائیوں کے نزدیک وحی و نبوت کی تعریف:

کتاب مقدس (بائبل) کی ڈکشنری مطبوعہ امریکن پریس بیروت ۱۸۹۴ء میں "وحی" کے لفظ کی تشریح اس طرح کی گئی ہے (اس میں اکثر شواہد اور حوالوں کے اشارے محذوف ہیں۔) یہ لفظ کسی شہر یا قوم میں خاص نبوت کے اظہار کے لیے مستعمل ہے۔ (حزقیال ۱۰: ۱۲) میں آیا ہے "یہ وحی ہی سردار ہے" یعنی وہ قوم کی نشانی ہے۔ عام طور پر وحی کے لفظ سے الہام مراد ہوتا ہے، اسی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے "پوری کتاب اللہ کی طرف سے وحی کی صورت میں نازل ہے۔" اس صورت میں وحی کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کی روح الہام والے لوگوں کی کتاب میں حلول کر گئی ہے۔ اس کی کئی قسمیں ہیں۔

(۱) خدائی روح انہیں ایسے روحانی حقائق اور مستقبل کے واقعات بتاتی ہے جن تک ان کی رسائی اس کے سوا اور کسی ذریعے سے نہیں ہو سکتی تھی۔

(۲) انہیں ایسے مشہور واقعات یا مسلم حقائق کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ اگر وہ ان واقعات کو زبانی بتائیں یا تحریری طور پر لکھیں تو وہ غلطی سے محفوظ رہیں۔ ایسی صورت میں کہا جاتا ہے "اللہ والے بزرگوں نے روح القدس کی تائید سے یہ بات کہی ہے" اس وقت بولنے والا یا لکھنے والا اپنی شخصیت کو قائم رکھتا ہے۔ صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ خدائی روح سے متاثر ہو کر اس کی رہنمائی کے مطابق اپنی قوتیں اور اپنی صفات کو کام میں لاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان الہامی کتابوں کے معزز موقعوں کو فطری قابلیت اور اسلوب بیان وغیرہ میں نمایاں اور ممتاز دیکھتے ہیں۔ اس تعلیم کی تشریح میں کچھ دقتیں ہیں۔ مسیحی علماء کا اس کی تشریح میں اختلاف ہے، مگر اس بات پر تمام عیسائی متفق ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے ان لوگوں پر وحی نازل کی تھی تاکہ وہ خدائی ارادے کو تحریر کر سکیں اور دائمی نجات حاصل کرنے کے لیے انسان کو ایمان اور عمل کی ضروری باتیں بتائیں۔

نبوت کی تعریف:

اسی کتاب میں نبی، انبیاء اور نبوت کے ماتحت یہ لکھا ہے۔

"نبوت" ایک لفظ ہے جس کے معنی اللہ کی مذہبی باتوں کی خبر دینا ہے بالخصوص

مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کرنا۔ حضرت ہارون علیہ السلام کو نبی اس لیے کہا گیا تھا کہ وہ اپنی فصاحت کی وجہ سے حضرت موسیٰ کی طرف خبر دیتے اور گفتگو کرتے تھے۔ (خروج ۷:۱)

قدیم زمانے کے پیغمبر موسوی شریعت ہی کا پیغام دیتے اور حضرت مسیح کے آنے کی پیش گوئی کیا کرتے تھے۔ صموئیل کے زمانے میں جب کاہنوں میں تعلیم اور علم کا شوق کم ہو گیا تو صموئیل نے رامہ کے مقام پر ایک مدرسہ قائم کیا اور وہاں کے طلباء کو فرزندان انبیاء کے نام سے موسوم کیا۔ اس کے بعد سے یہ مشہور ہو گیا کہ صموئیل نے شریعت کو زندہ کر دیا ہے، چنانچہ بہت سے مقامات پر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کے نام کے ساتھ کتاب مقدس میں ان کا نام بھی لیا جانے لگا۔ پیغمبروں کی طرف سے بیت ایل واریحا، الجلجال اور دوسرے مقامات پر دیگر مدارس بھی قائم ہو گئے۔ پیغمبروں کے مدرسہ کے افسر اعلیٰ کو باپ یا سردار کہا جاتا تھا، ان مدرسوں میں تورات کی تشریح، موسیقی اور شعر کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء شاعر ہوتے تھے اور ان میں سے اکثر گانا بجانا جانتے تھے۔ ان مدرسوں کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ قوم کو تعلیم دینے کے لیے طلبہ تیار کیے جائیں۔ پیغمبروں اور پیغمبروں کے فرزندوں کی زندگی بہت سادہ ہوتی تھی ان میں سے اکثر راہب یا جہاں گشت ہوتے تھے جو پرہیز گاروں کے مہمان ہوا کرتے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان مدارس کے اکثر فارغ التحصیل حضرات کو پیشین گوئی کا اختیار نہیں مل سکا۔ یہ اختیار صرف ان لوگوں کو حاصل ہو سکا جنہیں خداوند تعالیٰ اپنی مرضی سے وقتاً فوقتاً اس کام کے لیے مقرر کرتا تھا اور ان اہم فرائض کو سرانجام دینے کے لیے ان کے لیے غیر معمول تربیت کے سامان فراہم کیا کرتا تھا لیکن بعض الہامی پیغمبروں کو خدا صرف اپنی وحی کے لیے مخصوص کرتا تھا کیونکہ اس سے پہلے نہ تو تعلیم حاصل کر چکے تھے نہ وہ ان مدرسوں میں داخل ہوئے تھے جیسا کہ عاموس نبی تھے وہ (نبوت سے پہلے) مویشی چراتے تھے اور اپنے دوستوں کے لیے گولر (پھل) چنا کرتے تھے۔

نبوت مختلف قسموں کی ہوا کرتی تھی، جیسے خواب، تبلیغ، اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ پیغمبر مستقبل کی باتیں (حال اور مستقبل) زمانوں کا فرق معلوم کیے بغیر معلوم کر لیتے تھے۔ چنانچہ ان کے مکاشفات میں قریبی زمانے کے واقعات دور کے زمانے کے واقعات

سے خلط ملط ہو جاتے تھے، جیسے اشوریوں کی غلامی سے یہودیوں کی رہائی کا واقعہ حضرت مسیح کے ذریعے دنیا کی نجات کی پیشین گوئی کے ساتھ مل گیا یا اسکندر ذوالقرنین کی فتح اور حضرت مسیح کی آمد کا واقعہ ایک ساتھ ہو گیا۔ یا جمعرات کے دن روح القدس کے بہنے کا واقعہ روز حشر کے واقعے کے ساتھ بیان کر دیا گیا۔ اسی طرح یروشلم کی بربادی کو حوادث قیامت کے ساتھ ملا دیا گیا۔

خدا نے الہامی پیغمبر اس لیے مبعوث کیے ہیں کہ وہ اس کی مشیت کا اعلان کریں اور مذہبی معاملات کی اصلاح کریں، خاص کر دنیا کی نجات کے لے حضرت مسیح کی آمد کی خبر دیں۔ وہ قوم کو تعلیم دیتے، انہیں بیدار کرنے اور صحیح رہنمائی کرنے میں زبردست طاقت کے مالک تھے۔ سیاسیات میں بھی ان کا بڑا دخل تھا۔

مسیحی تعریف نبوت پر اعتراضات:

الہام کی یہ تشریح کہ نبی کی روح میں خدا کی روح حلول کر جاتی ہے نصاری کی زبردستی کی تعریف ہے جس کا اعتراف نہ تو بنو اسرائیل کے پیغمبروں نے کیا ہے۔ نہ ان کے علماء نے، اس کا اثبات ان کے لیے ممکن نہیں ہے اور نہ وہ اسرائیلی پیغمبروں کی تحریروں میں جو تناقض اور تضاد واقعات کے خلاف پایا جاتا ہے، دور کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس کی طرف مؤلف نے بھی یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے، "اس تعلیم کی شرح مشکل ہے اور علماء نے اس میں اختلاف کیا ہے ظاہر ہے۔" جس میں خدا کی روح حلول کر جائے گی وہ خدا ہو جائے گا اور اسی حلول کی وجہ سے عیسائیوں کے نزدیک حضرت مسیح خدا تسلیم کیے گئے ہیں۔ ایسی صورت میں جب کہ خدا کی روح حلول کیے ہوئے ہو، وحی میں غلطی نہیں ہو سکتی اور نہ وہ خلاف واقع ہو سکتی ہے۔

نبوت اور انبیاء کے بارے میں مولف کے بیان سے حسب ذیل نتائج اخذ ہو سکتے ہیں۔

۱۔ بنو اسرائیل کے اکثر پیغمبر اپنے مخصوص مدارس سے تعلیم حاصل کر کے نکلتے تھے۔ یہاں وہ شریعت تورات کی تفسیر، موسیقی اور شعر کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ وہ شاعر مغنی اور ساز بجانے کے فن سے بھی واقف ہوتے تھے۔

اس طرح وہ ہر اس چیز کے ماہر ہوتے تھے جو طبیعت پر اثر کر سکے، احساسات اور جذبات کو ابھارے اور منجمد خیالات کو بھڑکائے، لہٰذا اس پر تعجب نہیں کرنا چاہئے کہ ان کے بڑے بڑے پیغمبر عزرا اور نحمیا بابل کے بادشاہ ارتخششتا کے ساقی اور مغنی تھے۔ ان دونوں نے اپنے نغموں کے ذریعے بادشاہ سے یہ اجازت حاصل کر لی تھی کہ وہ اپنی قوم کو لے کر اپنے وطن چلے جائیں اور وہاں از سر نو اپنا دین قائم کریں۔

ایسی صورت میں نبوت بھی ایک قسم کا ہنر تھا جس کی تعلیم مدارس میں دی جاتی تھی اور اسے موثر بنانے کے لیے شاعرانہ تخیلات، زبانی الہامات، نغموں اور موسیقی کے تاثرات اور سیکھی ہوئی معلومات سے مدد لی جاتی تھی۔ لہٰذا کہاں یہ نبوت اور کہاں محمد ﷺ کی نبوت جنہوں نے کوئی تعلیم حاصل نہیں کی اور نہ کوئی شعر کہا، لیکن اس کے باوجود وہ تن تنہا ایسی چیز لائے جو اس سے زیادہ عظیم الشان تھی جو یہ تمام پیغمبر مجموعی حیثیت سے لائے تھے۔

۲۔ اکثر ان پیغمبروں میں اور ان کی اولاد میں راہب تھے یا وہ لوگوں کے ہاں گشت کرتے اور مذہبی افراد کے عقید تمند پرہیز گاروں کی مہمان نوازی پر زندگی گذارتے تھے جیسا کہ مسلمانوں کے درویش اور صوفی حضرات کا طریقہ ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ یہ دیندار حضرات راہبوں کی ہر بات مانتے اور ان کے ہر دعوے کو تسلیم کر لیا کرتے تھے اور اس کی اشاعت کرتے۔ ان پیغمبروں میں اکثر ایسے ہیں جن کے گناہوں کی باتیں ان کی مقدس کتابوں میں بیان کی گئی ہیں برخلاف ان کے مسلمان صوفیوں، زاہدوں اور سیاحوں کے جو حالات معلوم ہوئے ہیں ان کی بنا پر ان کی سیرت ان پیغمبروں کی سیرت سے انہی کتابوں کی رو سے بدرجہا بہتر تھی۔ لہٰذا یہ خیال کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ ان پیغمبروں میں سے کوئی حضرت محمد ﷺ کے مرتبہ تک پہنچ سکتا ہے حالانکہ آپ ﷺ کی نشو و نما فطرت پر تھی اور آپ ﷺ نے اپنی روزی اپنے زور بازو سے حاصل کی، نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد کسی زمانے میں بھی آپ عوام پر بوجھ بن کر نہیں رہے۔

۳۔ ان پیغمبروں کی نبوت کی بنیاد عام طور پر خواب اور مبہم تخیلات پر مبنی تھی۔ یہ سب باتیں دوسرے لوگوں کو بھی پیش آتی ہیں۔ سچے خوابوں سے حضرت محمد ﷺ کی

نبوت کا آغاز تشریعی وحی سے پہلے ہوا مگر ان کا تصور بھی ان سے اعلیٰ تھا، جیسا کہ ہم بعد میں بیان کریں گے۔ خواب کی حقیقت یہ ہے کہ خیال میں محسوس صورتیں نظر آتی ہیں جن کی تعبیر میں بہت کم اختلاف ہوتا ہے۔ جن کی سچی تعبیر پیغمبروں کے سوا اور کوئی نہیں جانتا، جیسا کہ شاہ مصر کا خواب تھا جس کی تعبیر حضرت یوسف نے بیان کی تھی اور خود حضرت یوسف نے بھی اپنے بچپن میں خواب دیکھا تھا۔

۴۔ مستقبل کے بارے میں یہ پیغمبر پیشگوئیاں کرتے تھے جن کے ذریعے وہ خدا کی طرف سے اپنی نبوت پر استدلال لاتے تھے، مگر عام طور پر یہ پیشین گوئیاں زمانوں اور ان کے واقعات کا فرق کیے بغیر بیان کی جاتی تھیں وہ آپس میں ایسی خلط ملط ہوتی تھیں کہ ان کا مفہوم اسی وقت سمجھ میں آتا تھا جب کہ کوئی واقعہ واقع ہو کر واضح ہو جائے۔ ایسی باتیں ہر زمانے میں کاہنوں اور نجومیوں بلکہ روحانی مکاشفہ رکھنے والوں سے بھی سرزد ہو جاتی ہیں بعض اقات پیشین گوئیاں غلط بھی ثابت ہوتی ہیں جیسا کہ خود مولف نے اشارہ کیا مگر اس کی تشریح نہیں کی مگر تاریخ نے اس کی تفصیل بیان کر دی ہے۔

ان پیغمبروں کی سب سے بڑی پیشین گوئی مسیح (مسیا) کی آمد اور اسرائیلی سلطنت کے قیام کی خبر ہے جس کی سچائی کا ابھی تک یہودی انتظار کر رہے ہیں۔ اس کے بعد خود حضرت مسیح نے دنیا کی بربادی اور قیامت کی آمد کی خبر دی تھی، جس میں انہوں نے کہا تھا کہ ان کے مخاطب انسانوں کی نسل ختم نہیں ہونے پائے گی کہ یہ سب باتیں ظہور میں آجائیں گی، کئی نسلیں ختم ہو گئیں مگر وہ پیشین گوئی پوری نہیں ہوئی۔

محمدی پیشین گوئیوں کی امتیازی خصوصیات:

یہ اسرائیلی پیشین گوئیاں قرآن کریم کی بکثرت پیشن گوئیوں کا کیوں کر مقابلہ کر سکتی ہیں جیسا کہ ہم نے سورہ براۃ و توبہ کی تفسیر کے خلاصہ میں بیان کیا ہے، ان میں ایک پیشنگوئی منافقین کے بارے میں کی گئی، دوسری سورۃ الفتح میں بیان کی گئی جو آپ ﷺ ہی کے زمانے میں پوری ہو گئی، ان کے علاوہ سورہ روم کے شروع میں یہ پیشنگوئی ہے۔

الٓمٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوۡمُ ۝ فِیۡۤ اَدۡنَی الۡاَرۡضِ وَ هُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ غَلَبِهِمۡ سَیَغۡلِبُوۡنَ ۝ فِیۡ بِضۡعِ سِنِیۡنَ

قریب کی زمین میں رومی مغلوب ہو گئے ہیں مگر وہ چند ہی سال کے اندر عنقریب غالب آجائیں گے۔
یا دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ

تم میں سے جو ایمان لائے ہیں اور نیک کام کیے ہیں خدا کا ان سے وعدہ ہے کہ انہیں ضرور زمین پر خلیفہ بنا دیا جائے گا۔

کہاں اسرائیلی پیغمبروں کی پیشین گوئیاں اور کہاں رسول اکرم ﷺ کی اپنے صحابہ سے یہ پیشین گوئی کہ وہ میرے بعد عنقریب شام ویران اور مصر فتح کر لیں گے اور قیصر وکسریٰ کی سلطنتوں پر بھی قبضہ کر لیں گے۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ نے اپنے زمانے کے کسریٰ کا نام بھی بتا دیا تھا جیسا کہ بخاری نے عدی بن حاتم کی روایت سے بیان کیا ہے۔

نبوت کے اس ایک پہلو یعنی پیشین گوئیوں کے متعلق مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ محمد ﷺ کی پیشین گوئیاں خواہ وہ وحی قرآنی کے ذریعے ہوں یا دوسری طرح اسرائیلی پیشین گوئیوں سے زیادہ واضح اور تاویل وشک سے بہت دور ہیں۔ شک وشبہ کرنے والے اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ اس پر مزید طرہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے گذشتہ غیبی باتوں کی خبر بھی دی ہے۔ اس کے بارے میں منکرین نبوت جو تاویل کرتے ہیں میں آگے چل کر ان کے شک وشبہات کو باطل کروں گا۔

نبوت کا دوسرا پہلو زیادہ اہم اور عظیم الشان ہے، وہ مذہبی عقائد، عبادات اور آداب واخلاق ہیں۔ ان پر دو طریقوں سے غور وخوض کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ شخص جس نے یہ تعلیمات پیش کی ہیں، اس کی عقل وفکر، علم اور تعلیم کی رسائی ان چیزوں تک نہیں پہنچ سکتی تو اس صورت میں آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ ضرور وحی الٰہی ہے۔

۲۔ اگر یہ تعلیمات انسانوں کی ہدایت اور دین ودنیا میں بھلائی کے سلسلے میں اس زمانے کے لوگوں کے علمی اور تعلیمی معیار سے بہت بلند ہوں تو اس صورت میں بھی یہ ماننا پڑے گا کہ یہ وحی الٰہی ہے۔

پہلی بات رسول کریم کی ذات سے متعلق ہے۔ ہر ہوشمند آزاد خیال انسان جب حضرت محمد ﷺ اور بنو اسرائیل کے پیغمبروں کی تاریخ کا مطالعہ کرے گا تو اسے معلوم ہو

جائے گا کہ محمد ﷺ امی تھے، انہوں نے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا۔ آپ ﷺ کی قوم بھی جہاں آپ ﷺ کی پرورش ہوئی امی اور بت پرست تھی۔ وہ دوسری قوموں کے عقائد، تاریخ، قوانین، فلسفہ اور ادب سے بالکل ناواقف تھی یہاں تک کہ مکہ میں بھی جو عربوں کا گہوارہ، ان کے بڑے بڑے سرداروں کا ٹھکانہ، حج و تجارت کا مرکز فصاحت و بلاغت کے مقابلوں کا میدان تھا، کوئی مدرسہ اور تصنیف کی ہوئی کتاب نہ تھی۔ اس لیے آپ ﷺ جو دین کامل اور عالمگیر عادل شریعت لائے ناممکن ہے کہ وہ کسی انسان کے ذریعے حاصل کی گئی ہو، یا خود آپ ﷺ نے اپنی عقل و فکر سے اس کا استنباط کیا ہو جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اس معاملے میں جو شبہ کیا جاتا ہے اس کا ازالہ ہم فصل سوم میں کریں گے۔ اس کے مقابلہ میں حضرت موسیٰ کو ملاحظہ کیجئے جو اسرائیلی پیغمبروں میں اپنے علم و عمل شریعت وہدایت کے لحاظ سے سب سے بڑے تھے۔ انہوں نے ایک ایسی قوم کے سب سے بڑے بادشاہ کے محل میں پرورش پائی جو روئے زمین میں قوانین علم و حکمت اور صنعت و حرفت کے لحاظ سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوم تھی۔ وہ فرعون مصر کے گھر میں رہے، انہوں نے اس زبردست جابر بادشاہ کی حکومت میں اپنی قوم کو انتہائی ذلت اور غلامی کی حالت میں اس طرح دیکھا کہ ان کے لڑکے ذبح کیے جاتے تھے اور لڑکیوں کو زندہ رکھا جاتا تھا تاکہ پوری قوم کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر دیا جائے۔ اس کے بعد وہ کئی سال اپنے سُسر (حضرت شعیب) کے پاس مدین میں رہے وہ بھی پیغمبر تھے یا بقول اہل کتاب کاہن تھے۔ اسی وجہ سے منکرین وحی کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ اپنی قوم کے لیے جو شریعت لائے وہ ان جیسے عقل مند بلند ہمت انسان کے لیے کوئی بڑی چیز نہیں تھی۔ کیونکہ انہوں نے بادشاہت، قوانین اور علم و حکمت کے گھر میں پرورش پائی تھی۔

پھر اس بیسویں صدی کے آغاز میں یہ انکشاف ہوا کہ تورات کی شریعت اپنے اکثر احکام میں کلدان کے عرب بادشاہ حمورابی کے قانون کے مطابق ہے جو حضرت موسیٰ سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاصر تھا۔ وہ جرمن علماء جنہوں نے عراق کی کھدائی میں ان قوانین کا سراغ لگایا ہے یہ کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کی شریعت ان قوانین سے ماخوذ

ہے اس لیے وحی الٰہی نہیں ہے۔[1] اس صورت میں ایک آزاد خیال کم از کم یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر تورات قانون حمورابی سے ماخوذ نہیں ہے تو وہ وحی الٰہی بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ حمورابی نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس کے قوانین خدا کی طرف سے نازل ہوئے ہیں۔

پھر اہل نظر یہ بھی ملاحظہ کرے گا کہ عہد قدیم کے تمام پیغمبر تورات کے پیرو تھے اور وہ دوسرے علوم کے ساتھ تورات کی تفسیر و تشریح کے درس میں اپنے مخصوص مدارس میں اپنے فرزندوں کے ساتھ مشغول رہتے تھے۔ ایسی صورت میں کسی ایک کا حضرت محمد ﷺ کے ساتھ موازنہ و مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ یوحنا المعمدان بھی جسے حضرت مسیح نے تمام پیغمبروں پر فضیلت دی ہے، نہ کوئی نئی شریعت لایا اور نہ اس نے غیبی پیشین گوئی کی۔ بلکہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو ان پیغمبروں میں سب سے بلند مرتبہ، سب سے زیادہ مشہور اور سب سے زیادہ نمایاں پیغمبر تھے نئی شریعت نہیں لائے تھے بلکہ تورات کی شریعت کی چند احکام کی معولی تنسیخ کے ساتھ پیروی کرتے رہے۔ صرف ظاہری الفاظ کے ساتھ انہوں نے یہودیوں کے وادی جمود کی روحانی اور اخلاقی اصلاح کی۔ اس وجہ سے وحی الٰہی کے منکروں کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ حضرت مسیح جیسے سچی فطرت رکھنے والے ذہین انسان کے لیے یہ مشکل نہیں ہے کہ وہ اسی قسم کے اخلاقی وعظ سنائیں[2] جب کہ انہوں نے یہودی شریعت، رومی تمدن، یونانی علم و حکمت کی آغوش میں اور زہد اور روحانیت کے ماحول میں پرورش پائی تھی۔ ہم مسلمان ان خیالات کے معتقد نہیں ہیں بلکہ یہ خیال ان مادہ پرست، ملحد اور عقل پرست انسانوں کا ہے جن میں سے ہزاروں انسان اپنے آپ کو عیسائی مذہب کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

نبوت کا دوسرا حصہ مذہبی عقائد، عبادات آداب واخلاق اور احکام خداوندی ہیں۔ ان کے بارے میں بھی ان آزاد خیال انسانوں کی عقلیں جو کسی خاص مذہب کی اندھادھند مقلد نہیں ہیں۔ بلا شک وشبہ یہ تسلیم کریں گے کہ یہ تعلیمات اسلامی تورات وانجیل اور عہد

---

[1] ہم نے اس مسئلہ کی تشریح المنار کی چھٹی جلد میں اور اس کا خلاصہ سورۂ توبہ کی آیت (۹ : ۳) میں بیان کیا ہے۔ لہٰذا رسالہ المنار ۱۳۲۱ھ ملاحظہ ہو یا تفسیر المنار کی دسویں جلد کا صفحہ ۳۴۸ ملاحظہ کیا جائے۔

[2] اس کے باوجود ان میں سے بعض لوگ ان مواعظ کو مشہور چینی مقنن اور فلسفی کونفیوشس اور دوسرے علماء کی طرف منسوب کرتے ہیں جو مسیح علیہ السلام سے پہلے گذرے تھے۔

قدیم وجدید کی تمام کتابوں کی تعلیمات سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ اسلامی تعلیمات کے بنیادی اصول یہ ہیں کہ خدا ایک ہے اور وہ ہر خامی اور برائی سے پاک ہے، اس کا ہر کمال اس کے وجود اور قدرت کو ثابت کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عقلی، علمی اور کائنات کی چیزوں سے اس کے وجود کو ثابت کیا گیا ہے۔ اس کے رسولوں کی ہدایت کا طریقہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کی عبادت اور آداب وخلاق، نفس کو پاکیزہ اور عقل کو ترقی دیتے ہیں۔ اس کے شرعی قوانین منصفانہ اور اس کی حکومت کی بنیاد باہمی صلاح ومشورہ پر ہے جن سے انسان کا سماجی نظام ترقی پذیر ہوتا ہے بلکہ یہی وہ اصلاح کا طریقہ ہے جس کی بدولت خدائی مذہب کمال کے اعلیٰ مرتبہ تک پہنچ گیا ہے۔ چنانچہ خود مغربی علماء بھی اس کی شہادت دیتے ہیں۔ ان کے ان خیالات کی تشریح ہم رسالہ المنار اور تفسیر المنار میں کئی مقامات پر کر چکے ہیں اور مزید تشریح بھی عنقریب کی جائے گی۔

جو کوئی حضرت آدم علیہ السلام، نوح علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام، لوط علیہ السلام اسحاق علیہ السلام، یعقوب علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام کے قصے تورات کی کتاب پیدائش میں اور حضرت موسیٰؑ، داؤد علیہ السلام، سلیمان علیہ السلام وغیرھم انبیاء علیہم السلام کی سیرت کا مطالعہ عہد قدیم کی دوسری کتابوں میں کرے گا پھر یہی قصے قرآن کریم میں پڑھے گا تو وہ ان جلیل القدر انبیاء کی سیرت سے راہ ہدایت حاصل کرنے میں کافی فرق محسوس کرے گا۔ عہد قدیم کی کتابوں میں اسے نظر آئے گا کہ خداوند تعالیٰ انسانوں کے بارے میں جاہل تھا، انہیں پیدا کر کے اسے بہت ندامت ہوئی اور اب وہ ان سے انتقام لینے کی فکر میں ہے۔ حالانکہ یہ باتیں خدائی شان سے بعید ہیں۔ نیز ان کتابوں میں انبیاء کی شان کے خلاف ان کی طرف ایسے ایسے گناہ منسوب کیے گئے ہیں جو ان کی امت کے لیے برا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

مگر قرآن کریم میں اللہ کی حکمت، رحمت، انصاف، مہربانی اور قوانین فطرت کا ثبوت ملتا ہے۔ اس میں انبیاء کرام اور رسولوں کے کمالات اور اچھے کارناموں کا ذکر ہے تاکہ ان کے اسوہ حسنہ کے اتباع سے پڑھنے والے کا ایمان تازہ ہو جائے۔ عہد قدیم وجدید میں پیغمبروں کے حالات ایک ایسے جنگل کے مشابہ ہیں جس میں درخت، گھاس کانٹے، پھل پھول اور حشرات الارض موجود ہوں۔ مگر قرآن کریم میں ان کے تذکرہ کو ایک ایسے عطر

کے ساتھ تشبیہ دی جاسکتی ہے جو پھولوں سے نکالا گیا ہو یا وہ ایسے شہد کی مانند ہیں جو چیدہ چیدہ پھلوں سے تیار کیا گیا ہو۔ اس میں ایسے چمن بھی نظر آئیں گے جن میں کائنات کا ہر حسن وجمال سمٹ کر آگیا ہو۔

اس موقع پر ہم ان کتابوں کا ذکر نہیں کریں گے جو آزاد خیال مغربی علماء نے ان کتابوں کی تنقید و تنقیص میں لکھی ہیں ان میں سب سے زیادہ مختصر اور عجیب وغریب ایک کتاب ہے جس کا نام "تورات وانجیل کی خرابیاں" ہے جو ایک عالم کی تصنیف ہے۔[1] ان کتابوں میں ان کتابوں کی علم، عقل اور تاریخ کے خلاف باتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ مگر قرآن کریم ان نقائص سے خالی ہے۔

کلیسا کی اسلام دشمنی:

کلیسا کے لوگوں نے جب دیکھا کہ اسلام نے بت پرستی اور مجوسیت کا خاتمہ کر دیا ہے اور قریب تھا کہ مشرق میں عیسائیت کا خاتمہ بھی ہو جائے اور اس کا نور مغرب میں بھی پھیل جائے تو انہوں نے اپنے پیروؤں کو اسلام سے دور رکھنے کے لیے اسلام سے اس کے نبی اور اس کی کتاب کے خلاف جھوٹے الزامات تراشے۔ اور فحش قسم کے سب وشتم سے بھری ہوئی کتابیں، اشعار اور گیت لکھنے شروع کیے۔ اس طرح انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ نام نہاد پرہیزگار سب سے زیادہ جھوٹے بلکہ نیکی اور صداقت کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ یہ سب کچھ انہوں نے اپنے اقتدار کو بچانے کے لیے کیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام ان سے بالکل بری ہیں۔ ان کے پیرو جو کچھ وہ کہتے ہیں اور لکھتے تھے انہیں صحیح سمجھتے رہے اور ان کی نظموں اور اشعار کو سن کر جوش میں آجاتے تھے یہاں تک کہ جب کچھ لوگوں کو اسلامی کتابوں کو پڑھنے اور مسلمانوں سے ملنے جلنے کا موقع ملا تو انہوں نے اہل کلیسا کی اچھی طرح خبر لی جیسا کہ تم "اسلام خواطر وسوانح" میں ملاحظہ کرو گے جو کاونٹ دی کاستری کی لکھی ہوئی ہے۔ اس طرح موسیو ورمنگھم کی کتاب "حیات محمد" فرنچ میں ہے۔ یہ دونوں مصنف روس کیتھولک فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کی طرح انہوں نے کھلم

---

[1] اس کا نام چارلس وٹیس ہے۔ کتاب وٹیس اینڈ کمپنی کے مطبع لندن میں چھپی۔ عربی میں بھی اس کا ترجمہ ہوا۔ جو مطبعۃ الموسوعات مصر میں ۱۳۱۹ھ مطابق ۱۹۰۱ء میں چھپا۔

کھلا لکھا ہے کہ ان کے کلیسا ہی نے اسلام پر ظلم، جھوٹ اور بہتان کا طومار باندھنے میں ابتداء کی ہے اور مسلمان جواب دینے میں ادب و تہذیب کی دائرہ میں رہے ہیں۔ [1]

آخر کار پروٹسنٹ فرقہ نمودار ہوا اور اس کا مذہب اینگلو سیکشن اور جرمن قوم میں پھیل گیا۔ اس کی مقبولیت کی وجہ یہ تھی کہ ان کی اصلاحی تحریک پر نور اسلام کا عکس پڑا تھا۔ بہرحال اس مذہب کے پادریوں اور مشنریوں نے بھی دروغ گوئی اور الزام تراشی میں کمی نہیں کی اور اسلام کے معاملے میں کسی قسم کا ادب و احترام روا نہیں رکھا بلکہ دور حاضر میں یہی فرقہ دوسرے فرقوں سے بہت زیادہ گستاخانہ طعن و تشنیع میں مصروف رہا مگر ان کے آزاد خیال علماء کی ایک جماعت رومن کیتھولک فرقہ سے زیادہ تعداد میں ایسی بھی ہے جنہوں نے صاف اور واضح الفاظ میں اسلام کے ساتھ انصاف کیا ہے اور اس سے ہدایتیاب بھی ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی تربیت میں آزادی اور مستقل مزاجی بہت مستحکم

---

[1] موسیو در منگھم اپنی کتاب "حیات محمد" میں رقمطراز ہیں (ان کے عربی ترجمہ از ڈاکٹر محمد ھیکل کے ذریعہ یہ ترجمہ منقول ہے۔) "جب اسلام اور عیسائیت میں جنگ شروع ہوئی تو قدرتی طور پر مخالفتوں اور غلط فہمیوں کی خلیج وسیع ہوتی گئی اور یہ معاملہ بڑھتا گیا۔ انسان کو اس بات کا اعتراف کرلینا چاہئے کہ مغربی لوگ ہی مخالفت میں آگے بڑھے تھے۔ جان دامان کے علاوہ بازنطینی (رومی) مناظرہ بازوں نے اسلام کے مطالعہ کی زحمت اٹھائے بغیر اسے حقارت کا نشانہ بنالیا۔ ان کے مصنفوں نے اور شعراء نے مسلمانان اندلس کے ساتھ بدترین گالیوں کے ساتھ جنگ کی۔ انہوں نے فرض کرلیا کہ حضرت محمد ﷺ (نعوذ باللہ) اونٹنیوں کے چور تھے۔ عیش و عشرت کے دلدادہ اور جادوگر تھے۔ وہ آپ کو ڈاکوؤں کی ٹولی کا سردار بھی سمجھتے تھے بلکہ یہ بھی فرض کیا گیا تھا کہ آپ ﷺ ایک رومی پادری تھے جو اس لئے ناراض ہوگئے تھے کہ انہیں پاپائیت کی کرسی کے لئے نہیں منتخب کیا گیا تھا۔ بعض کے خیال میں آپ ﷺ جھوٹے خدا تھے۔ جس پر انسانوں کو بھینٹ چڑھایا جاتا تھا۔ گیبرڈ نوجن جیسا سنجیدہ اہل قلم بھی یہ ذکر کرتا ہے کہ محمد (ﷺ) (نعوذ باللہ) کی وفات نشے کی حالت میں ہوئی اور ان کی نعش کوڑے میں پائی گئی۔ جسے جابجا سوروں نے کھالیا تھا۔ اس نے یہ اس لئے لکھا تھا تاکہ اسلام میں شراب اور اس جانور کے حرام ہونے کا سبب بتاسکے۔ گیتوں میں تو یہاں تک لکھا گیا ہے کہ محمد ﷺ کا طلائی میت بنادیا گیا اور اسلامی مساجد کو بت خانہ قرار دیا گیا جو بتوں اور تصویروں سے لبریز رہتی ہے۔ انطاکی گیتوں کے مؤلف نے اس آدمی کی گفتگو نقل کی ہے جس نے ماھوم (محمد) کا بت خالص سونے اور چاندی کا ڈھلا ہوا دیکھا تھا اور جڑاؤ ہاتھی پر سوار تھا۔ رولاں کے گیتوں میں دکھایا گیا ہے کہ بادشاہ شارلمان کے شہسوار اسلامی بتوں کو توڑ رہے ہیں۔ اس شخص نے دعویٰ کیا ہے کہ مسلمانان اندلس ایک تالوث کی عبادت کرتے تھے جو ترفاجان ماھوم (محمد) اور ابولون سے مرکب تھا۔ قصہ محمد کا مولف کہتا ہے کہ اسلام عورت کو متعدد شوہر (بیک وقت) کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ الغرض اسی طرح بغض و کینہ اور خرافات کا دور دورہ رہا۔ روڈلف داد ہم کے زمانے سے لے کر آج تک نیکولاڈ کینز، فیفس، مراتشی، ہوگنگر بیلیا، تلارا، بربد وغیرہ بہت سے لوگ ہوئے، سب نے یہی کہا کہ محمد دجال تھے اور اسلام شیطانی کام ہے۔ مسلمان وحشی ہیں اور قرآن خرافات کا مجموعہ ہے۔ ان کی مراد یہ ہے کہ اس کے ترجمہ میں ابہام ہے۔ مزید ملاحظہ ہو ترجمہ کتاب الاحلام خواطر و سوانح عربی ترجمہ لناحمد فستی اغلول نقل کفر کفر نباشد۔ (مترجم)

تھی۔ عنقریب یہی لوگ یورپ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور تمام دنیا میں اسلام کی اشاعت کریں گے۔ جیسا کہ مسٹر برنارڈ شا نے اپنی کتاب "حیات زوجیت" میں یقین کے ساتھ کہا ہے اور اسلامی ممالک کے اخبارات نے اس کے یہ خیالات نقل کیے ہیں۔

معجزات سے نبوت کا اثبات:

رہ گیا معجزات کا معاملہ جن پر اختلاف عقائد کے باوجود مسیحی کلیساؤں کی بنیاد قائم ہے۔ اس بارے میں یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ محمد ﷺ کا لباس معجزات سے بالکل خالی تھا حالانکہ دور حاضر میں ہی معجزات ان کے مذہب کی حمایت کے لیے نہیں بلکہ اس کے برخلاف ثبوت بن گئے ہیں۔ علماء اور دانشوروں کو یہ چیز قائل نہیں کرتی بلکہ دین سے روکتی ہے۔ اگر قرآن کریم میں بھی ان معجزات کا ذکر نہ ہوتا جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی مدد فرمائی تھی تو آزاد خیال مغربی افراد میں وہ زیادہ مقبول ہوتا اور ان میں اس کی ہدایت سرعت کے ساتھ عالمگیر ہوتی کیونکہ قرآن کریم کی بنیاد عقل وعلم پر ہے، یہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہے اس سے افراد کا تزکیہ نفوس اور سماج کی بھلائی اور ترقی ہوتی ہے، لہٰذا قرآن کریم خود معجزہ ہے جو خدائی وحی ہونے کا خود ثبوت ہے کیونکہ حضرت محمد ﷺ امی تھے۔ اس طرح یہ علمی معجزہ ہے جسے عقل، حواس اور ضمیر کے ذریعے معلوم کیا جا سکتا ہے کفاك بالعلم فی الامی معجزۃ۔ فی الجاھلیۃ والتاریب فی الیتم (دور جاہلیت میں امی رہ کر علم حاصل کرنا اور یتیمی کی حالت میں آداب واخلاق سیکھنا ہی آپ کے لیے بڑا معجزہ ہے)۔

رہ گئے دنیاوی معجزے تو ان کی روایت صحت اور تشریح میں بہت سے شبہات اور تاویلات ہیں پھر اس طرح کی چیزیں ہر زمانے میں بہت سے لوگوں کے ہاتھوں ظاہر ہوتی ہیں۔ ہندو اور مسلمان صوفیہ کے بارے میں ایسی چیزیں اس سے کہیں زیادہ منقول ہیں جتنی کتب عہد قدیم وجدید میں اور عیسائی ولیوں کے بارے میں بیان کی جاتی ہیں مگر ان چیزوں سے اہل علم کو دین سے زیادہ نفرت پیدا ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں عنقریب ہم اسلام کا قول فیصل بیان کریں گے۔

حضرت مسیحؑ کے معجزات:

عجائبات اور ان کی قسموں کے بارے میں کتاب مقدس (بائبل) کی مذکورہ بالا لغت میں تحریر ہے۔

"عجیب واقعہ ایک ایسا واقعہ ہے جو خلاف عادت خدائی طاقت کے ساتھ رونما ہوتا ہے تاکہ اس کی نبوت کو ثابت کیا جائے، جس کے ہاتھ سے یہ عجیب واقعہ نمودار ہوا ہو۔ حقیقی معجزہ فطرت سے بالاتر ہوتا ہے اس کا مخالف نہیں ہوتا ہے۔ اس کا ظہور فطری قوانین کو موقوف کر دینے سے ہوتا ہے اس کے توڑ دینے سے نہیں بلکہ اس کے ذریعے فطرت کے اعلیٰ نظام کو ظاہر کیا جاتا ہے جس کے ماتحت اس کا طبعی نظام ہوتا ہے۔ اگر ہم اپنے ارادہ پر غور کریں تو ان عجیب و غریب واقعات یا معجزات کی حقیقت سمجھ میں آجائے گی۔ ہم اپنے ارادہ سے ہاتھ اٹھاتے ہیں اور اس طرح قانون کشش ثقل کو روک دیتے ہیں (جس کا تقاضہ یہ تھا کہ تمام اجسام زمین کے مرکز کی طرف گریں) خدا فطری طاقتوں پر غالب آکر رہنمائی میں انہیں اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق چلاتا ہے کیونکہ وہ اس کی مرضی کی تابع ہیں۔ ایسے عجائبات اللہ ہی کی طرف سے رونما ہوتے ہیں یا وہ لوگ اسے ظاہر کرتے ہیں جنہیں اس کی اجازت ہوتی ہے۔

اگر ہم اس بات پر ایمان لائیں کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے تو ہمارے لیے عجائبات کے امکان کو تسلیم کرنا مشکل نہ ہوگا۔ سب سے پہلا عجیب واقعہ جو رونما ہوا، وہ ارادہ الٰہی سے اس دنیا کا عدم سے وجود میں آنا ہے۔ حضرت مسیح کا اقنوم (شخصیت) ایک زبردست اخلاقی معجزہ ہے۔ آپ کے تمام عجائب اسی اقنوم (اصلیت) اور اس کے کارناموں کے اظہار کے لیے تھے۔ اگر ہم خدا کے معصوم بیٹے مسیح پر ایمان رکھتے ہیں تو تمہارے لیے اس کے معجزات کی تصدیق کچھ مشکل نہیں ہے مگر شیطان کے تمام عجائبات جھوٹے ہیں۔ عجائب و معجزات دین کی تائید کے لیے ضروری ہیں۔ حضرت مسیح نے بارہا اپنے معجزوں کی بدولت اپنے لاہوت اور مسیح ہونے کو ثابت کیا ہے۔ وہ اس کا اظہار اس لیے کرتے تھے کہ اللہ کی شان و شوکت قائم ہو اور لوگوں کی روح و جسم کو فائدہ پہنچے۔ وہ اپنے معجزے دوستوں اور دشمنوں کے تمام مجلسوں میں پیش کرتے تھے۔ دشمن بھی ان معجزوں سے انکار نہیں کر سکے، سوائے اس کے کہ انہوں نے ان معجزات کو لبلزبول کی طرف منسوب

کر دیا۔ یعنی یہ شیطان کے معجزے ہیں کیونکہ انجیلیں شیطان کے معجزے بھی ثابت کرتی ہیں بلکہ وہ اس کے عجائب و تصرفات کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ان کے نزدیک شیطان کے کئی ناموں میں سے ایک نام "اس زمانے کا خدا" بھی ہے۔ کتاب مقدس کی ڈکشنری میں ہے "ہم نے اس کی شخصیت کے بارے میں بھی وہی دلائل بیان کیے ہیں جو روح القدس اور فرشتوں کے بارے میں بیان ہوئے (ملاحظہ ہو صفحہ ۶۵ جلد اول اور اس مذہب کے لوگوں پر تعجب کرو۔"

ہم خواہ بیرونی شہادت سے انہیں آزمائیں یا خدا کی طرف سے پیغمبری کی حیثیت سے ان پر غور کریں۔ ہر صورت میں ایک غیر متعصب کے نزدیک یہ معجزات صحیح ہوں گے۔ اگر ہم انہیں صحیح نہ مانیں تو ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ انہیں پیش کرنے والے جھوٹے تھے حالانکہ حضرت مسیح اور ان کے حواریوں کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

حواریوں کے زمانے تک معجزات و عجائبات کے اختیارات باقی رہے مگر جب عیسائی مذہب پھیل گیا تو اس چیز کی ضرورت باقی نہیں رہی (یہ پروٹسنٹ فرقہ کا عقیدہ ہے رومن کیتھولک فرقہ ہر زمانہ میں عجائبات کے وجود کو مانتا آیا ہے)

اس زمانے میں ہمیں صرف ایسے اخلاقی معجزوں کی ضرورت ہے جنہیں اندرونی شہادتیں صحیح ثابت کر سکیں۔ تاہم خدا کے لیے یہ ممکن ہے کہ جب وہ چاہے از سر نو معجزات کا اظہار شروع کر دے۔

اس کے بعد مؤلف نے ایک نقشہ پیش کیا ہے جس میں عہد قدیم کے معجزات صدوم اور عمورہ میں قوم لوط کی بربادی کے وقت سے یوناہ (یونس) کے مچھلی کے پیٹ میں چلے جانے تک کے واقعات کو ظاہر کیا ہے۔ یہ معجزات ۶۷ ہوتے ہیں، اس کے بعد حضرت مسیح کے حمل کے زمانے سے لے کر جو روح القدس کے فعل سے ہوا، آسمان پر جانے تک، معجزات بیان کیے گئے ہیں اور وہ ۳۷ ہیں۔ پھر تیسرا نقشہ پیش کیا ہے جس میں حضرت مسیح کے حواریوں کے معجزے ہیں جنہوں نے عیسائیت کی تحریک کی اشاعت کی تھی جس میں جمعرات کے دن روح القدس کے جانے سے لے کر بوبلیوس کے باپ کی شفا تک معجزات شامل تھے (یہ شخص ایک جزیرہ کا حاکم تھا اور بیمار تھا۔ پولس کی دعا اور نماز کی برکت سے وہ تندرست ہو گیا (اعمال ۲۸) یہ کل بیس معجزات تھے۔ بپتسمہ دینے

والے یوحنا کے بارے میں یہ تصریح ہے کہ کتاب مقدس میں یہ نہیں لکھا کہ انہوں نے معجزات پیش کیے۔

مسیحی معجزات پر بحث:

میں کہتا ہوں کہ حضرت مسیح کے جو ستائیس معجزات بیان کیے گئے ہیں ان میں زیادہ تر بیماروں اور آسیب زدہ دیوانوں کو تندرست کیا گیا ہے، تین معجزوں میں مردوں کو زندہ کیا گیا ہے، باقی معجزات یہ ہیں: خود حضرت مسیح حمل میں آئے آپ نے پانی کو شراب بنادیا۔ بحر جلیل میں جال ڈالا۔ ایک مرتبہ پانچ ہزار اور دوسری مرتبہ چار ہزار آدمیوں کو پیٹ بھر کر کھانا کھلایا۔ بانجھ انجیر کے درخت کو خشک کر دیا۔ خود زندہ ہوگئے۔ مچھلی کا شکار کیا۔ آسمان پر چڑھ گئے۔

اس سلسلے میں ہم انجیلوں کی اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے ان روایات کا خلاصہ پیش کرتے ہیں جس میں مردوں کو زندہ کیا گیا تھا اور اس بارے میں منکرین معجزات کے اقوال نقل کرتے ہیں۔

پہلا مردہ شہر نائین کا نوجوان تھا۔ اس کا جنازہ اٹھ چکا تھا اور اس کی والدہ رو رہی تھی، جناب مسیح نے جنازہ روک کر کہا "اے جوان اٹھ میں تجھ سے کہتا ہوں اٹھ"۔ وہ اٹھ بیٹھا اور بولنے لگا۔ آپ نے اسے اس کی والدہ کے حوالہ کر دیا۔ سب پر دہشت طاری ہوئی اور وہ خدا کی بڑائی بیان کر کے کہنے لگے "ایک بڑا پیغمبر ہم میں آیا ہے اور اس کے ذریعے خدا نے اپنی امت کی خبر لی ہے۔" (لوقا: ۱۱۔۱۶)

دوسری میت ایک لڑکی کی تھی، اس کے باپ نے جو سردار تھا حضرت مسیح سے کہا "میری بیٹی ابھی مری ہے۔ تم آؤ اور اپنا ہاتھ اس پر رکھو وہ زندہ ہو جائے گی۔" جناب مسیح سردار کے گھر آئے وہاں بانسری بجانے والوں اور ایک مجمع کو چلاتے ہوئے دیکھا۔ آپ نے فرمایا "ہٹ جاؤ لڑکی مردہ نہیں ہے وہ تو سوئی ہوئی ہے۔" اس پر وہ ہنسنے لگے۔ جب بھیڑ نکال دی گئی تو آپ نے اندر جا کر اس کا ہاتھ پکڑا۔ اسی وقت لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی۔ (متی۹: ۱۸۔۲۴)

عجائب کے منکرین کہتے ہیں کہ یہ نوجوان مرد اور عورت دراصل مرے نہیں تھے ہر

زمانہ میں ایسے واقعات ہوئے ہیں کہ لوگ اپنے تابوتوں بلکہ قبروں تک سے نکل آئے ہیں، حالانکہ لوگ انہیں مردہ سمجھ چکے تھے۔ یہی سبب ہے کہ مہذب حکومتیں میت کو اس وقت تک دفن کرنے کی اجازت نہیں دیتی ہیں جب تک کہ کوئی مستند ڈاکٹر علمی اور فنی حیثیت سے اس کی موت کا سرٹیفکیٹ نہیں لکھ کر دیتا۔ معجزوں پر ایمان رکھنے والوں کو تو اور بھی زیادہ یقین کرنا چاہیے کہ لڑکی مری نہیں تھی کیونکہ خود حضرت مسیح نے بظاہر یہ کہا تھا کہ لڑکی مری نہیں ہے بلکہ سوئی ہوئی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بے ہوش ہو گئی تھی لوگوں نے یہ خیال کیا کہ وہ مر گئی ہے حالانکہ دراصل وہ مردہ نہیں تھی۔

تیسرا واقعہ آپ کے منظور نظر لیعازر کا ہے جو آپ کی دو منظور نظر بہنوں مرتھا اور مریم کا بھائی تھا۔ وہ اپنے گاؤں بیت عنا میں بیمار ہوا۔ اس کی دونوں بہنوں نے حضرت مسیح کو یہ پیغام بھیجا "اے خداوند! جس سے تو محبت کرتا ہے وہ بیمار ہے"۔ آپ دو دن کے بعد وہاں گئے تو معلوم ہوا کہ چار دن پہلے وہ مر چکا تھا۔ مرتھا نے حضرت مسیح سے کہا "اے خداوند! اگر آپ یہاں ہوتے تو میرا بھائی نہ مرتا"۔ پھر اس نے اپنی بہن مریم کو بلایا۔ مریم آپ کو دیکھ کر آپ کے قدموں پر گر گئی اور مرتھا نے جو کہا تھا وہی اس نے بھی کہا۔ سب لوگ قبر پر میت کو رونے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ جب آپ نے مریم اور اس کے ساتھ آنے والوں یہودیوں کو روتے دیکھا تو آپ بھی روحانی طور پر پریشان اور بے چین ہوئے اور فرمانے لگے "تم نے اسے کہاں رکھا ہے" لوگوں نے قبر کا پتہ دیا۔ آپ بھی روئے اور رنجیدہ ہو کر قبر کے پاس آئے۔ وہ ایک غار میں تھی۔ اس پر ایک پتھر رکھا ہوا تھا آپ نے پتھر اٹھانے کا حکم دیا اور وہ ہٹا دیا گیا۔ پھر یسوع نے آنکھیں اٹھا کر کہا "اے باپ! میں تیرا شکر گزار ہوں کیونکہ تو نے میری سن لی، مجھے معلوم ہے کہ تو ہمیشہ میری بات سنتا ہے مگر ان لوگوں کی وجہ سے جو آس پاس کھڑے ہیں، میں نے یہ کہا تھا کہ وہ ایمان لائیں کہ تجھی نے مجھے بھیجا ہے۔"

یہ کہہ کر آپ اونچی آواز میں پکارنے لگے "لیعازر! نکل آؤ۔ مردہ ایسی حالت میں نکل آیا کہ اس کے دونوں پاؤں کفن سے بندھے ہوئے تھے اور اس کا چہرہ رومال سے لپٹا ہوا تھا۔ یسوع نے ان سے کہا "اسے کھولو اور جانے دو"۔ (یوحنا انجیل باب ۱۱ کا خلاصہ)

اس روایت کو اگر صحیح بھی مانا جائے تو آپ کو معلوم ہے معجزات دنیا ب کے

منکرین اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ میں نے ایک پروٹیسٹنٹ شامی ڈاکٹر کو یہ کہتے سنا کہ یہ دراصل ایک سازش تھی جس میں حضرت مسیح ان کا محبوب اور دونوں محبوبہ شریک تھیں تاکہ یہودیوں کو اپنی نبوت کا قائل کرائیں۔ حاشاد کلا حضرت مسیح پر یہ شبہ نہیں کیا جاسکتا مگر ہم نے اسے اس لیے نقل کیا ہے تاکہ ہم بتائیں کہ موجودہ زمانہ میں اس قسم کی روایات سے حضرت مسیح کی نبوت بھی ثابت نہیں کی جاسکتی چہ جائیکہ ان کی الوہت کو ثابت کیا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ روایتیں صرف نبوت کو ثابت کرتی ہیں الوہیت کو ثابت نہیں کرتی ہیں جیسا کہ انہوں نے بھی یہی سمجھا تھا جو ان کے چشم دید گواہ تھے۔ پھر ان روایات کے مؤلفین کے پاس نہ کوئی سلسلہ اسناد ہے اور نہ کوئی ایسا ثبوت ملتا ہے کہ راوی بے خطا اور معصوم ہیں اور انہوں نے روایت میں کوئی غلطی نہیں کی۔ بہر حال منکرین معجزات یہ کہتے ہیں کہ ان روایات میں مکر وفریب یا اتفاقات کا احتمال ہے اور اگر ان روایات کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو ایسے خلاف معمول واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔

اگر سب سے بڑے معجزہ یعنی مردہ زندہ کر دینے کے سلسلے میں اسی قسم کی تاویلات کی جاسکتی ہیں تو بیماروں کو تندرست کرنے اور آسیب اتارنے کے بارے میں کیا کچھ نہیں کیا جاسکتا جب کہ ایسے واقعات ہر زمانہ میں بکثرت ہوا کرتے ہیں۔ تمام اطباء کا یہ قول ہے کہ جن بیماریوں کو لوگ آسیب سمجھتے ہیں وہ در حقیقت اعصابی امراض ہیں جو معالجہ یا وہم واعتقاد کے ذریعے اچھی ہو جاتی ہیں۔ شراب، مچھلی اور انجیر کے خشک ہونے کے معجزات تو اس سے کم تر ہیں۔

علمی اور عقلی معجزات محمدیہ:

محدثین نے کبھی متصل اسانید سے اور کبھی مرسل طریقہ سے ایسے دنیاوی معجزات بیان کیے ہیں جن سے خداوند تعالیٰ نے اپنے رسول محمد ﷺ کو سرفراز فرمایا تھا۔ یہ معجزات عیسائیوں کے بیان کردہ معجزات سے مقدار میں زیادہ اور شک وشبہ سے پاک ہیں مگر ان معجزات کو دین اسلام کے صحیح ہونے کا ثبوت نہیں قرار دیا اور نہ ان کی روایت اور تلقین کا حکم دیا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ خداوند تعالیٰ حضرت محمد ﷺ کی نبوت ورسالت

کو علم و عقل کی بنیادوں پر قائم کیا ہے اور اسی طرح اسے تسلیم کرایا ہے کیونکہ اس زمانے میں عالم انسانیت سن شعور کو پہنچ گئی تھی اور اس کے اندر وہ آزادی فکر آ گئی تھی جس کی وجہ سے عقل انسانی ایسے لوگوں کی تابع نہیں رہی تھی جو فطری قوانین کے بر خلاف عجیب واقعات پیش کیا کرتے تھے کیونکہ اس قسم کے واقعات سے ارتقائے انسانی اور ان کی عقلی استعداد کی تکمیل نہیں ہوئی بلکہ یہ چیزیں اس راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ اس لیے رسول اکرم خاتم النبیین کی نبوت کا اصل ثبوت اس کو قرار دیا گیا جو آپ کی نبوت کا اصل موضوع ہے۔ وہ آپ کی کتاب قرآن کریم ہے جو اپنی ہدایت، علوم، لفظی و معنوی اعجاز، ماضی، حال اور مستقبل کی غیبی چیزوں کی بدولت تمام انسانوں کے لیے معجزہ بنا ہوا ہے جیسا کہ ہم سورہ بقرہ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں۔ یہ اس لیے کیا گیا ہے کہ انسان اس آزادی کے ماحول میں تربیت پا کر ان کمالات تک پہنچ جائے جن کی قابلیت اس میں پائی جاتی ہے۔

یہی وہ امتیازی خصوصیت ہے جو گذشتہ خاص نبوتوں اور ہماری عالمگیر دائمی نبوت میں امتیاز پیدا کرتی ہے اسی نکتہ چینی کو نبی کریم ﷺ نے اس طرح واضح فرمایا ہے "خدا نے ہر پیغمبر کو کوئی نہ کوئی نشانی ضرور دی ہے جس کی مناسبت سے لوگ ایمان لائے۔ مگر مجھے جو نشانی دی گئی ہے وہ وحی ہے جسے خداوند تعالیٰ نے مجھ پر نازل فرمایا، مجھے امید ہے کہ قیامت کے دن سب پیغمبروں سے زیادہ تعداد میں میری امت ہو گی۔ متفق علیہ حدیث ابی ہریرہ۔

خداوند تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ہمیں بتایا ہے کہ مشرکوں نے رسول اکرم ﷺ سے کائناتی نشانیوں کا مطالبہ کیا تھا۔ اس پر آپ نے قرآن کریم کو بحیثیت مجموعی ثبوت کے طور پر پیش کیا۔ اس میں گذشتہ رسولوں اور الہامی کتابوں کی خبریں بھی تھیں جن کا نہ تو آپ ﷺ کو علم تھا نہ آپ ﷺ کی قوم کو۔ آپ ﷺ نے قرآنی ہدایت، اس کے علوم اور اس کی اعجاز بیانی کو پیش کیا مگر کوئی فرد یا جماعت ایسا قرآن کریم نہیں پیش کر سکی۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (۱)

"اے پیغمبر! آپ کہہ دیجیے کہ اگر انسان اور جنات سب جمع ہو کر بھی اس قرآن جیسی چیز لانا چاہیں تو وہ ہرگز نہ لا سکیں گے اگرچہ کہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں

نہ ہوں۔"

مگر وہ دنیاوی معجزات جن سے خدا نے آپ ﷺ کو سرفراز فرمایا تھا وہ سب آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کے ثبوت کے لیے نہیں تھے بلکہ وہ سختیوں اور مصیبتوں میں آپ کے لیے اور آپ ﷺ کے صحابیوں کے لیے اللہ کی طرف سے رحمت وعنایت کا نمونہ تھے۔ ان کے ذریعے خدا نے ان حملہ آور کافروں پر فتح یاب کیا جو تعداد، ہتھیار اور سامان، رسد وخوراک میں مسلمانوں سے بڑھ چڑھ کر تھے۔ اس سلسلہ میں جنگ بدر میں مسلمانوں کی فتح کی مثال کافی ہے، جنگ احزاب (جنگ خندق) میں مشرکین اور یہودی سازش کر کے مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے تھے انہوں نے مدینہ کا محاصرہ کر لیا تھا لیکن خدا نے انہیں بے نیل ومرام واپس کر دیا۔ اور مسلمانوں کو جنگ سے بچالیا۔

بیماروں کو شفا دینا۔ اندھے کو بینا کرنا اور جنگ خندق و تبوک میں قلیل خوراک سے بہت سے آدمیوں کا پیٹ بھر دینا حضرت مسیح کی طرح آپ ﷺ کے معجزات ہیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ یہ ہے کہ خدا نے جنگ بدر میں بادلوں کو مسلمانوں کے تابع کر دیا کہ وہ خود سیراب ہو جائیں اور ان کی قوم (بارش کی وجہ سے) ریت میں دھنسنے سے محفوظ رہیں۔ مگر مشرکین کو ان بادلوں سے ایک قطرہ بھی نصیب نہیں ہوا۔ اس طرح جنگ تبوک میں ہوا جب کہ صحرا میں فوج کا پانی ختم ہو گیا تھا۔ گرمی سخت تھی یہاں تک کہ مسلمان اونٹوں کو ذبح کرتے اور ان کے پیٹ میں سے پانی نکال کر اس سے اپنے حلق تر کرتے تھے۔ اونٹ بھی کم تھے اور ان سے کم پانی نکلتا تھا کہ اسے گھونٹ گھونٹ کر کے نہیں پیا جا سکتا تھا۔ اس پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ "یارسول اللہ"! اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی دعا کو بھلائی کا خوگر بنایا ہے ہمارے لئے دعا فرمایئے، آپ ﷺ نے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی ابھی دونوں ہاتھ اٹھائے بھی نہ پائے تھے کہ بارش شروع ہو گئی، سب نے مشکیزہ بردار اونٹوں کے مشکیزے بھر لئے۔ مگر یہ بارش آپ ﷺ کے لشکر سے آگے نہیں بڑھنے پائی (اسی حدیث کو صحیح کہہ کر ابن جریر، ابن خزیمہ، ابن حبان، اور حاکم نے روایت کیا۔ ابن مردویہ نیز ابو نعیم اور بیہقی نے اپنی دونوں کتابوں "دلائل النبوۃ" اور "الضیاء فی الاحادیث المختارۃ" میں روایت کیا ہے۔)

افراد واقوام پر عجائبات کا اثر:

رسولوں کے معجزات صرف ان جھگڑالو منکرین پر حجت تھے جو اپنے انکار کی وجہ سے دنیا اور آخرت میں عذاب الٰہی کے سزاوار بن گئے تھے۔ جن لوگوں نے ان معجزات کا مشاہدہ کیا ان میں سے صرف وہی ایمان لائے جو ایمان کی صلاحیت رکھتے تھے۔ چنانچہ فرعون اور اس کی قوم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات پر ایمان نہیں لائی بلکہ بنواسرائیل کی اکثریت بھی ان معجزوں کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکی اور وہ ان کا مشاہدہ کرنے کے باوجود منیاء کے جنگل میں گائے کی پرستش کرنے لگے۔ خود حضرت مسیح کے متعلق یہودیوں نے یہ کہا کہ اگر وہ شیطانوں کے سردار نہ ہوتے تو وہ انسان سے شیطان کو باہر نہیں نکال سکتے تھے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ابلیس یا بعلز بول (شیطان کا نام ہے) مسیح سے بہت بڑے معجزات دکھا سکتا ہے، چنانچہ (معجزات دکھانے کے باوجود) یہودیوں کی اکثریت ان معجزات پر ایمان نہیں لائی۔ منافقین نے خود اپنی آنکھوں سے یہ مشاہدہ کیا کہ بادلوں کے ایک ٹکڑے نے سخت گرمی میں رسول اکرم ﷺ کی دعا کے وقت صرف مسلمانوں کے لشکر پر بارش برسائی مگر اس کے باوجود یہ کہنے لگے "دعا سے نہیں بلکہ پچھتر وجہ سے بارش ہوئی ہے۔"

وہ لوگ جو ان معجزات پر ایمان لائے تھے ان میں سے اکثریت نے اس وجہ سے سر تسلیم خم کیا تھا کہ وہ اس کا اصل سبب نہیں سمجھ سکی تھی۔ ایسی صورت میں انسانی فطرت میں یہ بات ودیعت رکھی گئی ہے کہ جب وہ کسی چیز کا سبب نہ معلوم کر سکے تو وہ اگر اس کے پیش کرنے والے کو خالق نہ سمجھے تو اس کا مظہر ضرور سمجھتی ہے۔ تاہم ایسے لوگ انبیاء کی بہ نسبت کہیں زیادہ جادوگروں، شعبدہ بازوں اور دجالوں کے آگے سر جھکا دیا کرتے تھے اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

ان لوگوں نے حضرت مسیح علیہ السلام سے یہ روایت بیان کی ہے کہ ان کے بعد بہت سے جھوٹے مسیح اور جھوٹے پیغمبر نمودار ہوں گے اور وہ بڑے بڑے معجزات وعجائبات دنیا کو دکھائیں گے یہاں تک کہ وہ نیک اور برگزیدہ اشخاص کو بھی گمراہ کر سکیں گے (متی ۲۴: ۲۴)۔ کتاب مقدس کی ڈکشنری میں ان میں سے بہت سے جھوٹے اولوں کے نام ذکر کیے گئے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ ان میں سے ایک قادیانی بھی تھا جو مسلمانانِ ہند میں نمودار ہوا تھا۔ اخباروں میں ایک اور ہندوستانی کا نام بھی آیا ہے جو اپنے عجائبات کو اس سال امریکہ میں ظاہر کرے گا۔ حضرت مسیح سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا تھا:

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ ہر پیغمبر اپنے وطن میں مقبول نہیں ہوا کرتا" انھوں نے سچے نبی کی پہچان بتائی ہے کہ لوگوں کے دلوں پر اس کی ہدایت اثر کرے گی نہ کہ معجزات اور عجائبات۔ چنانچہ انھوں نے ارشاد فرمایا "تم ان کے پھلوں سے انھیں پہچانو گے۔" حقیقت یہ ہے کہ نہ مسیح سے پہلے اور نہ کوئی ان کے بعد ایسا پیغمبر نمودار ہوا جس کے پاکیزہ پھل انسانی ہدایت کے سلسلے میں محمد ﷺ کے پھلوں کا مقابلہ کر سکیں اور نہ کوئی شخص ایسا آیا جس پر ان کا یہ قول صادق آیا ہو جو یوحنا کی انجیل میں یوں منقول ہے "مجھے تم سے بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر اس وقت تم اسے برداشت نہیں کر سکتے مگر جب "روح صداقت" فارقلیط آئے گا تو وہ تمہیں مکمل صداقت کی راہ دکھائے گا (یوحنا ۱۶: ۱۲) چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ محمد رسول اللہ خاتم النبیین کے علاوہ اور کوئی ایسا پیغمبر نہیں آیا جس نے مکمل صداقت کی طرف رہنمائی کی ہو اور توجہ، شریعت، حکمت اور ادب و اخلاق کی تکمیل کی ہو۔

تاریخ اقوام کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ آسمانی مذاہب کے حلقہ بگوشوں سے زیادہ بت پرست قومیں اس قسم کے عجائبات پر یقین رکھتی ہیں۔ یہ لوگ اپنے بزرگوں اور اولیاء کے عجائبات کو اس کثرت سے بیان کرتے ہیں کہ پیغمبروں کے عجائبات بھی کمتر معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ان عجائبات پر یقین کرنے والے عام طور پر خرافات اور توہم پرست انسان ہوتے ہیں۔

محمدی نبوت کے ذریعے تمام نبوتوں کا اثبات:

خلاصہ یہ ہے کہ محمد ﷺ کی نبوت بذات خود مسلمہ حقیقت ہے اس کا دنیاوی نشانیوں اور معجزات سے نہیں بلکہ ناقابل شک علمی اور عقلی دلائل سے ثبوت ملتا ہے۔ یہ ثبوت ہر زمانے میں انسانی عقل وحواس سے معلوم کیا جاسکتا ہے، لہٰذا گذشتہ انبیاء کے معجزات اس وقت تک نہیں ثابت کئے جاسکتے جب تک حضرت محمد ﷺ کی نبوت اور آپ

ﷺ کے قرآن کریم کو نہ تسلیم کیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنس اور آزاد خیالی کے اس دور حاضر میں صرف قرآن کی ہی شہادت ان کی نبوت کا واحد ثبوت بن سکتی ہے کیونکہ جن کتابوں سے یہ واقعات نقل کئے گئے ہیں۔ انہیں اصل مصنفوں کی طرف منسوب کر کے انہیں صحیح طور پر ثابت نہیں کیا جا سکتا بلکہ جن زبانوں میں یہ الہامی کتابیں لکھی گئی ہیں ان زبانوں میں ان کے اصلی نسخے متواتر یا خبر واحد کی روایت سے نہیں پائے جاتے۔ نیز ان مصنفوں کو معصوم بھی نہیں ثابت کیا جا سکتا جبکہ ان میں بہت زیادہ اختلاف، تضاد اور تناقص پایا جاتا ہو۔ علاوہ ازیں ان کتابوں کے تراجم بھی صحیح نہیں ہیں جیسا کہ ہم بارہا بیان کر چکے ہیں۔

دنیا میں صرف ایک ہی الہامی کتاب موجود ہے جو متواتر صورت میں بے شمار انسانوں کے ذریعے اپنے پیغمبر کے زمانے سے لے کر اب تک لوگوں کے سینوں میں محفوظ ہو کر یا کتابی صورت میں حرف بحرف محفوظ طریقے سے نقل ہوتی چلی آئی ہے وہ الہامی کتاب قرآن کریم ہے اور صرف ایک ہی پیغمبر ایسا ہے جس کی تاریخ متصل اسانید کے ساتھ حفظ و تحریر دونوں طریقوں سے روایت ہوتی چلی آئی ہے وہ پیغمبر محمد ﷺ ہیں۔ ایسی صورت میں صرف ایک ہی مذہب ایسا باقی رہ گیا ہے جو آزاد خیال اہل علم کی عقل و سمجھ میں آ سکتا ہے اور اس کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں، وہ مذہب اسلام کا مذہب ہے۔

گذشتہ مذاہب کے بارے میں ہمیں جو اجمالی معلومات حاصل ہیں ان کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ قدیم تہذیب کی تمام قوموں میں ایسے لوگ موجود تھے جو ایک خدا کی عبادت اور نیک کاموں کی دعوت دیتے تھے اور برائیوں اور بداخلاقی سے روکتے تھے ان میں بعض پیغمبر بھی تھے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیک کاموں کی بشارت دیتے اور برے کاموں سے ڈراتے تھے۔ بعض حکماء بھی تھے جو عقل و تجربہ کی بنیاد پر لوگوں کو نفع نقصان کی باتوں سے آگاہ کرتے تھے۔ ان دونوں جماعتوں کے بارے میں کچھ ایسی باتیں بھی نقل کی گئیں، جو خلاف عقل ہیں اور ان سے لوگوں کو کچھ فائدہ نہیں پہنچا، تاہم کچھ ایسی باتیں بھی تھیں جو ان قوموں اور ان کے زمانے کے لئے مخصوص تھیں۔ بہت سی خرافات باتیں بھی تھیں، جنہیں علم و عقل نہیں تسلیم کرتے۔

چونکہ اسلام اور پیغمبر اسلام ہی کی ایسی ذات ہے جس کی اصل حقیقت اور تاریخ،

تفصیل کے ساتھ معلوم ہو چکی ہے اس لئے ہم یہاں مادہ پرست مغربی اہل علم اور ان کے حلقہ بگوشوں کے شبہات بیان کرتے ہیں لیکن اس کی تردید سے پہلے تمہید کے طور پر مجملاً ان لوگوں کے دو بیانات بھی درج کرتے ہیں جو انہوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں تحریر کئے ہیں۔

مغربی علماء اور سیرت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم :

مغربی علماء نے اسلام سے پہلے تاریخ عرب کا اپنی تنقید و تجزیہ کے طریقے کے مطابق مطالعہ کیا، انہوں نے سیرت نبوی کا مطالعہ بھی کیا، اس کی چھان بین کی اور اسے گوناگوں رنگوں سے منقش کیا، نیز قرآن کریم کو اس کی اپنی زبان میں پڑھا اور اپنی قوم کے افراد کے تراجم بھی ملاحظہ کئے۔ انہیں عہد قدیم وجدید کی کتب تاریخ مذاہب، بالخصوص یہودیت اور عیسائیت کے بارے میں مکمل معلومات حاصل تھیں نیز کلیسا کے متعصب مصنفوں نے اسلام کے خلاف جو الزامات تراشے تھے ان سے بھی وہ واقف تھے۔ اپنے اس مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے :

"محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اچھی طبیعت کے تھے۔ وہ بہت عقلمند، شریف، سچے اور پاکباز تھے۔ وہ تھوڑی چیز پر قناعت کر لیتے تھے، انہیں مال اور ملک گیری کی ہوس نہ تھی نہ اپنی قوم کی طرح شیخی خوری کی عادت تھی، اور نہ وہ بلند پایہ تقریروں اور شعر گوئی کے مقابلوں میں حصہ لیتے تھی۔ وہ اپنی قوم کی مشرکانہ رسوم اور بت پرستی کے خرافات سے بیزار تھے بلکہ ان لوگوں کی بہیمانہ دلچسپیوں سے سخت متنفر تھے۔ شراب نوشی، جوئے بازی، اور ناجائز طریقے سے لوگوں کے مال کھانے کو ناپسند کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس سیرت اور نبوت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جذبہ ایمانی کو دیکھ کر لوگوں کو بھی یہ یقین ہو گیا کہ چالیس سال کی عمر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دعویٰ میں سچے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وحی کے فرشتہ کو دیکھا، اس سے قرآن کریم پڑھا اس کے بعد وہ دنیا کی ہدایت کے لئے خدا کی طرف سے پیغمبر بنا کر بھیجے گئے۔"

ان مغربی علماء کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کا یقین اس وجہ سے اور بھی ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے اور نبوت سے ہدایت پانے میں پیش پیش وہ لوگ تھے جو آپ کی

اندرونی حالات کو سب سے زیادہ جانتے تھے چنانچہ ان میں سے سب سے پہلے آپ کی زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہ تھیں، جو اپنی عقلمندی، شرافت اور نیکی میں مشہور تھیں۔ اس کے بعد آپ ﷺ کے غلام زید بن حارث تھے جنہوں نے آپ ﷺ کی غلامی کو اس بات پر ترجیح دی کہ وہ اپنے والد اور خاندان کے ساتھ جا کر آزادی کی زندگی بسر کریں۔ ان کے علاوہ آپ ﷺ پر سب سے پہلے وہ لوگ ایمان لائے جو آزادی اور آزاد خیالی میں تمام عربوں سے آگے تھے جیسے ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔

ان مغربی علماء میں سے جو لوگ اللہ، اس کے فرشتوں پر اور اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ انسان روح لافانی ہے تو وہ محمد ﷺ کی نبوت پر یقینی معلومات اور دلائل کے ساتھ ایمان لے آتے ہیں اور جس قدر انہیں اسلام کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں، اس قدر ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

مگر مادہ پرست علماء مجبور تھے کہ وہ اس نا قابل انکار حقیقت کی کوئی ایسی توجیہ و تفسیر کریں اور اس کی ایسی علمی تصویر اتاریں جس کی وجہ سے وہ عقلیں بھی اسے تسلیم کر لیں جو مادہ یا نیچر سے دور کسی پوشیدہ عالم کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔

چنانچہ انہوں نے اپنی ذہن کے چقماق کو رگڑنا شروع کیا اور فلسفہ کے نظریات سے مدد طلب کی، اس کے نتیجہ میں ایک ہلکی سی آگ برآمد ہوئی جس کی مدھم روشنی میں انہیں وہ خیالی تصویر دکھائی دی جسے پروفیسر مونیتہ نے اجمال کے ساتھ اور امیل درمنگھم نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے (جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں) اس کی تشریح ہم تیسری فصل میں بیان کریں گے۔

فصل نمبر ۳:

عالم غیب کے منکرین کے شبہات

ان مادہ پرستوں کا خلاصہ یہ ہے کہ وحی ایک الہام ہے جو خود پیغمبر کے اندرون نفس سے نمودار ہوتا ہے نہ کہ باہر سے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ پیغمبر کے روحانی خیالات بلند، اس کا باطن پاکیزہ اور اللہ پر اس کا ایمان اس قدر مستحکم ہوتا ہے کہ وہ اس کی عبادت کو ضروری سمجھ کر دوسری چیزوں سے توجہ ہٹالیتا ہے، بت پرستی اور موروثی برے عقائد سے اسے سخت نفرت ہوتی ہے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذہن اور عقل میں گوناگوں روحانی تصورات رونما ہوتے ہیں، جس بات کو وہ ضروری سمجھتا ہے، اسے براہ راست ہدایت خداوندی اور آسمانی حکم یقین کرنے لگتا ہے۔ یا اپنے سامنے کسی مجسم وجود کو دیکھتا ہے جو اسے تلقین کرتا ہے اور یہ پیغمبر اسے عالم غیب کا فرشتہ سمجھتا ہے اور کبھی وہ اسے کوئی بات کہتے سنتا ہے۔ اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ عالم بیداری میں اس طرح وہی دیکھتا ہے اور سنتا ہے جو اس کا عقیدہ ہوتا ہے جس طرح وہ خواب میں دیکھا اور سنا کرتا تھا۔ خواب بھی تمام پیغمبروں کے نزدیک وحی کا ایک نمونہ ہے۔ لہٰذا پیغمبر جو کچھ بیان کرتا ہے وہ کلام اس کے دل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ یا کسی فرشتے کے ذریعے اس کے کانوں تک پہنچتا ہے۔ ہر حالت میں اس کے خیال کے مطابق وہ باتیں صحیح اور سچی ہوتی ہیں۔

مادہ پرست کہتے ہیں "ہم محمد (ﷺ) کی صداقت میں شک نہیں کرتے۔ مگر ہم سمجھتے ہیں کہ اس وحی کا سرچشمہ خود ان کی ذات کے اندر موجود تھا۔ اس مادی دنیا سے پرے عالم غیب سے کوئی چیز ان پر نازل نہیں ہوئی کیونکہ اس "غیب" کا وجود ہمارے نزدیک

ثابت نہیں ہے۔ ہمیں اس کے خلاف بھی کوئی ایسی دلیل نہیں ملتی جو اسے محال کہہ سکے، اس لئے ہم غیر معمولی ظاہری واقعات کی وہی توجیہ کریں گے جو ہمارے علم کے مطابق ہو۔

وحی کے اس توجیہ کی وضاحت کے لئے وہ فرانسیسی دوشیزہ جون آف آرک کا قصہ پیش کرتے ہیں جسے رومن کیتھولک کلیسا نے اس کی موت کے بہت زمانے کے بعد اللہ کی ولیہ کا درجہ دیا۔ نزول وحی کی جو تصویر ان مادی علماء نے کھینچی ہے اس کی وجہ سے بہت سے مادی علماء کے مقلد شکی مسلمانوں کے دلوں میں شبہات پیدا ہو گئے ہیں۔

اس خیالی تصویر کا پردہ چاک کرنے کے لئے میں جون آف آرک کے بارے میں گفتگو کا آغاز کروں گا کیونکہ اس سلسلہ میں میرے پاس ایک سوال آیا تھا جسے میں نے جواب کے ساتھ صفحہ ۷۸۸ جلد ۱۶، المنار ۱۳۲۱ھ میں شائع کیا تھا اور وہ حسب ذیل ہے:

وحی پر ایک شبہ: (حضرۃ الاستاذ الرشید)

وحی کے سلسلے میں جو دین کی بنیاد ہے چند شبہات میرے دل میں پیدا ہوئے، لہٰذا میں نے شیخ محمد عبدہ کے رسالہ توحید کا مطالعہ کیا اور اس کے دو باب "وحی کی ضرورت" اور "امکانی وحی" پڑھے۔ بیان عمدہ اور معقول تھا مگر کسی چیز کی ضرورت ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ عمل میں بھی آجائے۔ اس طرح اگر کسی چیز کا امکان ہے اور عقلاً محال نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ حاصل بھی ہو جائے۔ اس کے بعد رسول اکرم ﷺ کے حالات، قوم کے ساتھ آپ کا طرز عمل اور آپ ﷺ کے بڑے بڑے کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قوم نے آپ ﷺ کے ذریعے بہت ترقی کی۔ لہٰذا یہ آپ ﷺ کی نبوت اور بعثت کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ دلیل کچھ زیادہ وزنی نہیں ہے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ نبوت کا مدعی اپنی قوم میں ہر دل عزیز ہو اور اسے اپنی تحریک کی کامیابی کا پورا پورا یقین ہو اور اسی کے ذریعہ اس کی قوم کو عروج بھی حاصل ہو، مگر ان تمام باتوں کے باوجود ضروری نہیں کہ اسے صحیح پیغمبر تسلیم کیا جائے۔

پندرھویں صدی عیسوی میں جب فرانس انگریزوں سے مغلوب ہو گیا تھا، یہ واقعہ رونما ہوا کہ ایک لڑکی جس کا نام "جون آف آرک" تھا ظاہر ہوئی وہ نہایت نیک سیرت

اور پاک باطن تھی۔ ابھی وہ سیاسی ذمہ داریوں سے الگ تھلگ خانہ نشین ہی تھی کہ اس کے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ خدا نے اسے وطن کی آزادی اور دشمن کی سرکوبی کے لئے بھیجا ہے، اس اثناء میں وہ وحی کی صدائیں سننے لگی نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے مخلصانہ طریقے سے قوم کو جنگ کی دعوت دی اور اپنے مخلصانہ عزائم کی بدولت ایک چھوٹے سے لشکر کی سپہ سالار بن گئی اور دشمن پر غالب آگئی۔ مگر اس فتح کے بعد بہادروں کی طرح اس کی موت واقع ہوئی جب کہ اس کی قوم نے اس کے ساتھ غداری کی اور وہ دشمنوں کے ہاتھ آگئی۔ انہوں نے اسے زندہ آگ میں جلاڈالا۔ اس طرح اس لڑکی نے تاریخ کے صفحات میں ایسا نام چھوڑا ہے جس کی خوشبو، ہمیشہ مہکتی رہے گی۔ ابھی تک اس کی قوم اُسے بہت عزت واحترام کے ساتھ یاد کرتی ہے۔ کیونکہ اس کے بعد اس کی قوم بیدار ہوئی اور وہ علم وترقی میں بہت آگے نکل گئی۔

کیا ہم اس واقعہ کی بناء پر یہ یقین کرلیں کہ یہ لڑکی خدا کی پیغمبر تھی؟ ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ اس لڑکی کے کارنامے رسولوں کے کارناموں کے برابر نہیں ہیں۔ لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ کیا کوئی ترازو ایسی ہے جس کے ذریعے ہم مفید کارناموں کو تول سکیں اور یہ کہیں کہ وہ لڑکی اس درجہ تک پہنچ گئی تھی کہ ہم اس کے نبوت کے دعوے کو تسلیم کریں یا نہیں؟ فرض کیجئے کہ اتفاقات نے ایک شخص کا ساتھ دیا اور اس نے سب لوگوں سے اعلیٰ یادگار کارنامے سرانجام دیئے اور کسی وہم کی وجہ سے اسے اپنے پیغمبری ہونے کا یقین بھی ہو گیا تو کیا ہمارے لئے ضروری ہو جائے گا کہ ہم اس کی نبوت پر ایمان لے آئیں؟

میں سمجھتا ہوں کہ اور لوگوں کی نسبت سے ایسے شخص کو ترجیح ضرور دی جائے گی مگر اس کی نبوت کا یقین ہونا ضروری نہیں ہے۔ میں منتظر ہوں کہ آپ میرے سوال میں غلطی نکال کر مجھے قائل کریں گے اور مزید وضاحت فرمائیں گے جس سے یہ پردہ ہٹ سکے اور آپ ثواب کے مستحق ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ بہت سے مسلمانوں کا خیال بھی وہی ہے جو میرے خیالات ہیں لیکن وہ اسے چھپاتے ہیں اور کسی انسان سے دریافت کرنے کے خوف سے وہ کتابوں سے اس کا حل تلاش کرتے ہیں۔ مگر میں سوال کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتا کیونکہ ہر عقل کے صحیح اور غلط ہونے کا امکان ہے۔ (ایک قاری)

المنار کا جواب :

ہمیں یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی ہے کہ اگرچہ شبہ سائل کے دل و دماغ پر راسخ ہو چکا تھا۔ تاہم اس نے اس کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے ورنہ وہ دین کی سرحدوں سے نکل کر خواہشوں اور شبہات کے دلدلوں میں پھنس جاتا جہاں روحوں کے ساتھ جسم بھی بگڑ جاتے ہیں۔ اس نے دین کے فطری شعور کی پیروی کی اور کتابوں اور اہل علم سے دریافت کرنے کی طرف توجہ کی تاکہ شبہات دور ہوں اور اصل حقیقت معلوم ہو۔ بہت سے لوگ جونہی ان کے ذہنوں میں ذرا سا بھی شبہ پیدا ہو وہ راہ حق سے پھر جاتے ہیں کیونکہ وہ لذت کوشی کے عادی ہیں اور مذہب کو عیش و عشرت کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہیں اس لئے وہ مذہب کے فطری احساس کا خاتمہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس طرح جہالت نے ان کے عقلی استدلال کا خاتمہ کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ سائل نے رسالہ توحید کے مقدمات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا ہے مگر اس کے مقاصد و نتائج میں دقت نظر سے کام نہیں لیا یہی وجہ ہے کہ وہ ان مقدمات کو تسلیم کرتا ہے مگر نتیجہ کو نہیں مانتا حالانکہ وہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اگر وہ دوبارہ اس رسالہ کے باب "نبوت کی ضرورت" کو غور کے ساتھ مطالعہ کرے اور اللہ پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی تسلیم کر لے کہ خدا نے اس کائنات کی بنیاد زبردست حکمت اور مکمل نظام کے ساتھ قائم کی ہے تو امید ہے کہ وہ مطمئن ہو جائے گا۔ مجھے اس سوال کے مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے اس رسالہ کی بحث کا حصہ بعنوان "وحی رسالت کا وقوع" نہیں پڑھا، یا پڑھا ہے تو اس پر اچھی طرح غور نہیں کیا کیونکہ اس نے رسالت کی دلیل کا حوالہ دے کر اس پر اپنے شبہ کی بنیاد نہیں قائم کی ہے بلکہ اسے مقدمات کے ایک حصہ پر شبہ ہے یعنی پیغمبروں کی صفات۔ اس لئے پہلے میں اس کا شبہ دور کرتا ہوں اس کے بعد اصل موضوع پر اظہار خیال کروں گا۔

جون آف آرک نے جس کی وجہ سے سائل کو پیغمبروں کی وحی پر شبہ ہوا ہے کبھی کسی دین یا مذہب کی دعوت نہیں دی اور نہ پیغمبروں کی طرح کبھی یہ کہا ہے کہ اس کے مذہب پر زندگی اور موت کے بعد انسانوں کی فلاح کا دارومدار ہے۔ وہ کوئی دنیاوی یا علمی معجزہ بھی نہیں لائی۔ جو انسان کی طاقت میں نہ ہو اور معجزہ کے ذریعے چیلنج دے کر لوگوں

کو اپنے ایمان کی طرف دعوت دی ہو۔ حقیقت میں وہ شریفانہ جذبات والی لڑکی تھی جسے مذہبی احساسات اور سیاسی ابتری نے برانگیختہ کیا اور وہ جوش میں آگئی حکومت نے اس کی حمایت کی اور قوم بھی ذلت سے نکلنے کے لئے بے چین تھی اس طرح اپنے جوشیلے جذبات سے مغلوب ہو کر وہ دشمن پر حملہ آور ہوئی اور اسے فتح نصیب ہوئی۔ اہل فرانس کو اس سے بھی معمولی باتوں پر بھڑکانا بہت آسان ہے۔

نپولین چند شاعرانہ الفاظ کے ذریعے انہیں موت کے منہ میں دھکیل دیتا تھا جیسا کہ اس نے اہرام مصر کے سامنے چند الفاظ کہے تھے۔

میں دانشمند سائل کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اس نے اس لڑکی کو سیاسی ہنگاموں سے دور دکھا کر غلطی کی ہے۔ بستانی کی عربی انسائیکلوپیڈیا میں اس کا حال اس طرح لکھا ہے:

"جون آف آرک، گھر سے باہر کام کرنے کی عادی تھی جیسے مویشی چرانا اور چشمہ تک گھوڑے پر سوار ہو کر جانا اور واپس آنا۔ اس کے شہر "دومری" کے اطراف کے لوگ خرافات پرست اور فرانس کے تباہ کن اختلافات میں مشغول رہتے تھے، وہ اورلیان پارٹی کے حامی تھے۔ جون سیاسی اور مذہبی ہنگاموں میں ان کی شریک تھی وہ تخیل پسند اور پاکباز تھی۔ کنواری مریم کے قصوں بالخصوص اس پشین گوئی پر بہت غور کرتی تھی جو اس وقت پھیلی ہوئی تھی یعنی کسی کنواری لڑکی کے ہاتھوں فرانس اپنے دشمنوں سے رہائی پائے گا جب اس کی عمر تیرہ سال کی ہوئی تو وہ مافوق الفطرت واقعات پر یقین رکھنے لگی۔ وہ مختلف آوازیں سنتی اور ان کی خبر دیتی تھی، اسے بہت سے خواب بھی نظر آئے۔ اس کے چند سال بعد اس کے دل میں یہ خیال واضح ہو گیا کہ وہ اس کام پر مقرر کر دی گئی ہے کہ اپنے ملک کو نجات دلائے اور بادشاہ کو تاج پہنائے۔ جب اس کے گاؤں پر بھی جہاں وہ پیدا ہوئی تھی دشمن نے حملہ کیا تو اس کے خیالی عقیدہ کو مزید تقویت حاصل ہوئی۔

اس کے بعد وہ حکام کے پاس پہنچی اور شاہی فوج کے ایک حصہ کی سردار بن گئی جس کی تعداد دس ہزار تھی، اس کے افسر شاہ پسند تھے۔ یہ فوج لے کر اس نے انگریزوں کے لشکر پر حملہ کیا جو اورلیان کا محاصرہ کئے ہوئے تھی انہیں شکست ہوئی۔ یہاں تک کہ انہوں نے ایک ہفتہ میں اس شہر کا محاصرہ اٹھالیا۔ یہ واقعہ ۱۴۲۹ء میں ہوا۔ اس فتح کے بعد اس کے پرجوش تخیلات کا خاتمہ ہو گیا۔ چنانچہ اگلے سال ۱۴۳۰ء میں انگریزوں نے اس پر حملہ

کیا وہ شکست کھا کر زخمی ہو گئی اور قید کر لی گئی۔

اس خلاصہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جون کی بہادری اعصابی ہیجان کی وجہ سے تھی جو اس سیاسی صورت حال سے متاثر ہونے کا نتیجہ تھا، جس سے قوم کے سب افراد متاثر تھے البتہ اس میں مذہبی جوش اور ان مذہبی خرافات کا بھی بہت بڑا دخل تھا جو اس زمانے میں پھیلے ہوئے تھے۔ یہ ایک معمولی بات ہے جس کا سبب ہر ایک کو معلوم ہے۔ ایسے واقعات ان لوگوں کو بھی پیش آتے ہیں جو "مہدی منتظر" کے نام سے کھڑے ہوئے ہیں جیسے محمد احمد مہدی سوڈانی اور محمد علی باب (اس طرح بہائی اور قادیانی بھی ہیں۔) بلکہ جون کا قصہ ان دونوں اشخاص کے واقعات کی بہ نسبت شک و شبہ سے پاک ہے۔ گو ان سب کی تحریکات کے اسباب ملتے جلتے ہیں تاہم یہ دونوں اشخاص لوگوں کو ایک جھوٹی تحریک کی طرف بلاتے تھے اور یہ دعویٰ کرتے تھے کہ اس میں انسانیت کی اصلاح ہے۔

کہاں یہ اعصابی دورہ جو بہت کم مدت تک رہا اور جس کی وجہ سب جانتے ہیں، یہ نہ کوئی علمی تحریک تھی اور نہ سماجی اصلاح کا قدم تھا بلکہ مصیبت کے وقت وطن کی حفاظت کا جذبہ تھا جو انسانوں اور بے زبان حیوانوں دونوں میں موجود ہوتا ہے جس کے لئے نہ تو کسی دلیل کی ضرورت تھی اور نہ کسی معجزہ کی حاجت تھی۔ یہ ایک شعلہ تھا جو یکدم بھڑک اٹھا اور پھر بجھ گیا۔ اس کا پیغمبروں کی دعوت خلق سے کیا مقابلہ ہو سکتا ہے جو بقول الاستاذ الامام (مفتی محمد عبدہ) انسانی سماج کی وہ فطری ضرورت ہے کہ جب کبھی نوع انسانی نے اپنی فطری استعداد کے مطابق سے اسے طلب کیا تو اُسی وقت خداوند حکیم نے جو منتظم حقیقی ہے، اسے یہ نعمت عطا فرمائی۔ وہی ہر چیز اپنی مخلوق کو عطا فرماتا ہے اور پھر وہی ہدایت بخشتا ہے۔ الغرض اس دعوت کی بدولت انسان درجہ کمال کی طرف قدم بڑھاتا ہے تاکہ دوسری زندہ مخلوقات سے کمتر نہ رہے بلکہ ان سے اعلیٰ اور ترقی یافتہ بن جائے۔ لہٰذا یہ چیز نبوت کے دلائل اور اثرات کا کیسے مقابلہ کر سکتی ہے؟

جن قوموں نے وحی کے ذریعے ترقی کی تو ان کی ترقی وحی الٰہی کا قدرتی اثر اور نتیجہ تھی، برخلاف اس کے فرانس نے جون آف آرک کی رہنمائی اور تعلیمات کی بدولت ترقی حاصل نہیں کی۔ اس لڑکی کی مثال اس سپہ سالار کی سی ہے جسے فیصلہ کن جنگ میں اس کی اپنی بہادری اور ایسے ذرائع سے فتح حاصل ہوئی جن پر اسے کوئی اختیار نہیں تھا۔ اس کے

بعد اس کی قوم ملک پر قابض ہو کر اسے اپنے علماء کے علم، حکماء کی حکمت اور صناعوں کی صنعت گری کی بدولت ترقی دیتی ہے۔ فاتح جرنیل نہ تو ان چیزوں سے واقف تھا اور نہ اس کی رہنمائی میں یہ کام ہوا۔ تو ایسے موقع پر یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس جرنیل نے ملک کی اصلاح کی، اس کو آباد کیا اور اسے مہذب بنایا، گو اس کا ان چیزوں سے دور کا تعلق تھا مگر وہ تعلق ایسا ہی ہے جیسے ہوا کے چلنے سے سمندر میں طوفان آجائے اور دشمن کا بحری بیڑہ ڈوب جائے اور قوم کو فتح حاصل ہو جائے۔

کہاں یہ لڑکی جو بجلی کی طرح نمودار ہو کر غائب ہو گئی یا کڑک کی طرح چیخی اور پھر خاموش ہو گئی۔ کہاں وہ محمدی نبوت کا آفتاب جس نے طلوع ہو کر سارے جہاں کو روشن کر دیا بلکہ اس کا نور آج بھی چمک رہا ہے اور ہمیشہ چمکتا رہے گا۔ آپ ﷺ امی یتیم تھے۔ آپ ﷺ نے بچپن اور جوانی کا زمانہ سکون اور خاموشی سے گذارا اس وقت آپ ﷺ کے پاس نہ علم تھا نہ تخیل نہ مذہبی توہمات تھے نہ شعر و خطابت تھی۔ پھر اچانک چالیس سال کی عمر میں آپ ﷺ دنیا کو للکار کر کہتے ہیں "تم کھلم کھلا گمراہی پر ہو، آؤ میری پیروی کرو میں تمہیں راہ مستقیم دکھاؤں گا۔" آپ ﷺ نے امی ہوتے ہوئے مذاہب انسانی کے عقائد، آداب و اخلاق اور قوانین کی اصلاح کی اور دنیا کے نظام میں انقلاب برپا کیا۔ چنانچہ آپ ﷺ کی تعلیمات کی بدولت کائنات کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ یقیناً ان دونوں حالتوں میں بہت بڑا فرق ہے بشرطیکہ ایک دانشمند انسان اس پر غور و خوض کرے۔ اس سوال کے جواب میں نبوت کے مفصل دلائل بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا میں سائل سے درخواست کروں گا کہ وہ رسالہ توحید میں نبوت کی باقی ماندہ بحث پر غور کرے۔ نیز ہم نے رسالہ المنار میں جو دینی مباحث بیان کئے ہیں۔ ان کا مطالعہ بھی کرے بالخصوص اس درس کا جس کا عنوان ہے "نبوت کی صداقت پر کھلی نشانیاں"۔ بہر حال رسالہ "التوحید" ان سب مباحث کی اصل بنیاد ہے۔ اس پر بھی اگر شبہ باقی رہ جائے تو اس موضوع پر زبانی گفتگو کے لئے ہمارے پاس آئیں کیونکہ زبانی گفتگو سے زیادہ تسلی و تشفی ہوتی ہے۔ اسی صورت میں ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم اس معاملے کو بصیغہ راز رکھیں گے۔ اگر ملاقات ممکن نہ ہو تو رسالہ "التوحید" اور ہمارے دروس کے مطالعہ کے بعد نبوت کی عملی وقوع پر جو شبہات انہیں پیدا ہوں وہ ہمیں لکھ کر بھیجیں۔ اس موقع پر ہم اس طرح

تفصیلی جواب دیں گے کہ وہ مطمئن ہو جائیں گے۔ بہر حال زبانی گفتگو بہتر اور مناسب ہے جیسا کہ اسی قسم کا شبہ رکھنے والے حضرات سے ذاتی تجربہ کے بعد ہمیں معلوم ہوا۔ (المنار کا جواب ختم ہوا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سائل اس جواب اور مفتی محمد عبدہ کے رسالہ التوحید کے دلائل سے مطمئن ہو گئے تھے کیونکہ اس کے بعد انہوں نے ہمیں کچھ نہیں لکھا۔)

جو کوئی خداوند حکیم بزرگ و برتر کو خود مختار فاعل سمجھ کر اس پر ایمان لائے گا وہ ضرور الاستاذ الامام مفتی محمد عبدہ کے اس بیان کو تسلیم کرے گا جس میں انہوں نے وحی کو ثابت کیا ہے۔ انہوں نے یہ ثابت کیا کہ ان کے مفہوم کے مطابق وحی اور رسالت کا وقوع عملی طور پر علم و حکمت الٰہی کے لئے ضروری ہے کیونکہ وہی ہے۔

الَّذِيٓ اَعۡطٰى كُلَّ شَيۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۝

جس نے ہر چیز کو قاعدہ سے بنایا اور اس کی رہنمائی کی۔

یہ بات اچھی طرح وہی سمجھ سکتے ہیں جو علم الاجتماع، کائنات، اور اس کے فطری قوانین اور اصول عقائد سے اچھی طرح واقف ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ عربی زبان کی بلاغت سے بھی واقف ہوں۔ تاہم محمد ﷺ کی نبوت اور رسالت کو فلسفہ اور بلاغت کی مدد کے بغیر بھی ثابت کیا جا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس نے مغربی مادہ پرست علماء کو بھی مجبور کر دیا ہے کہ وہ آپ ﷺ کی وحی کی تصویر کو اپنے رنگ میں پیش کریں، اس کی تفصیل و تردید ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

شبہات کی تفصیل و تردید:

پروفیسر مونیتہ نے جس شبہ کا اجمالاً ذکر کیا ہے۔ پروفیسر امیل درمنگھم نے اسے اس قدر تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے کہ دوسرے مغربی مصنفوں کے ہاں اس قدر تفصیل نہیں ملتی یہاں تک کہ بہت سے مسلمان بھی اس کی وجہ سے بھٹک گئے ہیں۔

ہمارے حکیم الامت سید جمال الدین افغانی بعض عیسائی مناظروں سے فرمایا کرتے تھے۔ "تم نے عہد قدیم (تورات) کے چیتھڑوں سے ایک قمیص تیار کر کے حضرت مسیح علیہ السلام کو پہنا دی ہے" ہم اس پر مزید اضافہ کرتے ہیں "تم نے تاریخ اسلام سے

استنباط کر کے (نہ کہ اس کے متن اور عبارت سے) ایک کرتا تیار کیا ہے جسے تم نے محمد ﷺ کے جسم پر منڈھنے کی کوشش کی ہے۔" میں ان شبہات کو در منگھم سے بھی زیادہ تفصیل سے بیان کرنے کے بعد ان کی تردید کروں گا۔ ان شبہات کی بنیاد دس (۱۰) باتوں (مقدمات) پر قائم ہے۔

ا۔ بحیرا سے استفادہ کا الزام:

مغربی علماء کہتے ہیں کہ محمد (ﷺ) شام کے شہر بصریٰ میں بحیرا راہب سے ملے تھے۔ ان کے یہاں کے مطابق بحیرا النستطوری فرقے سے تعلق رکھتا۔ اور توحید میں آربوس کا متبع تھا۔ وہ مسیح کی الوہیت اور تثلیث کے عقیدہ کا منکر تھا۔ ان کے خیال میں محمد ﷺ نے ضرور ان سے یہ عقائد سیکھے ہوں گے۔ بحیرا کے بارے میں وہ یہ کہتے ہیں کہ وہ علم نجوم اور ہیئت کا ماہر حساب دان اور جادوگر بھی تھا اور اس کا یہ عقیدہ تھا کہ خدا نے ظاہر ہو کر اسے یہ خبر دی ہے کہ اولاد اسماعیل کو عیسائیت کی طرف لانے والا ایک ہادی عنقریب نمودار ہو گا بلکہ راہبوں سے ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ بحیرا محمد ﷺ کا معلم اور استاد تھا اور پیغمبری کے بعد وہ آپ ﷺ کا مصاحب تھا۔ آپ ﷺ نے شراب کو محض اس وجہ سے حرام کیا ہے کہ آپ ﷺ نے (نعوذ باللہ) نشہ کی حالت میں اپنے استاد بحیرا کو قتل کر دیا تھا۔ الغرض انہوں نے اس سلسلے میں بھی حد سے زیادہ الزام تراشے ہیں۔ حالانکہ سیرت نبوی کے راویوں سے مسلمانوں کو جو معلوم ہوا ہے وہ صرف یہ ہے کہ آپ ﷺ نو برس اور بعض روایتوں کے مطابق ۱۲ برس کی عمر میں اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ شام گئے تھے، اس موقع پر اس راہب نے آپ ﷺ کو قریش کے ساتھ اس حال میں دیکھا تھا کہ ابر کا ٹکڑا آپ ﷺ پر سایہ فگن تھا۔ اس نے آپ کے چچا سے کہا "یہ لڑکا بہت بڑا ہو گا اسے یہودیوں سے بچانا چاہیے۔" اس کے ہم معنی دوسری روایات بھی ہیں لیکن ترمذی کی روایت کے سوا جس میں بحیرا کا نام نہیں ہے سب کی سب ضعیف ہیں۔ اس روایت کے متن میں بھی غلطی ہے لیکن کسی روایت میں یہ نہیں آیا کہ آپ ﷺ نے بحیرا سے اس کے مذہب یا عقیدہ کے بارے میں کوئی بات سنی تھی۔

۲۔ ورقہ بن نوفل سے استفادہ کا الزام:

مغربی علماء کا قول ہے کہ ورقہ بن نوفل عرب عیسائی اور عیسائیت کا بہت بڑا عالم تھا وہ حضرت خدیجہ کا رشتہ دار بھی تھا۔ اس طرح وہ پڑھنے والوں کو دھوکا دیتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اہل کتاب کا علم ورقہ بن نوفل سے حاصل کیا تھا۔ حالانکہ ورقہ کا صحیح حال وہی ہے جسے شیخین یعنی امام بخاری و مسلم وغیرہم نے روایت کیا ہے کہ جب رسول اکرم ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہ کو بتایا کہ آپ ﷺ نے غار حرا میں ایک فرشتہ کو دیکھا ہے تو وہ آپ ﷺ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں اور اسے تمام حال بتایا۔ وہ بوڑھا اور اندھا تھا۔ اس واقعہ کے بعد جلدی ہی وہ مر گیا تھا۔ اس کا کہیں ذکر نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے دوبارہ کبھی اس سے ملاقات کی ہو۔ اس سلسلے میں مستند حدیث کی عبارت اس بحث کے آخر میں نقل کروں گا۔

محدثین اور مؤرخین نے ورقہ کے متعلق روایات کا تمام معلوم ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔ خواہ اس کی روایت صحیح ہو یا نہ ہو جیسا کہ ان کا عام طریقہ تھا کہ رسول اکرم ﷺ سے متعلق ہر چیز کو جمع کر دیا کرتے تھے۔ مگر ان میں سے کسی نے یہ نہیں لکھا کہ ورقہ نے عیسائیت کی دعوت دی ہو یا کچھ کیا ہو۔

بعض روایات میں صرف اس قدر مذکور ہے کہ ورقہ نے جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ کا حال سنا تو یہ کہا یہی وہ پیغمبر ہیں جن کا انتظار کیا جا رہا تھا اور جس کی حضرت مسیح عیسیٰ بن مریم نے بشارت دی تھی۔ بعض روایات میں یہ ہے کہ ورقہ اس وقت تک زندہ رہا جب کہ مشرکین مکہ حضرت بلال کو تکلیفیں پہنچا رہے تھے تاکہ وہ اسلام سے پھر جائیں لیکن یہ شاذ روایت ہے اور حضرت عائشہ کی صحیح روایت کے خلاف ہے جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ وحی کی ابتدا کے وقت ورقہ اندھا تھا اور جلد ہی مر گیا تھا۔ حضرت بلال کی سزائیں اس وقت شروع ہوئیں جب کہ اسلام کی دعوت کا اعلان ہو چکا تھا اور ایک بڑی تعداد مسلمان ہو گئی تھی، لہٰذا یہ واقعات آغاز وحی کے تین سال بعد کے ہیں۔

امیل درمنگھم نے وحی کے رک جانے کا حال غلط لکھا ہے کیوں کہ حدیث کے فن سے ناواقف ہونے کی وجہ سے وہ روایات کے اختلاط اور اس کے مختلف طریقوں کو نہیں سمجھ سکا۔ محدثین کا مقصد ورقہ کے سلسلے میں صرف اس قدر تھا کہ وہ یہ معلوم کرنا چاہتے

تھے کہ ورقہ صحابی ہے یا نہیں، کیونکہ صحابی وہی ہے جس نے رسول اکرم ﷺ کو مسلمان ہونے کی حالت میں دیکھا ہو، اگر انہیں ورقہ کے بارے میں مزید معلومات ہوتیں کہ وہ تو رات یا انجیل کا عالم تھا تو وہ ضرور تحریر کرتے۔

۳۔ یہودیت اور نصرانیت عرب میں :

ان لوگوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اسلام سے پہلے عرب میں یہودیت اور عیسائیت پھیل چکی تھی اور عرب کے بعض فصحاء اور شعراء عیسائی ہو گئے تھے مثلاً قس بن ساعدہ اور امیہ بن ابی الصلت۔ ان کے خیال میں یہ لوگ اہل کتاب کے علماء سے سن کر یہ کہتے پھرتے تھے کہ عنقریب وہ پیغمبر نمودار ہوگا جس کی حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور دوسرے پیغمبروں نے خوش خبری پہنچائی تھی۔ تورات وانجیل اور دوسرے صحیفوں کی بعض مستند بشارتیں ہم نے آیت اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ (۱۵۷ سورہ اعراف) کی تفسیر میں نقل کر دی ہیں۔

قس بن ساعدہ رسول کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے مر چکا تھا، بیان کیا جاتا ہے کہ آپ نے اپنی بعثت سے بہت پہلے اسے دیکھا تھا وہ سوق عکاظ میں اپنے سرخ اونٹ پر بیٹھا ہوا پر تکلف الفاظ میں تقریر کر رہا تھا وہ کہتا تھا۔

"خدا کا ایک دوسرا مذہب ہے جو تمہارے مذہب سے بہتر ہے ایک نبی آنے والا ہے اس کا وقت آ پہنچا ہے۔ کیا ہی اچھے ہیں وہ لوگ جو اسے دیکھیں گے اور اس کی پیروی کریں گے۔ ہلاکت ہے ان کے لیے جو اس کی مخالفت کریں گے۔"

اس سلسلہ کی تمام روایتیں ضعیف ہیں، بعض موضوع ہیں اور بعض کا سلسلہ روایت منقطع ہے، بہر حال چونکہ متعدد روایتیں ہیں اس لیے کچھ نہ کچھ اصلیت ضرور ہے۔

امیہ بن ابی الصلت مشہور شاعر ہے۔ ابو عبیدہ کہتے ہیں کہ عرب اس بارے میں متفق ہیں کہ امیہ قبیلہ ثقیف کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ زبیر بن بکار کہتے ہیں کہ میرے چچا نے کہا کہ امیہ نے عہد جاہلیت میں کتابیں پڑھی تھیں اور راہبوں کا لباس پہنا تھا، وہ حضرات ابراہیم، حضرت اسمٰعیل اور دین حنیفی کا بار بار ذکر کرتا تھا۔ اس نے شراب حرام کر رکھی تھی اور بت پرستی سے متنفر تھا۔ اسے خود اپنے نبی ہونے کی توقع تھی۔ اس نے

کتابوں میں پڑھا تھا کہ حجاز میں ایک پیغمبر پیدا ہوگا، للذا سے اپنے نبی ہونے کی توقع پید اہو گئی لیکن جب رسول کریم ﷺ کی بعثت ہوئی تو اسے حسد پیدا ہوا اس لیے اس نے اسلام قبول نہیں کیا۔ اس نے جنگ بدر کے مقتول مشرکین کا مرثیہ بھی کہا تھا۔

مرآۃ میں ابن ہشام سے روایت ہے کہ امیہ رسول کریم ﷺ پر ایمان لے آیا تھا چنانچہ وہ حجاز آیا تا کہ طائف سے اپنا مال لے کر ہجرت کر جائے جہاں آکر اسے جنگ بدر اور اس میں اکابر قریش کے قتل کا حال معلوم ہوا۔ یہ سن کر اس نے اپنی اونٹنی کی ناک کاٹ لی اپنے کپڑے پھاڑے اور بہت رویا کیونکہ ان مقتولین میں اس کے دو ماموں زاد بھائی تھے۔ اس کے بعد وہ طائف میں رہ گیا اور وہیں مر گیا۔ مگر صحیح روایت یہ کہ رسول اکرم ﷺ نے شرید بن عمر سے امیہ کے اشعار پڑھوائے، جب انہوں نے وہ شعر پڑھے تو آپ نے فرمایا قریب تھا کہ وہ ایمان لے آتا۔ مشہور واقعہ یہ ہے کہ امیہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین حنیفی پر قائم تھا، اس نے عیسائی مذہب قبول نہیں کیا تھا۔ اس کا ایک شعر ہے :

کل دین یوم القیامۃ عند اللہ الا دین الحنیفۃ زور

(قیامت کے دن اللہ کے سامنے دین حنفی کے علاوہ ہر مذہب جھوٹا ہوگا۔)

۴۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا اسلام :

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ایران کے باشندے اور مجوسی تھے۔ بعض راہبوں کی کوشش سے عیسائی ہو گئے اور ان کے کئی زاہدوں کے ساتھ رہے۔ انہی راہبوں سے یا کسی اور سے انہوں نے سنا کہ عرب میں عنقریب وہ پیغمبر نمودار ہوگا جس کی بشارت حضرت عیسیٰ اور دوسرے پیغمبروں نے دی ہے۔ یہ سن کر انہوں نے ملک عرب کا قصد کیا مگر زبردستی مدینہ کے یہودیوں کے ہاتھ فروخت کر دیے گئے۔ انہوں نے رسول اکرم رضی اللہ عنہ کو ہجرت کے بعد دیکھا۔ چنانچہ وہ مسلمان ہوئے اور اپنے آقا سے اپنی آزادی کا سودا کر کے آزاد ہو گئے۔ ان کے بارے میں بہت متضاد روایات ہیں جن سے درمنگھم وغیرہ نے فائدہ اٹھایا (کہ آپ ﷺ نے الہامی کتب کی بہت سی معلومات ان سے حاصل کیں)۔

۵۔ قریش تاجروں کا سفر :

یہ مغربی مصنف بیان کرتے ہیں کہ قریش تاجر موسم سرما میں یمن کا اور موسم گرما میں شام کا سفر کرتے تھے۔ ان ملکوں میں قریش خانقاہوں اور کلیساؤں میں عیسائی پادریوں اور راہبوں سے ملاقات کیا کرتے تھے جو انہیں بتاتے تھے کہ عنقریب عرب میں ایک پیغمبر نمودار ہو گا۔

٦۔ مکہ کے یہود و نصاریٰ :

در منگھم کا خیال ہے کہ خود مکہ میں بعض یہودی اور عیسائی موجود تھے لیکن سب کے سب غلام اور نوکر تھے۔ قریش کے سرداروں کی طرف سے انہیں اجازت نہیں تھی کہ وہ عربوں کے مقدس حرم مکہ میں رہیں جو ان کے بتوں اور بت پرستی کے لیے مخصوص مقام تھا۔ بلکہ یہ لوگ مکہ کے اطراف میں رہتے تھے۔ ان کے گھر خانہ کعبہ سے دور صحرا کے قریب ہوتے تھے۔ یہ لوگ اپنی مذہب کی باتیں کیا کرتے تھے جو قریش کے سرداروں اور ان کے اکابر کے کانوں تک نہیں پہنچتی تھی یا وہ ان کی طرف دھیان نہیں دیتے تھے کیونکہ وہ اس قسم کی باتیں اپنے سفر میں بہت سنتے تھے مگر ور منگھم نے ذکر کیا ہے کہ ابوسفیان نے امیہ بن ابی الصلت کو اس بات پر ملامت کی تھی کہ وہ نبوت کے بارے میں راہبوں کی گفتگو کا چرچا کیوں کرتا رہتا ہے۔ یہ باتیں مغربی اہل قلم اس لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ نبی اکرم ﷺ کے دعویٰ نبوت کا پس منظر بتا سکیں اور اس کی توجیہہ کر سکیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ آپ ﷺ نے نبوت کا یہ چرچا سن کر اپنے آپ کو نبی سمجھ لیا تھا۔ اپنے اس طریقہ استنباط کو وہ تحلیل و تجزیہ کی تنقید کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ آپ ﷺ کا نفسیاتی اور ذہنی تجزیہ بھی کرتے ہیں، نیز آپ ﷺ کی قوم کی حالت، اس کا ماحول اور اس کے اثرات کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ بہر حال ماقبل باتوں سے اس کا سلسلہ ملا کر ہم ان کے اقوال کا خلاصہ تنقید کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

۷۔ تجارتی سفر کے اثرات :

در منگھم نے آپ ﷺ کے دادا عبد المطلب کی وفات کے بعد ابو طالب کی سرپرستی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ابو طالب مالدار نہ تھے اس لیے بچے (حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ)

کو تعلیم نہ دے سکے جو زندگی بھر ناخواندہ رہا۔ (وہ یہ کہہ کر پڑھنے والوں کو اس وہم میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں کہ مکہ میں دولت مندوں کی اولاد تعلیم حاصل کرتی تھی گویا کہ وہاں مہذب ممالک کی طرح مدارس ہوا کرتے تھے، جہاں لڑکے فیس دے کر پڑھا کرتے تھے حالانکہ یہ بات بالکل بے بنیاد ہے) آگے چل کر وہ کہتا ہے "مگر ابو طالب آپ کو تجارت کے سفروں میں ساتھ لے جاتے تھے۔ قافلے صحراؤں میں دور دراز کی مسافتیں طے کرتے تھے۔ اس وقت آپ ﷺ کی خوبصورت آنکھیں مدین وادی القریٰ اور قوم ثمود کے ویران کھنڈر کا مشاہدہ کرتیں، آپ ﷺ کے کان جو ہر وقت عربوں اور بدویوں کی باتیں سننے کے لیے ہمہ تن گوش رہا کرتے تھے، ان مقامات کے حالات سنتے تھے۔ کہا جاتا کہ آپ ﷺ نے شام کے ایک سفر میں بحیرا راہب سے شہر بصریٰ کے قریب ملاقات کی۔ راہب نے آپ میں نبوت کی وہ تمام علامتیں دیکھیں جو اس کی کتابوں میں تحریر تھیں۔ شام ہی میں آپ نے روم کے عالموں، پادریوں اور انشا پردازوں کو دیکھا۔ وہیں آپ ﷺ کو معلوم ہوا کہ آتش پرست ایرانی ان کے دشمن ہیں اور ان کی گھات میں لگے ہوئے ہیں۔ درمنگھم نے جو کچھ کہا وہ اس کے تخیل کی ایجاد ہے اور اس کی اپنی جدت پسندی ہے جسے اس نے فرانسیسی جامہ پہنا دیا۔ بحیرا راہب کے واقعہ کی علیت صرف اتنی ہے جو ہم نے بیان کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اس کے واقعات کو ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی، کیونکہ وہ اہل کلیسا کی افتراء پردازیوں سے واقف ہے۔

جب محمد ﷺ اپنے چچا کے ساتھ تجارت کے سلسلہ میں شام گئے تو جیسا کہ بتایا جا چکا ہے آپ ﷺ بچے تھے اور ابو طالب نے آپ ﷺ کو سفر ختم کرنے سے پیشتر ہی واپس کر دیا تھا۔ اس کے بعد آپ ﷺ حضرت خدیجہ کی تجارت کے سلسلہ میں صرف ایک مرتبہ شام گئے، اس وقت آپ ﷺ جوان تھے مگر دونوں مرتبہ آپ بصریٰ کی منڈی سے آگے نہیں بڑھے۔

وہ قافلے جو شام جاتے تھے مدین سے نہیں گذرا کرتے تھے جو سر زمین سینا میں واقع ہے۔ یہ تجارتی قافلے عربوں یا بدویوں سے راستہ کے مقامات کا حال اور اس کی تاریخ معلوم کرنے کے لیے اپنا وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ ان عرب تاجروں کے بارے میں یہ بھی ثابت نہیں ہوا کہ وہ عیسائی پادریوں سے ملا کرتے تھے اور ان کے مذہب اور کتابوں

پر بحث کرتے تھے، ایسی صورت میں درمنگھم کو کیسے پتہ چل گیا کہ آپ ﷺ تجارت کے مشغلہ میں قوموں کے حالات، ان کی تاریخ، مذاہب اور کتابوں کی تلاش و تحقیق میں مصروف رہتے تھے، نیز ان کے مذہبی رہنماؤں سے ملتے اور بحث کرتے تھے جیسا کہ دور حاضر کے اہل علم مورخین اور سیاسی جاسوس کیا کرتے ہیں۔ درمنگھم نے یہ بات اس لیے بتائی ہے کہ قرآن کریم میں پیغمبروں کے جو قصے بیان کیے گئے ہیں اور ایرانیوں پر رومیوں کے غلبہ کی جو پیشین گوئی کی گئی ہے اس کی کوئی توجیہ اس کے سمجھ میں نہیں آئی۔ عنقریب ہم اس کی توجیہ و تعلیل اور تحلیل و ترکیب کا تار پود بکھیر دیں گے۔

۸۔ عربوں کی محفلیں:

اس کے بعد درمنگھم نے بیان کیا ہے کہ عرب بالخصوص اہل مکہ تجارت یا جنگ سے فارغ ہونے کے بعد زیادہ وقت شراب نوشی اور عیش و عشرت میں صرف کرتے تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ آپ ﷺ انہیں دیکھتے تھے مگر اس میں شریک نہیں ہوتے تھے، اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ آپ ﷺ فقیر اور تنگدست تھے بلکہ بقول درمنگھم "لیکن محمد ﷺ کا دل چاہتا تھا کہ وہ چشم عبرت سے سب کچھ دیکھیں، سب کچھ سنیں اور سب کچھ معلوم کریں۔ چونکہ آپ اس تعلیم سے محروم تھے جو آپ ﷺ کے ساتھیوں کو حاصل تھی اس لیے آپ کو معلومات حاصل کرنے کا بہت شوق ہو گیا تھا۔ وہ عظیم الشان شخصیت جس کے آثار بعد میں ظاہر ہوئے اور جس کا اقتدار آج بھی دنیا میں قائم ہے کمال کے شوق میں اس لہو و لعب سے متنفر تھی جو اہل مکہ کا مطمح نظر تھا۔ آپ تو اس نور کی تلاش میں تھے جو تمام مظاہر حیات میں ان لوگوں کے لیے عیاں ہے جو ان مظاہر حیات سے اصل حقیقت کا پتہ چلانا چاہتے ہوں جس کی خدا رسیدہ الہامی شخصیتوں نے خبر دی تھی۔"

یہ بات بھی درمنگھم کے تخیل کی ایجاد ہے۔ آپ کو ہرگز یہ پسند نہیں تھا کہ آپ ﷺ اپنی قوم کے فاسقوں کا فسق و فجور دیکھیں یا سنیں یا ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کریں صحیح طور پر صرف یہ ثابت ہے کہ آپ ﷺ صرف دو مرتبہ ان کی محفل شبینہ میں شریک ہوئے تھے مگر دونوں مرتبہ خدا نے آپ پر نیند غالب کر دی۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور آپ ﷺ نہ کچھ دیکھ سکے نہ سن سکے۔ اس تفصیل سے

درمنگھم کی بیان کردہ توجیہ باطل ہوجاتی ہے۔ اس میں اگرچہ تعریف ہے لیکن اس تعریف میں دوفریب چھپے ہوئے ہیں (۱) کہ آپ کے قریشی ساتھی تعلیم یافتہ تھے کیونکہ ان کے والدین نے انہیں علم سکھایا تھا مگر آپ تعلیم سے محروم تھے اس لیے اس محرومی کی وجہ سے آپ کے اندر علم کی جستجو اور تلاش بڑھ گئی تھی (۲) اس محرومی کی وجہ سے آپ کو بہت شوق ہوگیا تھا کہ آپ اس نورحیات کو تلاش کریں جو تمام مظاہر جہاں میں جلوہ گر ہے تاکہ اصل حقیقت کو معلوم کریں۔ یہ ایک قسم کی تعریف ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ آپ کی وحی کی خاص توجیہ کی جائے لیکن اس توجیہ کو ہم عنقریب باطل کریں گے۔

۹۔ اولاد کی موت کا اثر:

درمنگھم نے نبی کریم ﷺ کے فرزندوں قاسم، طیب اور طاہر کا بھی ذکر کیا ہے اُسے ان کے وجود میں شک ہے۔ وہ کہتا ہے "آپ کی کنیت ابوالقاسم یہ ثابت نہیں کرتی ہے کہ آپ کا کوئی لڑکا اسی نام کا موجود تھا۔ اگر یہ ثابت ہوجائے کہ آپ کے لڑکے پیدا ہوئے تو وہ سب بچپن ہی میں فوت ہوگئے تھے۔" یہ محض وہم ہے حقیقت یہ ہے کہ آپ کا ایک لڑکا قاسم کے نام سے تھا اور اس کی وجہ سے آپ کی کینت ابوالقاسم ہوئی جو بچپن ہی میں فوت ہوگیا۔ ایک روایت یہ ہے کہ اس کی عمر اس قابل ہوگئی تھی کہ وہ گھوڑے پر سوار ہوسکتا تھا۔ یہ خبر متواتر ہے پھر آپ ﷺ کے ہاں ایک اور لڑکا پیدا ہوا جس کا نام آپ نے عبداللہ رکھا اور صحیح یہ ہے کہ طیب اور طاہر اس کے القاب تھے نہ یہ کہ وہ دو اور لڑکوں کے نام تھے جیسا کہ بیان کیا گیا ہے۔[1]

لیکن درمنگھم نے ان لڑکوں کی موت کی معمولی بات کو جن کے وجود میں خود اسے بھی شک ہے بتنگڑ بنادیا ہے اور اس پر ایک عجیب وغریب وہم کا قلعہ تعمیر کردیا ہے۔ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ چونکہ آپ اولاد کی محرومی کو برداشت نہیں کرسکے اس لیے آپ نے زید

---

[1] گزشتہ دونوں ایڈیشنوں میں غلطی سے یہ لکھ دیا گیا تھا کہ یہ دونوں قاسم کے لقب تھے بہرحال ان دونوں کی موت اور پھر ایک اور فرزند ابراہیم کے فوت ہوجانے کی مصلحت یہ تھی کہ اگر آپ ﷺ کا کوئی فرزند نرینہ زندہ رہتا تو لوگ آپ کی پرستش اور آپ کی اولاد کی پرستش کے فتنہ میں اس سے زیادہ مبتلا ہوتے جو آپ ﷺ کی دختر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد کے سلسلے میں رونما ہوا۔ (ع م)

بن حارث کو متبنی بنالیا تھا۔

آگے چل کر در منگھم کہتا ہے۔ "مؤرخ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس واقعہ پر بلکہ ان کی اولاد کے ان حادثات پر غور کرے جو محمد ﷺ کو پیش آئے۔ لا محالہ ان کا اثر آپ کی زندگی اور ذہنی خیالات پر ہوا تھا۔ یہ اثر اس لیے اور زیادہ مستحکم ہوا کہ آپ ﷺ امی تھے، اس کے باوجود مباحثے اور مناظرے آپ کو حوادث سے عبرت اور سبق لینے سے نہیں روک سکتے تھے۔ کیونکہ پر اہم حادثات جیسے کہ اولاد کی موت ہے آپ کے دل دماغ پر گہرا اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ ان واقعات نے کعبہ کے ان بتوں سے بھی بیزار کر دیا تھا جن کے آگے (حضرت) خدیجہ رضی اللہ عنہا چڑھاوے چڑھاتی تھیں وہ ہبل، لات، عزیٰ اور منات کے سامنے قربانیاں پیش کرتی تھیں تاکہ بے اولادی کے رنج سے چھٹکارا حاصل کریں مگر چڑھاوے اور قربانیوں سے کچھ حاصل نہیں ہوتا تھا۔"

بلاشک وشبہ واقعہ یہ ہے کہ عرب میں عیسائیت کے دباؤ سے جس کے دھارے شام، روم یمن اور حبش سے بہتے چلے آئے تھے، بت پرستی کی بنیادیں ہلنی شروع ہو گئیں۔ در منگھم نے ان لڑکوں کی موت کے واقعات کو جن کی پیدائش اس کے نزدیک مشتبہ ہے، بے حد طولانی کر دیا ہے۔ اُس نے اپنے دل سے یہ افسانہ تراشا ہے کہ حضرت خدیجہ نرینہ اولاد حاصل کرنے کے لیے بتوں کے لیے قربانیاں پیش کرتی تھیں پھر اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ ناکامی کی صورت میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہ اور ان کے شوہر محمد ﷺ کی عقیدت مسیحی خیالات کے زیر اثر متزلزل ہو گئی تھی۔ الغرض اس نفسیاتی تحلیل و تجزیہ سے وہ وحی محمدی کی توجیہہ کرنا چاہتا تھا۔ حق بات یہ ہے کہ آپ ﷺ نے زید کو اس وجہ سے متبنیٰ بنایا تھا کہ انہوں نے باپ اور چچا کے ساتھ رہنے پر آپ کی غلامی کو ترجیح دی تھی۔ ان کے باپ اور چچا مکہ آئے تھے تاکہ فدیہ دے کر انہیں لے جائیں۔ آپ نے فرمایا۔ "زید کو بلاؤ اور اسے اختیار دو اگر وہ تمہیں پسند کرے تو فدیہ کے بغیر لے جا سکتے ہو۔ چنانچہ زید بلائے گئے۔ انہوں نے اپنے چچا اور والد کو پہچان لیا۔ آپ نے فرمایا تم مجھے اور میرے سلوک کو اچھی طرح دیکھ چکے ہو، تمہیں اختیار ہے کہ تم میرے ساتھ رہو یا اپنے والد اور چچا کے ساتھ چلے جاؤ۔ زید نے جواب دیا میں آپ ﷺ کے مقابلے میں کسی کو پسند نہیں کرتا۔ آپ میرے باپ اور چچا کے مقام پر ہیں۔ ان دونوں نے کہا زید

افسوس ہے تو غلامی کو آزادی پر اور اپنے والد اور چچا اور تمام گھر والوں پر ترجیح دیتا ہے؟ زید نے کہا آپ ﷺ نے میرے ساتھ وہ کیا ہے کہ آپ کے مقابلے میں کسی کو پسند نہیں کرتا ہوں۔ جب رسول اللہ نے یہ بات دیکھی تو آپ ﷺ انہیں حجر میں خانہ کعبہ کے نزدیک لے گئے اور یہ فرمایا گواہ رہو کہ زید میرا بیٹا ہے، وہ میرا وارث ہوگا اور میں اس کا وراث ہوں گا۔ ان کے باپ اور والد نے جب دیکھا تو ان کا دل مطمئن ہو گیا۔ اس وقت سے وہ زید بن محمد کے نام سے پکارے جانے لگے یہاں تک کہ اسلام کا زمانہ شروع ہوا (ابن سعد وغیرہ نے سیرت ابن اسحاق میں اس طرح روایت کی ہے)۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ اپنے لڑکے یا کسی کی موت پر گھبراتے نہیں تھے بلکہ بے حد صابر تھے۔ قاسم کی موت کے بعد بھی حضرت خدیجہ اس بات سے ناامید نہیں ہوگئی تھی کہ خدا انہیں کوئی لڑکا نہیں دے گا۔ انہوں نے کبھی بتوں کے لیے قربانی نہیں کی۔ لات طائف میں ایک چٹان تھی جسے قبیلہ ثقیف پوجا کرتا تھا اور وہ قریش کا بت نہ تھا۔ عزی نخلہ کی زمین میں ایک درخت تھا جس کی قریش، کنانہ اور غطفان پرستش کرتے تھے۔ منات نیو یلال ہذیل اور خزائمہ کا بت تھا۔

درمنگھم نے اس زمانے میں بت پرستی کے کمزور ہونے کا ذکر کیا ہے۔ اس کی اصل وجہ اس کے خیال میں یہ ہے کہ عیسائیت پھیل چکی تھی۔ ایسی حالت میں اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ حضرت خدیجہ جو عربوں میں سے سب سے زیادہ ہوشمند اور سب سے زیادہ نیک فطرت اور مذہب ابراہیمی کے سب سے زیادہ قریب تھیں بتوں سے متنفر ہوتیں اور لڑکے کی امید میں نہ ان پر بھینٹ چڑھاتیں اور نہ قربانیاں کرتیں۔ اگر ان کی عقل و فطرت ان باتوں سے انہیں نہیں روک سکتی تھی تو ان کے شوہر محمد مصطفےٰ ﷺ کی شان کریمی کا تقاضہ یہ تھا کہ وہ انہیں اس بات سے منع کرتے کیونکہ جیسا کہ خود درمنگھم بھی معترف ہے کہ آپ ﷺ بچپن ہی سے بت پرستی کے دشمن تھے مگر خواہش کی پیروی میں انسان وہ بات بھی بھول جاتا ہے جو ناقابل فراموش ہوتی ہے۔

۱۰۔ غار میں گوشہ نشینی کے اسباب:

درمنگھم کہتا ہے کہ عرب میں عیسائیت کے پھیل جانے کی وجہ سے ایک قسم کی

نفسیاتی ذہنیت پیدا ہو گئی تھی جس کی طرف ان کا شوق بہت بڑھ گیا تھا اسے تحنث یا تحنف کہتے ہیں یعنی گوشہ نشینی کے ساتھ عبادت۔ اس کی یہ بات بے بنیاد نہیں ہے لیکن اس نے آگے چل کر اسے بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے وہ کہتا ہے۔

"آپ گوشہ نشینی میں اپنے دل کا سکون اور اطمینان حاصل کرتے تھے کیونکہ آپ ﷺ تنہا پسند تھے اور تنہائی کو معرفت حاصل کرنے اور کائنات کے راز معلوم کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے، اس لیے آپ ﷺ ہر رمضان میں پورے مہینے کوہ ابوقبس کے غار میں رہتے تھے اور تھوڑی سی خوراک پر جو آپ ﷺ کو پہنچادی جاتی تھی قناعت کرتے تھے۔ آپ ﷺ غار میں دنیا کے ہنگاموں سے دور، زندگی کی ہلچل سے دور غور و فکر اور عبادت میں طویل ایام گذار آتے تھے۔

میں اس کے جواب میں کہتا ہوں کہ محدثین کی روایات کے مطابق غار حرا میں خلوت آپ ﷺ کو اسی سال مرغوب ہوئی تھی جس سال آپ ﷺ پر وحی نازل ہوئی تھی۔ آپ ﷺ اپنی خوراک خود لے جاتے تھے کوئی مدد نہیں پہنچاتا تھا۔ ابن اسحاق نے جو یہ لکھا ہے کہ آپ ہر رمضان میں غار میں بیٹھتے تھے تو اس سے اس کا مقصد وہ زمانہ ہے جسے "فترۃ الوحی" کا زمانہ کہتے ہیں (جبکہ ابتدائی وحی کے بعد عارضی طور پر وحی نازل نہیں ہوئی تھی) اس کا ذکر عنقریب آئے گا۔ اس سے پہلے کسی سال یا کسی مہینے میں آپ ﷺ غار میں نہیں بیٹھے۔

در منگھم نے یہ کہا ہے "آپ ﷺ تنہائی کو معرفت حاصل کرنے اور کائنات کے راز معلوم کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔" یہ الفاظ اس نے اس لیے کہے کہ اسے یہ معلوم تھا کہ وہ اس شخصیت کا حال بیان کر رہا ہے جس کی جانب سے اس تنہائی کے بعد علم و معرفت اور اصلاح کے ساتھ ساتھ زمین اور آسمان کی نشانیوں پر غور و فکر کرنے کی ہدایت دی گئی ہے مگر آپ ﷺ کی طرف سے کوئی ایسی روایت منقول نہیں ہے کہ تنہائی میں آپ ﷺ کا یہی مقصد و مدعا تھا۔ حضرت ابو بکر، عثمان اور آپ ﷺ کے دونوں چچا حضرت حمزہ اور حضرت عباس اور نہ آپ ﷺ کے پروردہ چچازاد بھائی حضرت علی رضی اللہ عنہ اور نہ آپ ﷺ کے چہیتے غلام زید بن حارث رضی اللہ عنہم سے کوئی روایت اس قسم کی منقول ہے۔ اس کی پوری تحقیق آئندہ ابواب میں آئے گی۔

ان دس باتوں کا نتیجہ :

یہاں پہنچ کر درمنگھم ان دس اصولوں کے بعد اپنا مطلوبہ نتیجہ برآمد کرتا ہے۔ اب اس نے تخیلات کو بے لگام کر دیا ہے اور مہمیز دے کر سرپٹ دوڑا دیا ہے، چنانچہ اس کے خیالات کے گھوڑے گرد وغبار اڑاتے ہوئے بھاگے چلے جارہے ہیں۔ اس نے اپنے فرانسیسی شاعرانہ تخیلات کو پوری آزادی دی ہے کہ وہ غار میں (حضرت) محمد مصطفیٰ ﷺ کی جیسی چاہے تصویر کھینچے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ آپ ﷺ راتوں میں ستاروں کا نظارہ کیا کرتے تھے اور دن کے وقت آفتاب کا مشاہدہ کرتے تھے، بلند پہاڑ کی چوٹی پر صحرا اور بیابانوں، خیموں اور کنوؤں کو دیکھا کرتے تھے۔ اس نے یہ بھی فرض کیا ہے کہ چرواہے درختوں پر سے پتے جھوڑ جھوڑ کر اپنی بھیڑ بکریوں کو کھلایا کرتے تھے حالانکہ وہاں درخت نہیں ہوتے تھے بلکہ اس نے سمندروں کا ذکر بھی کیا ہے حالانکہ سمندر بہت دور تھا مگر اس نے سمندر کے پانی کو چیرنے والی کشتیوں کا ذکر نہیں کیا جو باد موافق کے ساتھ ساتھ اور باد مخالف کی صورت میں بھی جب کہ طوفان آتا ہو اور لہروں کا شور ہوتا ہو عجیب نظارہ پیش کرتی تھیں۔ ان سب چیزوں کا قرآن کریم میں ذکر آیا ہے۔ مگر محمد (ﷺ) نے اسے کوہ حرا سے نہیں دیکھا تھا۔ اس فرانسیسی مصنف نے شاعرانہ تخیلات کا کمال دکھایا ہے مگر حقیقت نگاری نہیں کی۔

درمنگھم ایسے موقع پر محمد (ﷺ) کی خیالی عکاسی اس طرح کرتا ہے: "صحرا کی تابستان راتوں میں ستارے بے حد روشن نظر آتے ہیں، اتنے روشن کہ انسان یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ وہ ان کے نور کی آواز سن رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دہکتی ہوئی آگ کے آتشین نغمے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ آسمان میں سمجھنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ کائنات کے بہت سے راز سربستہ ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پوری کائنات ایک راز سربستہ ہے مگر کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ انسان اپنی آنکھیں کھولے اور مشاہدہ کرے، اپنے کانوں کو تیز کرے تاکہ کچھ سنے۔ ایسی صورت میں ہی وہ ضرور حق کا مشاہدہ کر سکے گا اور لافانی کلمات کو سن سکے گا مگر لوگوں کی آنکھیں ہیں جو دیکھتی نہیں اور کان ہیں جو سنتے نہیں۔

"مگر محمد (ﷺ) کو یقین ہے کہ آپ ﷺ سن رہے ہیں اور دیکھ رہے ہیں۔ کیا

آسمان سے پرے کی آوازیں سننے کے لیے تمہیں اس چیز کے علاوہ اور کسی چیز کی ضرورت ہے کہ تمہارا سینہ پاک وصاف ہو، درد مند روح ہو اور دل نور ایمان سے معمور ہو۔

محمد (ﷺ) کو لوگوں کی دانائی پر شک ہے اس لیے وہ خالص صداقت کی تحقیق کرنا چاہتے ہیں جس کا آگے پیچھے باطل سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ ہو۔ آپ ﷺ حق کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے مگر صداقت آپ ﷺ کے چاروں طرف نظر نہیں آتی۔ قریش کا معاشرہ بھی درست نہیں ہے۔ سود خواروں کا سود۔ بدویوں کی لوٹ مار، رندوں کے کھیل کود، ان سب کا حق سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ کعبہ کو چاروں طرف سے گھیرنے والے اصنام صداقت کی نشانی نہیں ہیں۔ لمبی ٹھوڑی اور عطر سے مہکنے والا دیوتا ہبل بھی حق نہیں ہے۔

پھر حق کہاں ہے اور کیا ہے؟

محمد (ﷺ) غار حرا میں لگاتار کئی سال رمضان شریف کے مہینے میں بیٹھتے رہے یہاں تک کہ حق کی تلاش میں آپ اس قدر غور وفکر کرتے تھے کہ خود فراموشی کی حالت طاری ہو جاتی تھی۔ وہ کھانا کھانا بھول جاتے تھے۔ یہاں تک کہ دنیا کی ہر چیز کو فراموش کر دیتے تھے کیونکہ دنیا میں انہیں کہیں حق دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہاں بیٹھ کر آپ ﷺ اپنی کتاب دل کی ورق گردانی کرتے تھے تو لوگوں کے گوناگوں خیالات سے آپ کی بیزاری بڑھتی جاتی تھی۔ آپ ﷺ کو اس بات کی توقع نہیں تھی کہ پادریوں کے قصوں اور راہبوں کی کتابوں میں وہ حق مل سکے گا جس کی آپ ﷺ کو تلاش ہے بلکہ وہ حق اسی کائنات میں ہے جو آپ ﷺ کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ حق آسمان میں، ستاروں میں، ماہتاب میں اور آفتاب میں ہو سکتا ہے، تپتے ہوئے ریگستان میں مل سکتا ہے جبکہ آفتاب پورے آب وتاب کے ساتھ اس پر چمکا ہو یا جب چاند اور ستاروں کی ٹھنڈی کرنیں اسے اپنا تر و تازہ لباس پہنائیں، حق سمندر اور اس کی لہروں میں اور ہر اس چیز میں ہے جس کا تعلق نیچر اور فطرت سے ہے اور وہ وحدۃ الوجود میں شامل ہو جائے۔

"اس کائنات میں آپ ﷺ اعلیٰ حقیقت کی تلاش میں تھے۔ اپنی خلوت کی گھڑیوں میں سر بلند ہو کر کائنات سے مل جاتے تھے اور اس کے پردے چاک کر کے سربستہ راز سے واقف ہو گئے تھے۔"

اس کے بعد درمنگھم کہتا ہے اور تقریباً ۶۱۰ء میں آپ ﷺ کی ذہنی الجھنیں اپنی آخری حد کو پہنچ گئی تھیں۔ اس خیال محکم نے آپ ﷺ کے دل کو سخت پریشان کر دیا تھا کہ کسی بنیادی شے کی خود آپ میں اور آپ ﷺ کی قوم میں کمی ہے۔ سب لوگ اصل بنیادی شے کو بھول چکے ہیں اور ہر ایک نے اپنی قوم یا قبیلے کے بتوں کا سہارا لیا ہے۔ لوگ جنوں اور بھوتوں سے ڈرنے لگے ہیں مگر اعلیٰ حقیقت سے غافل ہیں۔ غالباً انہوں نے اس کا انکار نہیں کیا ہے مگر وہ اسے اس طرح فراموش کر چکے ہیں کہ ان کی روح مردہ ہو گئی ہے۔ بہر حال آپ ﷺ کا ذہن ان تمام خرافات اور ایسی تمام طاقتوں سے پاک وصاف ہو چکا تھا جو دوسروں کی طاقتوں کے آگے جھکتی ہیں۔ آپ ﷺ ہر اس چیز سے الگ تھے جو ذات واحد کا مظہر نہ ہو۔

آپ ﷺ کو معلوم تھا کہ شام اور مکہ کے عیسائیوں کا مذہب وحی الٰہی پر مبنی ہے اور ان کے علاوہ دوسری قوموں پر بھی خدا کی وحی نازل ہوئی تھی۔ انہوں نے حق کو پہچانا اور پیغمبروں سے امر حق کو سیکھا۔ آپ ﷺ کو یہ بھی معلوم تھا کہ جب لوگ گمراہ ہو جاتے ہیں تو آسمان کی طرف سے ان پر ایک پیغمبر آتا ہے جو انہیں سیدھا راستہ دکھا کر لازوال حقیقت کو یاد دلاتا ہے۔ وہ مذہب جسے انبیاء ہر زمانے میں پیش کرتے چلے آئے ہیں وہ ایک ہی مذہب ہے مگر جب لوگ اسی مذہب کو بگاڑ دیتے ہیں تو آسمان کی طرف سے ایک رسول آتا ہے جو ان کی کجروی کو دور کرتا ہے۔ اس وقت عرب قوم سخت گمراہی میں تھی۔ کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ خدا کی رحمت دوبارہ نمودار ہو اور حق کی طرف ان کی رہنمائی کرے؟

لوگوں سے آپ ﷺ کی کنارہ کشی بڑھتی گئی۔ غار حرا کی تنہائی میں آپ ﷺ گہری مسرت محسوس کرنے لگے اور تھوڑی خوراک پر کئی ہفتے گذارنے لگے۔ روزوں، شب بیداری اور ذہنی ورزش سے آپ ﷺ کی روح تیز اور روشن تر ہوتی گئی۔ آپ ﷺ دن رات خواب اور بیداری کو بھول گئے اور غار میں گھنٹوں سر جھکائے بیٹھے رہتے یا دھوپ میں آکر لیٹ جاتے یا پتھریلے ریگستان کے راستوں پر لمبے لمبے قدم مار کر چلتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ ﷺ پتھروں کے اندر آوازوں کو سن رہے ہیں جو پکار کر آپ ﷺ کی پیغمبری پر ایمان لا رہی ہیں۔

اس حالت میں آپ نے چھ مہینے گذارے۔ جب آپ ﷺ کو اپنی جان کا اندیشہ لاحق ہونے لگا تو آپ ﷺ نے چپکے سے حضرت خدیجہ سے اپنے اندیشوں کا ذکر کیا۔ انہوں نے اطمینان دلا کر کہا آپ ﷺ امین ہیں، جنات آپ ﷺ کے قریب نہیں آسکتے۔ ایک دن جب کہ آپ غار میں سو رہے تھے کہ ایک فرشتہ آیا اور کہنے لگا پڑھو۔ آپ ﷺ نے فرمایا "میں خواندہ نہیں ہوں"۔ اس طرح پہلی وحی اور نبوت کی ابتداء ہوئی۔

اس وقت آپ ﷺ کی ایک روحانی زندگی کا آغاز ہوتا ہے، اپنی زندگی جو نگاہوں اور عقل کو خیرہ کر دیتی ہے مگر یہ اللہ اور حق وانسانیت کے لیے بے لاگ قربانی کی زندگی تھی۔

تردید:

میں کہتا ہوں کہ درمنگھم کی مذکورہ بالا عبارت کا بیشتر حصہ غلط ہے، اگر صحیح بھی ہوتا تو جو کچھ اس نے استنباط کیا ہے وہ کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتا، مگر وحی محمدی ہر استنباط اور احتمال سے بالاتر ہے۔ اس فرانسیسی عالم نے کیسے جانا کہ "محمد (ﷺ) رات دن، خواب وبیداری کو بھول چکے تھے اور غار میں گھنٹوں سر جھکائے بیٹھے رہتے یا دھوپ میں آکر لیٹ جاتے تھے۔" اور "آپ ﷺ نے اس حالت میں چھ مہینے گذارے۔" اس نے یہ خبریں اس لیے گھڑی ہیں تاکہ اس سے یہ نتیجہ نکالے کہ آپ ﷺ کی عقل قابو میں نہیں تھی بلکہ ہوش وحواس جاتے رہتے تھے اور آپ ﷺ ہمیشہ خیالات کے سمندر میں غوطہ زن رہتے تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ کے اندر سے اعلیٰ قسم کی وحی پھوٹ نکلی اور وہ آپ ﷺ کی نظروں اور کانوں پر جلوہ گر ہوگئی۔

میں یہاں غار میں آپ ﷺ کی عبادت کے سلسلے میں صحیح ترین روایات نقل کرتا ہوں۔ یہ روایات وحی والے سال میں ماہ رمضان کی متعدد راتوں کے بارے میں ہیں، ان کے ذریعے اس کے شاعرانہ تخیلات اور اس کے نتائج کی تردید ہوگی۔ نیز اس کی ان خلط ملط کی ہوئی روایات کی غلط فہمیاں بھی دور ہو جائیں گی جو اس نے آئندہ باب میں وحی کے بارے میں تحریر کی ہیں۔ یہ وہ روایات ہیں جو امام بخاری اور مسلم دونوں نے اپنی کتابوں میں روایت کی ہیں۔ امام بخاری کی روایات کا اصل متن مع ترجمہ حسب ذیل ہے:

وحی کا آغاز:

حدثنا عبد الله بن یوسف قال اخبرنا مالك عن هشام بن عروۃ عن ابیه عن عائشه ام المومنین ان الحارث بن هشام سال رسول الله ﷺ فقال یا رسول الله کیف یاتیك الوحی فقال رسول الله ﷺ احیاناً یاتینی مثل صلصلة الجرس وهو اشدہ علیٰ فیفصم عنی وقد وعیت عنه ما قال۔ واحیاناً یتمثل لی الملك رجلا فیکلمنی فاعی مایقول۔ قالت عائشة رضی الله عنها ولقد رایته ینزل علیه الوحی فی الیوم الشدید البرد فیفصم عنه وان جبینه لیتفصد عرقا (بخاری ج باب کیف کان بدء الوحی)

امام بخاری نے اس بات کا بلکہ پوری کتاب کا آغاز اِنَّمَا الۡاَعۡمَالُ بِالنِّیَّات (اعمال کا اعتبار نیت ہی سے ہے) کی حدیث سے کیا ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں ہم سے عبد اللہ بن یوسف نے حدیث بیان کی ہے، انہیں مالک نے ہشام بن عروہ کے واسطہ سے خبر دی ہے اور انہوں نے اپنی والدہ کے ذریعہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا اے رسول اللہ! آپ پر وحی کیسے آتی ہے؟ [1] رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کبھی یہ گھنٹی [2] کی آواز کی

---

[1] وحی کے معنی عام ہیں۔ یہ لفظ لغوی معنی کی مناسبت کے ساتھ ساتھ خاص مخفی علم کی کئی صورتوں کے لئے مستعمل ہے۔ انہی میں سے یہ ہیں۔ (۱) سچے خواب (۲) دل میں کسی بات کا آجانا (۳) الہام (۴) فرشتہ کا پیغام لانا۔ وحی کے خاص معنی بھی ہیں اور وہ خطاب الٰہی کی تین قسموں میں سے ایک ہے۔ جیسا کہ باری تعالیٰ کا قول ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحۡيًا اَوۡ مِنۡ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوۡ يُرۡسِلَ رَسُوۡلًا فَيُوۡحِىَ بِاِذۡنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِىٌّ حَكِيۡمٌ ۝

(کسی فرد بشر کے لئے یہ (ممکن) نہیں ہے کہ اللہ اس سے کلام کرے سوا اس کے کہ وحی کے طور پر ہو یا پردے کے پیچھے ہو یا وہ کسی قاصد کو بھیجے جو اس کے حکم سے وہ وحی لائے جو وہ چاہے۔ درحقیقت خدا سربلند اور حکمت والا ہے۔) بخاری کی اس حدیث میں پہلی اور تیسری قسم بیان کی گئی ہے۔ دوسری قسم کی وحی پردے کے پیچھے خدا کا بلاواسطہ کلام کرنا ہے۔ ایسی وحی رسول کریم ﷺ کو شب معراج میں دی گئی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اس قسم کی وحی سے سرفراز کئے گئے تھے۔ ان تین قسموں کے علاوہ عام وحی کو خدا کا تشریعی کلام نہیں شمار کیا جا سکتا۔ سچے خواب اور الہام پیغمبروں کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی حاصل ہوتے ہیں۔

[2] اس تشبیہ سے مراد یہ ہے کہ وہ آواز لوہے کی گھنٹیوں کی طرح لگاتار اور مسلسل آواز تھی۔ مگر حرفوں سے مرکب کی کوئی بات نہیں تھی۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ فرشتے موجود ہوتے تھے۔ اگرچہ آواز سننے کے وقت آپ کسی کو نہیں دیکھتے تھے۔ یہ حالت سب سے زیادہ سخت اس لئے ہوا کرتی تھی کہ بقول ابن خلدون آپ جسمانی بشریت سے نکل کر فرشتوں کی روحانی حالت میں تبدیل ہوا کرتے تھے۔ دوسری صورت اس کے برعکس ہے۔ جبکہ فرشتہ خالص روحانیت سے جسمانی بشریت میں منتقل ہوتا تھا۔

طرح آتی ہے۔ یہ میرے لیے سب سے زیادہ سخت ہوتی ہے، جب فرشتہ جدا ہو جاتا ہے تو میں اس کی بات سمجھ چکا ہوتا ہے۔ کبھی فرشتہ [1] آدمی کی صورت میں نظر آتا ہے، وہ مجھ سے کلام کرتا ہے اور میں اس کا کلام سمجھ لیتا ہوں۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں نے سخت جاڑے میں آپ ﷺ پر وحی نازل ہوتے دیکھی ہے، جب وہ ختم ہوتی تھی تو آپ ﷺ کی پیشانی سے پسینہ بہتا تھا [2]۔ آغاز وحی کی دوسری روایت یہ ہے۔

یحییٰ بن بکیر نے ہم سے بیان کیا ہے کہ لیث نے عقیل وابن ہشاب وعروۃ ابن الزبیر کے واسطہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ ام المومنین نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ پر وحی کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ آپ ﷺ نیند میں سچے خواب دیکھتے تھے [3] جو خواب بھی آپ دیکھتے وہ صبح کی روشنی کی طرح صحیح ہوتے، پھر آپ ﷺ کو تنہائی مرغوب ہو گئی۔ چنانچہ آپ غار حرا میں تنہا مسلسل کئی دن اور کئی رات عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ آپ اپنا کھانا خود ساتھ لے جاتے تھے جب وہ ختم ہو جاتا تھا تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہ کے پاس واپس آکر دوبارہ کھانا لے جاتے یہاں تک کہ غار میں حق [4] آپ پر

---

[1] فرشتہ آدمی کی صورت میں اس وجہ سے نمودار ہو سکتا ہے کہ وہ عقل اور صاحب ارادہ روح ہے۔ وہ مادہ میں تصرف کرنے کی طاقت رکھتا ہے اور مادہ کی جو صورت چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ موجودہ زمانے کی کیمسٹری نے اس تصرف کو ہمارے تصور کے زیادہ قریب پہنچا دیا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا ہے کہ ہر مادہ کثافت سے لطافت کی طرف حرارت کی قوت سے منتقل ہو سکتا ہے۔ سب حرارتوں سے زیادہ طاقتور بجلی کی حرارت ہے۔ لیکن فرشتہ بجلی میں بھی اپنی مرضی کے مطابق تصرف کر سکتا ہے۔ اس مفہوم کی تشریح ہم نے آیت وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ (۷:۱۴۳) کی تفسیر میں بیان کی ہے۔ (دیکھو تفسیر المنار جلد ۹ صفحہ ۱۶۷: ۲۶۱)

[2] علامہ ابن القیم زاد المعاد میں فرماتے ہیں کہ یہ شدت اس درجہ ہوتی تھی کہ اگر وحی کے وقت آپ سوار ہوتے تھے تو سواری اس کے بوجھ سے بیٹھ جاتی تھی۔ ایک مرتبہ وحی اس وقت نازل ہوئی جب آپ کا زانو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے زانو پر تھا۔ انہیں وہ اتنا بھاری معلوم ہوا کہ قریب تھا کہ وہ بوجھ سے پھٹ جائے۔

[3] عام طور پر خواب یونہی بے ہودہ سے ہوتے ہیں اور سونے والے کے خیالات کا عکس ہوتے ہیں۔ مگر سچے خواب صلاحیت پسند طبیعت کے لئے ایک قسم کا انکشاف حق ہے۔ جو سوتے وقت جبکہ ذہن صاف اور محسوسات وافکار سے دور ہوتا ہے رونما ہوتے ہیں۔ تشریعی وحی سے پہلے نبیوں کو خواب اس لئے دکھائی دیتے تھے کہ ان کا نفس خدائی پیغام کو قبول کرنے کے لئے اچھی طرح آمادہ ہو جائے۔

[4] صحیحین کی اس روایت سے ثابت ہے کہ معاملہ بیداری میں رونما ہوا۔ سیرت ابن ہشام میں ابن اسحاق سے روایت ہے کہ جبرائیل سوتے میں آئے تھے۔ یہ عبید بن عمیر کی مرسل حدیث ہے۔ وہ ثقہ صحابی ہیں۔ مگر صحیحین کی مرفوع روایت مستند ہے۔ بعض محدثین نے دونوں روایات میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ آپ نے فرشتہ کو پہلے خواب میں دیکھا تھا۔ اس نے آپ ﷺ سے پڑھوایا۔ پھر اسے بیداری میں دیکھا۔ لیکن اگر یہ بات خواب میں

ظاہر ہو گیا یعنی ایک فرشتہ آیا اور کہنے لگا "پڑھو" آپ نے فرمایا میں خواندہ نہیں ہوں، آپ ﷺ کا بیان ہے کہ فرشتے نے مجھے پکڑ کر زور سے بھینچا[1] یہاں تک کہ میں ہلکان ہو گیا پھر چھوڑ کر کہنے لگا اقراء "پڑھو" میں نے کہا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا اس پر دوبارہ اس نے مجھے پکڑ کر بھینچا یہاں تک کہ میں تھک گیا۔ پھر مجھے چھوڑ کر کہنے لگا اقراء[2] (پڑھو) میں نے کہا میں پڑھنا نہیں جانتا۔ اس پر اس نے مجھے تیسری بار پکڑ کر بھینچا۔ اور مجھے الگ کر کے کہنے لگا۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَۚ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍۚ۝ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُۙ۝ [3]

"اپنے اس پروردگار کے نام سے پڑھو جس نے پیدا کیا۔ جس نے انسانوں کو منجمد خون پھٹکی سے پیدا کیا۔ تم پڑھو تمہارا پروردگار بہت کرم والا ہے۔"

آپ ﷺ اس واقعہ کے بعد دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور فرمایا مجھے کمبل اڑھاؤ۔ آپ ﷺ کو کمبل اوڑھا دیا گیا۔ جب آپ ﷺ کی دہشت دور ہوئی تو آپ ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو تمام واقعہ بتایا اور فرمایا مجھے اپنے متعلق خوف لاحق ہو گیا ہے۔[4] حضرت خدیجہ رضی اللہ

پیش آتی تو بیداری کے بعد آپ ﷺ کا یہ خوف اور دہشت باقی نہ رہتی اور آپ ﷺ دھڑکتے دل کے ساتھ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس نہ جاتے۔

[1] آپ ﷺ کو بھینچنے میں مصلحت یہ تھی کہ رسول کریم ﷺ کی روحانیت کو تقویت پہنچائی جائے تاکہ آپ ﷺ فرشتوں سے تعلقات رکھ سکیں اور ان کی باتیں سمجھ سکیں۔

[2] اس آیت میں پڑھنے کا حکم تکوینی ہے نہ کہ تکلیفی یعنی فرمایا "پڑھنے والا بن جاؤ۔" اس لئے تیسری مرتبہ فرمایا "اقراء بسم ربک" یعنی خدا کے نام سے اس کی جانب سے اور محض اس کی قدرت کی بدولت نہ کہ اپنی ذاتی قابلیت اور استعداد سے پڑھنے کے قابل بن جاؤ۔ کیونکہ خدا خوب جانتا ہے کہ آپ ﷺ امی ہیں اور اپنی قابلیت اور ارادہ سے پڑھ نہیں سکتے۔ مگر چونکہ خدا کی مرضی یہی ہے۔ وہ خدا جس نے انسان کو منجمد خون سے پیدا کیا اور اسے ایسا مکمل انسان بنایا کہ وہ دیکھتا، سنتا اور سمجھتا ہے۔ وہی خدا یہ چاہتا ہے کہ آپ پڑھنا لکھنا سیکھ جائیں۔ تاکہ جو وحی خدا کی پاس سے آئے اسے لوگوں کو پڑھ کر سنائیں۔

[3] یہاں آیت مختصر ہے باب التفسیر میں: "الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِۙ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْؕ۝" کا اضافہ کیا گیا ہے۔

[4] اس سلسلے میں علماء کا اختلاف ہے کہ آپ ﷺ کو کسی چیز کا خوف لاحق ہو گیا تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ جنوں کا اندیشہ تھا اور یہ کہ جو آپ ﷺ نے دیکھا، وہ کہیں جنات میں سے نہ ہو۔ مگر قاضی ابو بکر بن عربی نے اس کا انکار کیا ہے اور تردید کی ہے۔ حافظ ابن حجر بھی اس کے موافق ہیں۔ مگر وہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث متعدد طریقوں سے منقول ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے جواب سے یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ وحی کے ساتھ ساتھ نبی کو اس بات کا قطعی علم ہوتا ہے کہ یہ خدائی وحی ہے اور اس کو پیش

عنہانے فرمایا ہرگز نہیں۔ خدا آپ ﷺ کو رسوا نہیں کرے گا کیونکہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، بے کسوں کا بار اٹھاتے ہیں تہی دستوں کی مدد کرتے ہیں، مہمان نواز ہیں اور لوگوں کی مصیبتوں میں کام آتے ہیں۔

بعد ازاں حضرت خدیجہ آپ ﷺ کو ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبد العزی کی پاس لے گئیں جو ان کے چچازاد بھائی تھے۔ وہ جاہلیت میں عیسائی ہو گئے تھے اور عبرانی خط میں لکھا کرتے تھے۔ انجیل کو بھی عبرانی میں لکھتے تھے (بخاری کے باب التفسیر میں ہے کہ وہ انجیل کو عربی میں لکھتے تھے، دونوں روایات درست ہیں کیونکہ وہ دونوں زبانیں جانتے تھے) وہ بہت بوڑھے اور اندھے ہو گئے تھے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہانے ان سے کہا اے میرے پیارے بھائی! ذرا اپنے بھتیجے کا قصہ سنو۔ ورقہ نے آپ ﷺ سے کہا اے میرے بھتیجے! کیا بات ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ دیکھا تھا سنا دیا۔ ورقہ نے کہا یہی وہ ناموس وحی کا فرشتہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ہے جو حضرت موسیٰ کے پاس اللہ بھیجا کرتا تھا۔ ■ کاش میں اس وقت تک زندہ رہتا جب تمہاری قوم تمہیں نکال دے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا وہ مجھے نکال دیں گے؟ اس نے کہا ہاں جو کوئی بھی وہ پیغام لایا جیسا پیغام تم لائے ہو تو اس کے ساتھ دشمنی کی گئی۔ مگر میں تمہارے زمانے تک زندہ رہا تو میں تمہاری پوری مدد کروں گا۔ اس واقعہ کے بعد ورقہ مر گئے۔ [2]

کرنے والا فرشتہ ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ پیغمبر کو یہ بات اس وقت معلوم ہو سکتی ہے جب کہ فرشتہ اپنا تعارف کرائے۔ مگر اس وقت فرشتہ صرف اس لئے نمودار ہوا تھا کہ آپ ﷺ اس سے مانوس ہو جائیں اور احکام کی وحی قبول کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ ایسے موقع پر پڑھنے کا حکم تکوینی تھا نہ کہ تکلیفی (کیونکہ آپ ﷺ پڑھنا نہیں جانتے تھے) اس لئے پڑھنے کی تکلیف دینا ناقابل برداشت ہوتا۔ بعض نے کہا ہے کہ آپ ﷺ کو موت اور ہلاکت کا اندیشہ تھا۔ یہ زیادہ قرین قیاس ہے۔ ان کے علاوہ ان کی تشریح میں اور بھی اقوال ہیں مگر تکلف سے خالی نہیں ہیں۔ بہر حال اس روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس فرشتہ کو دیکھنے کے بعد آپ ﷺ نہیں سمجھ سکے کہ آپ ﷺ پیغمبر ہو گئے ہیں اور نہ آپ ﷺ کو یہ معلوم ہو سکا کہ جسے آپ ﷺ نے دیکھا ہے وہ وحی کا فرشتہ جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ ورقہ کے واقعہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

■ بعض روایات میں ناموس عیسیٰ ہے۔ ابو نعیم کی دلائل النبوۃ میں ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پہلے تنہا ورقہ کے پاس گئیں اور انہیں سب ماجرہ سنایا۔ صحیحین کی روایت کا اندازہ بھی بتاتا ہے کہ وہ پہلے گئیں اور ورقہ سے گفتگو کرنے کے بعد رسول اکرم ﷺ کو ساتھ لے گئیں۔

[2] سیرت ابن اسحاق وغیرہ میں ہے کہ ورقہ، بلال کے پاس سے گذرا، جب انہیں سزا دی جا رہی تھی۔ اس روایت کا منشاء یہ ہے کہ انہوں نے بعثت اور مسلمانوں کی تکلیف کا زمانہ دیکھا تھا۔ تاہم مستند روایت وہی ہے جو صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ ورقہ اس واقعہ کے تھوڑی دیر بعد فوت ہو گیا۔

اور وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا:[1]

ابن شہاب کہتے ہیں کہ مجھے ابو سلمہ بن عبد الرحمن نے بیان کیا کہ جابر بن عبد اللہ انصاری نے سلسلہ وحی منقطع ہو جانے کے واقعہ کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "ایک دفعہ میں جا رہا تھا کہ دفعتاً آسمان سے ایک آواز سنائی دی۔ میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا کہ وہی فرشتہ جو غار حرا میں میرے پاس آیا تھا آسمان و زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں اس سے مرعوب ہو گیا اور (گھر) لوٹ کر میں نے کہا مجھے کمبل اوڑھاؤ اسی وقت خدا نے یہ وحی نازل کی یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ۝ وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ۝ وَ ثِیَابَكَ فَطَهِّرْ۝ وَ الرُّجْزَ فَاهْجُرْ۝۔ اس کے بعد وحی کا سلسلہ لگاتار جاری رہا۔[2]

میں کہتا ہوں کہ بخاری نے سورہ مدثر کی تفسیر میں کئی سلسلوں سے یہ حدیث بیان کی ہے۔ ایک روایت میں مذکور ہے کہ اس سورت کی ابتدائی آیتیں سب سے پہلے وحی میں اور ایک دوسری روایت میں ہے۔ جیسا کہ یہاں بیان کیا گیا ہے کہ یہ وحی منقطع ہونے کے

---

[1] وحی تین سال تک منقطع رہی۔ یعنی اس واقعہ کے تین سال بعد سورۃ المدثر نازل ہوئی۔ جس میں لوگوں کو عذاب الٰہی سے ڈرانے کا حکم دیا گیا تھا۔

[2] یعنی تبلیغ کے پورے بیس سال تک وحی کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن وہ حسب ضرورت تھوڑی تھوڑی نازل ہوئی تھی۔ کبھی کوئی پوری سورۃ ایک مرتبہ اترتی تھی، کبھی متفرق آیات کا نزول ہوتا تھا۔ کبھی تھوڑے عرصے کے لئے وحی منقطع ہو جاتی تھی۔ جیسا کہ سورۃ والضحیٰ کے شان نزول میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ بات درمنثم نہیں سمجھ سکا۔ اس لئے خیال کر بیٹھا کہ یہ سورہ وحی منقطع ہونے کے بعد سب سے پہلے نازل ہوئی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس سے پہلے کئی سورتیں نازل ہو چکی تھیں۔ اس سورت کا شان نزول شیخین کی روایت میں جندب بن سفیان کی حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی طبیعت ایک مرتبہ ناساز ہوئی۔ اس لئے آپ ﷺ دو یا تین رات (تہجد اور تلاوت کے لئے) نہیں بیدار ہو سکے۔ اس پر ایک عورت نے آپ ﷺ سے کہا "اے محمد! (ﷺ) میرا خیال ہے کہ تمہارے شیطان نے تمہیں چھوڑ دیا ہے کیونکہ میں نے اسے دو یا تین رات سے تمہارے قریب نہیں دیکھا ہے۔" اس پر خداوند تعالیٰ نے یہ سورۃ نازل کی۔ یہ عورت ام جمیل بنت ابی سفیان ابولہب کی بیوی تھی۔ جیسا کہ حاکم نے زید ابن ارقم سے روایت کیا ہے۔ یہ واقعہ سورۃ تبت یدا ابی لہب کے نزول کے بعد کا ہے۔ ابن جریر نے دو مرسل سلسلوں سے روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آنے میں دیر کر دی تو آپ ﷺ بہت پریشان ہوئے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا میرا خیال ہے کہ آپ کا پروردگار آپ سے ناراض ہو گیا ہے۔ اسی وجہ سے آپ ﷺ پریشان ہیں۔" اس پر یہ سورۃ نازل ہوئی۔ مگر شیخین کی مذکورہ بالا روایت کے مقابلہ میں اس مرسل روایت کی (جس کے درمیان سلسلہ روایت منقطع ہو گیا ہے) کوئی حقیقت نہیں ہے تاہم حافظ ابن حجر نے دونوں میں تطبیق کی کوشش کی ہے اور کہا ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے یہ بات ہمدردی کے طور پر کہی تھی اور ام جمیل نے اسے طنز و طعن کے طور پر کہا تھا۔

بعد کی آیات ہیں۔ اس سلسلے میں ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: "میں اس قدر خوفزدہ ہو گیا تھا کہ زمین پر گر پڑا۔"

محدثین قرآن کی پہلی وحی کے سلسلے میں اسی حدیث کو مستند مانتے ہیں۔ مشہور یہ ہے کہ سورہ مدثر کی پہلی آیات کے بعد پوری سورۃ مزمل نازل ہوئی۔ اس کے بعد سورۃ المدثر کی باقی آیات کا نزول ہوا۔ مجاہد کہتے ہیں کہ سب سے پہلے سورۃ ن والقلم نازل ہوئی، مگر یہ غلط ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ سب سے پہلے جو سورہ نازل ہوئی سورۃ الفاتحہ ہے۔ ہمارے شیخ (مفتی محمد عبدہ) نے اس کے فاتحہ الکتاب ہونے میں اس روایت پر اعتماد کیا ہے۔ ممکن ہے اس سے مراد یہ ہو کہ تمہیدی وحی کے بعد سب سے پہلے جو سورت نازل ہوئی وہ ہی سورۃ الفاتحہ تھی، پھر اجمالی طور پر تبلیغ کا حکم آیا اور اس کے بعد نماز فرض ہوئی اور سوۃ المزمل نازل ہوئی یا وہ دونوں ایک ہی وقت میں نازل ہوئیں۔ وحی منقطع ہونے کے بارے میں اور اس کے بعد پہلے کیا چیز نازل ہوئی ان سب کا بیان صفحات ۱۰۸، ۱۰۹ میں آئے گا۔

نفسیاتی وحی کی مغربی تعبیر:

میں نے وہ تمام بنیادی باتیں بیان کر دی ہیں جو ان مغربی علماء نے محمد ﷺ کی تاریخ، آپ کے نفسیاتی اور ذہنی رجحانات آپ ﷺ کی قوم اور وطن کے حالات سے استنباط کی ہیں۔ نیز یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ان کے تصور کے مطابق آپ ﷺ نے اپنے سفر گوشہ نشینی کی عبادت اور خلوت میں غور و فکر کے اثرات سے کہاں تک فائدہ اٹھایا ہے۔ اس کے بعد میں نے وحی کی کیفیت، اس کے آغاز و التواء، آپ ﷺ کی تبلیغ و دعوت حق اور وحی کی لگاتار سرگرمیوں کے بارے میں صحیح ترین احادیث پیش کی ہیں۔

اب میں بیان کروں گا کہ یہ لوگ کیسے ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ وحی مذکورہ اثرات کی وجہ سے خود محمد (ﷺ) کے دل و دماغ سے پھوٹی تھی۔ اسے عجیب و غریب طریقے سے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بہرحال ان کے بیان کے ساتھ ساتھ میں ان کی تمام باتوں کو عقلی، نقلی اور تاریخی دلائل کے ذریعے بے بنیاد ثابت کروں گا۔

۱۔ یہ لوگ کہتے ہیں محمد ﷺ کی مادی عقل نے یا ہمارے زمانے کی اصطلاح میں 'عقل باطن' نے اپنے ذاتی نور سے معلوم کر لیا کہ بت پرستی باطل ہے جیسا کہ دوسری قوموں کے افراد نے بھی معلوم کر لیا تھا، ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

۲۔ آپ ﷺ کی پاکیزہ فطرت سود خوری کی ذریعے سرمایہ داری اور جوئے بازی سے نفرت کرتی تھی، ہم اسے بھی تسلیم کرتے ہیں۔

۳۔ "آپ ﷺ کی غریبی اور آپ ﷺ کے چچا کی تنگ دستی، عربوں کی لذت کوشی، شراب نوشی اور رقص و سرور کی محفلوں سے لطف اندوز ہونے میں حائل رہی۔"

ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ بات صحیح ہے مگر آپ ﷺ نے اس راہ سے ازراہ حقارت گریز کیا تھا نہ کہ مجبوری سے۔

۴۔ "آپ ﷺ بہت سوچتے رہے کہ کسی طرح انہیں ناپسندیدہ شرک سے نکالیں اور انہیں فحش اور بری باتوں سے پاک وصاف کریں"۔ خیر کوئی حرج نہیں۔

۵۔ "آپ ﷺ نے اپنے سفروں سے بہت فائدہ اٹھایا۔ دوران سفر میں اور خود مکہ معظمہ میں عیسائیوں کے ذریعے آپ ﷺ کو بنو اسرائیل کے ان پیغمبروں کے بارے میں بہت معلومات حاصل ہوئیں جنہوں نے انہیں اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لا کھڑا کیا تھا۔"

یہ بات ہمارے ہاں ثابت نہیں ہے تاہم کوئی نقصان نہیں ہے۔

۶۔ "آپ ﷺ کی عقل نے سب کی سب معلومات کو تسلیم نہیں کیا جیسے کہ حضرت مسیح اور ان کی والدہ کی الوہیت کے عقیدہ سے عیسائیت بھی بت پرستی سے آلودہ ہو گئی تھی دوسری کئی خرابیاں بھی ان میں پیدا ہو گئی تھی۔"

ہمارے خیال میں دعوئے پہلے دعوے پر مبنی ہے یہ معقول ہے مگر ہمارے ہاں ثابت نہیں ہے۔

۷۔ "آپ ﷺ نے سنا تھا کہ اللہ تعالیٰ گزشتہ پیغمبروں کی طرح حجاز میں بھی ایک عرب پیغمبر بھیجے گا جس کی حضرت عیسیٰ مسیح وغیرہ پیغمبروں نے بشارت دی تھی۔ یہ خیال آپ ﷺ کے دماغ میں ذہن نشین ہو گیا تھا اس لیے آپ متوقع تھے کہ یہ پیغمبر آپ ﷺ ہوں گے جس کے ظہور کا وقت آچکا ہے"۔ یہ نتیجہ گذشتہ باتوں سے نکالا گیا

ہے۔ اور صحیح نہیں ہے آگے چل کر اس کی تردید کی جائے گی۔

۸۔ ان سب باتوں سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ اس مقصد کے لیے آپ ﷺ غار حرا کی تنہائی میں خدا کی عبادت کی طرف متوجہ ہو گئے تھے، وہاں آپ ﷺ کا ایمان اور مستحکم ہوا اور آپ ﷺ کا ضمیر سربلند ہوا۔ اس طرح آپ ﷺ کا دائرہ فکر وسیع اور آپ کے نور بصیرت میں اضافہ ہوا۔ آپ ﷺ کی وسیع عقل کو آسمانوں اور زمین کے ممالک میں کھلی نشانیاں ملیں جو کائنات کے خالق اور نظام موجودات کے راز سربستہ کی توحید کو ثابت کرتی تھیں۔ اس طریقہ سے آپ ﷺ میں یہ صلاحیت پیدا ہوئی کہ آپ عوام کی رہنمائی کریں اور انہیں اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لے آئیں۔ آپ ہمیشہ غور وفکر کرتے رہے۔ بے چین اور پریشان ہو کر امید وبیم کی گردش میں رہے یہاں تک کہ آپ کو یقین ہو گیا کہ آپ ہی وہ پیغمبر ہیں جس کا مدتوں سے انتظار کیا جا رہا تھا اور جسے خداوند تعالیٰ انسانیت کی رہنمائی کے لیے بھیجنے والا ہے۔ یہ یقین محکم پہلے خواب میں جلوہ گر ہوا پھر یہ اتنا مستحکم ہوتا گیا کہ آپ کو یہ دکھائی دینے لگا کہ فرشتہ بیداری کی حالت میں وحی پیش کر رہا ہے۔

اس وحی میں جو معلومات پیش کی گئیں ہیں ان کا سرچشمہ ان لوگوں کے خیال کے مطابق وہی چیزیں ہیں جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں تاہم وہ کہتے ہیں کہ آپ نے اپنی عقل وفکر کی رہنمائی میں غلط اور صحیح معلومات میں تمیز ضرور کی تھی لیکن آپ خود ان معلومات کو آسمانی خیال کرتے تھے۔ وہ اس طرح کہ خدا خالق ناموس اکبر کے ذریعہ جو وحی کا فرشتہ جبریل علیہ السلام ہیں آپ سے مخاطب ہے، یہی فرشتہ حضرت موسیٰ بن عمران، حضرت عیسیٰ بن مریم اور دوسرے پیغمبروں پر بھی نازل ہوا کرتا تھا۔

ایک مصری ملحد کہتا ہے کہ یونانی فلسفی سولن نے اپنی قوم کے لیے قوانین اور شریعت بنائی تھی لہٰذا عقلی طور پر یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ محمد (ﷺ) بھی ایک شریعت لے کر آئے، میں اس خیال کی خرابی کو بھی واضح کروں گا۔

نفسیاتی وحی کی تردید:

ا۔ جن باتوں سے ان لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے، ان میں اکثر خیالی اور بے بنیاد دعوے

ہیں، تاریخ کے مسلمہ واقعات نہیں ہیں، جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ جب یہ سب باتیں غلط ہیں تو اس سے نتیجہ نکالنا بھی درست نہیں ہے۔

مثلاً یہ لوگ کہتے ہیں کہ محمد ﷺ نے شام کے عیسائیوں سے سنا تھا کہ ایرانی رومیوں پر غالب آگئے ہیں۔ یہ اس لیے کہا گیا ہے تاکہ لوگوں کو اس وہم میں مبتلا کیا جائے کہ سورہ روم کے شروع میں رومیوں کی فتح کی جو پیشن گوئی کی گئی ہے وہ آپ نے شام کے عیسائیوں سے سنی ہوگی، مگر یہ بات تاریخ و عقل دونوں معیار سے غلط ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ایرانی رومیوں پر ۶۱۰ء میں غالب آئے تھے یعنی محمد (ﷺ) کے شام کے آخری سفر کے چودہ سال بعد اور آغاز وحی کے ایک سال پہلے یہ واقعہ رونما ہوا۔ پھر تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ اس زمانے میں بھی رومی سلطنت کی حالت اتنی خراب تھی کہ کسی کو یہ توقع نہ تھی کہ وہ دوبارہ حملہ کر کے ایران پر فتح حاصل کر سکے گی۔ چنانچہ خود اہل مکہ اس پیشین گوئی کا مذاق اڑاتے تھے، اس لیے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ان میں سے ایک آدمی سے اس پر شرط باندھی جس کی رسول اکرم ﷺ نے اجازت دے دی تھی اور وہ یہ شرط جیت گئے تھے۔

عقل کا فیصلہ بھی یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ جیسی بلند شخصیت کا انسان جس کی بلند شخصیت پر سب کا اتفاق ہے نا ممکن ہے کہ وہ پورے وثوق کے ساتھ اعلان کرے کہ رومیوں کو چند سال کے اندر ضرور ایرانیوں پر فتح حاصل ہوگی، ایسی بات نہ عقل کے ذریعے کہی جاسکتی ہے نہ نفسیاتی وحی کے ذریعے، جو غیر مستند خبروں پر مبنی ہوا کرتی ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ رومیوں کو ۶۲۲ء میں فتح ہوئی اور آپ کو وحی تبلیغ ۶۱۴ء میں ہوئی۔ لہٰذا اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ سورہ روم اسی سال نازل ہوئی تو یہ فتح آٹھ سال بعد ہوئی اور اگر یہ سورۃ دوسرے سال نازل ہوئی تو اس کی مدت سات سال کی ہے۔ تفسیر میں یہی مدت بتائی گئی ہے۔ بہر حال قرآن کریم میں بِضْعِ سِنِيْنَ (چند سال کے اندر) کا لفظ ہے، اس میں بضع کا اطلاق تین سے نو تک کے درمیان کی مدت پر ہوتا ہے۔

خدا تعالیٰ نے اس طرح خبر دی ہے:

الٓمّٓ ۞ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۞ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۞ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ

(رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہوگئے تاہم وہ اس شکست کے بعد چند سالوں میں غالب آجائیں گے)

اس میں چند سال کا لفظ تحریر کرنے اور سات یا آٹھ سال کے بعد نہ لکھنے میں یہ حکمت ہے کہ فتح اس جنگ کا نتیجہ ہوگی جو اس زمانے میں جاری رہے گی۔ بات دراصل یہ ہے کہ وحی و عبرت کی پیشن گوئیاں تاریخی کتب کے طرز پر نہیں ہوتی ہیں جو واقعات کو سنین کی حدود میں محدود کرتی ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن کریم میں مسلمانوں سے فتح مندی کے بکثرت وعدے کیے گئے ہیں۔ ان میں جو غیبی پیشین گوئیاں کی ہیں وہ برسوں اور مہینوں کے ذکر سے خالی ہیں۔ مگر سورہ روم کی یہ آیت بالکل نرالی طرز کی ہے (جس میں چند سالوں کا لفظ مذکور ہے۔)

ان کے باطل دعووں کی دوسری مثال یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ آپ اپنے سفر شام میں مدین کی سرزمین سے گذرے اور آپ نے وہاں کے لوگوں سے باتیں کیں۔ اس تذکرہ سے ان کا مقصد یہ ہے کہ وہ ثابت کریں کہ قرآن کریم میں مدین کے واقعات کی بنیاد یہی چیز ہے حالانکہ یہ خبر بالکل غلط ہے، جیسا کہ ہم اس کے تذکرہ کے موقع پر بیان کر چکے ہیں۔ اگر یہ صحیح بھی ہو تو یہ معقول بات نہیں ہے کہ محمد ﷺ نے راستہ میں گمنام اور غیر معتبر لوگوں سے جو غیر مصدق باتیں سنی تھیں انہیں اس وحی کی بنیاد بتائیں جس میں حضرت موسیٰ اور حضرت شعیب علیہ السلام کا قصہ بیان ہوا ہے۔

۲۔ اگر رسول اللہ ﷺ شام میں مسیحی علماء سے کچھ بھی استفادہ کرتے یا ان کی صحبت میں رہتے تو آپ ﷺ کے پیرو اس کا ذکر ضرور کرتے کیونکہ انہوں نے وہ سب کچھ جمع کر دیا ہے جس کا آپ ﷺ سے کچھ تعلق تھا۔ خواہ وہ صحیح ہو یا نہ ہو کیونکہ وہ صرف واقعات کی تدوین کیا کرتے تھے اور ان کی صحت اور عدم صحت کا معاملہ سلسلہ روایت (اسناد) اور راویوں کی سیرت کے علم پر موقوف رکھتے تھے۔

۳۔ اگر اس قسم کی کسی بات میں اصلیت ہوتی تو آپ کے مکہ کے دشمن اسے شبہات کی بنیاد قرار دے کر یہ کہتے کہ آپ ﷺ وحی کا دعویٰ کرتے ہیں مگر یہ سب باتیں آپ نے شام میں عیسائیوں سے سیکھی ہیں، جب کہ وہ اس سے کہیں کمزور اور بے ہودہ اعتراضات کیا کرتے تھے۔ اس سلسلہ کا ایک واقعہ یہ ہے کہ مکہ میں ایک رومی لوہار تلواریں

بنایا کرتا تھا۔ آپ اس کے پاس کھڑے ہو کر کبھی کبھی اس کا کام ملاحظہ فرماتے تھے، اس پر انہوں نے الزام لگایا کہ آپ اس سے کچھ سیکھتے ہیں اس کی تردید میں یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ

(ہمیں خوب معلوم ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اسے (نبی کو) ایک آدمی تعلیم دیتا ہے حالانکہ اس شخص کی زبان جسکی طرف یہ بات منسوب کرتے ہیں عجمی ہے اور یہ (قرآن کریم) صاف کھلی عربی زبان ہے۔)

۴۔ قرآن کریم میں بار ہا صاف طور پر یہ آیا ہے کہ وحی سے پہلے آپ رسولوں کے حالات اور قصوں سے قطعی طور پر ناواقف تھے مغربی علماء بھی ہمارے ہم خیال ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کسی پر جھوٹے الزام نہیں لگاتے تھے چہ جائیکہ وہ خدائے بزرگ و برتر کے مقابلے میں جھوٹ بولیں۔ جیسا کہ خود آپ ﷺ کے سب سے بڑے دشمن ابو جہل نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے، نیز وہ اس بارے میں بھی ہمارے ہم خیال ہیں کہ آپؐ کا خدائے عزوجل اور اس کی وحی پر پختہ ایمان اور عقیدہ تھا۔

اس سلسلے میں قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات اس کا بین ثبوت ہیں:

مدین میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حال بیان کرنے کے بعد سورۃ قصص میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ۝ (۲۸۔۴۵،۴۴)

(آپ مغربی جانب نہیں تھے جب ہم نے موسیٰ پر اس معاملہ کا (رسالت کا) فیصلہ کیا اور نہ تم اس کے دیکھنے والوں میں تھے (لیکن منکروں کا معاملہ یہ ہے) کہ ہم نے نسلوں پر نسلیں پیدا کیں تو ان پر مدتیں دراز ہو گئیں (اور ان میں سرکشی آگئی تھی) اور نہ آپ مدین میں رہتے تھے کہ انہیں ہماری آیتیں سناتے بلکہ ہمیں رسولوں کو بھیجتے ہیں۔)

سورہ ہود ۴۹ میں حضرت نوح کے قصہ کے بعد ارشاد ہے:

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝

(یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم وحی کی صورت میں تم پر نازل کر رہے ہیں اس سے پہلے نہ تم انہیں جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم جانتی تھی صبر کرو کیونکہ (اچھا) انجام پرہیز گاروں ہی کا ہے۔)

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کے بعد سورہ یوسف کے آخر میں ہے :

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ۝

(پارہ ۱۲ : ۱۰۲)

(یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم وحی کی صورت میں تم پر نازل کر رہے ہیں تم ان کے پاس نہیں تھے جب وہ اپنے کام میں متفق ہو گئے تھے اور مکر و فریب کر رہے تھے۔)

اور وہ ثبوت جسے اہل کتاب میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا وہ یہ آیت ہے جس میں حضرت ذکریا کے قصہ اور حضرت مریم کی پیدائش اور ان کی پرورش کا حال بیان کیا گیا تھا۔ اس سے یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ کہیں یہ ان کی کتابوں سے ماخوذ نہ ہو۔ اس لیے فرمادیا گیا ہے :

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ۝ (۳ : ۴۴)

(یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم وحی کی صورت میں تم پر نازل کر رہے ہیں تم ان کے پاس نہیں تھے جب وہ اپنے پانسے ڈال رہے تھے کہ کون مریم کی کفالت کرے گا اور نہ تم ان کے پاس تھے جب وہ جھگڑ رہے تھے۔)

"اقلام" قلم کی جمع ہے، اس کا اطلاق ان پانسوں پر ہے جنہیں وہ قرعہ اندازی کے لیے ڈالا کرتے تھے تاکہ باہمی جھگڑے اور اختلافات دور ہوں۔ ان کا اطلاق لکھنے کی قلموں پر بھی ہوتا ہے، اس صورت میں قرعہ اندازی قلموں کے ذریعے کاغذوں پر لکھ کر ہوتی تھی، جیسا کہ ہمارے زمانے کا طریقہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت مریم کی تربیت اور دیکھ بھال کے سلسلے میں لوگ جھگڑنے لگے تو قرعہ اندازی میں حضرت زکریا علیہ السلام کا نام نکلا جیسا کہ ان کے قصے کے شروع میں مذکور ہے۔

۵۔ کسی صحیح اور مرفوع حدیث میں یہ تحریر نہیں ہے کہ محمد ﷺ متوقع تھے کہ آپ ﷺ ہی وہ نبی منتظر ہوں گے جس کے بارے میں آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے بعض علماء یہود و نصاریٰ چرچا کیا کرتے تھے۔ اگر اس قسم کی کوئی روایت ہوتی تو محدثین ضرور

لکھتے کیونکہ وہ آپ کے سلسلے کی کسی بات کو لکھے بغیر نہیں چھوڑتے تھے، جیسا کہ انہوں نے امیہ بن ابی الصلت کے بارے میں اس قسم کی روایت بیان کی ہے بلکہ اس کے برعکس قرآن مجید میں صاف طور پر لکھا ہے کہ آپ ﷺ نبوت کے آرزومند نہیں تھے. جیسا کہ یہ آیت ہے:

وَمَا كُنتَ تَرْجُوٓا۟ أَن يُلْقَىٰٓ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبُ إِلَّا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ (القصص-۸۶)

(تمہیں امید نہ تھی کہ تمہاری طرف کتاب بھیجی جائے گی مگر یہ سب تمہارے پروردگار کی مہربانی سے ہوا۔)

یعنی یہ کتاب نازل فرما کر خدا نے تم پر اور تمام انسانوں پر اپنی رحمت کاملہ کا ثبوت دیا، اس میں تمہارے علم اور عمل کا کوئی دخل نہیں ہے، نہ تمہیں اس کی توقع تھی اور نہ آرزو۔ اس طرح یہ آیت وحی خداوندی پر چوتھی دلیل کی پہلی آیت کی تاکید اور تکملہ ہے۔

۶۔ وحی کے آغاز کی جو حدیث امام بخاری امام مسلم اور دوسرے محدثین نے روایت کی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ پہلی دفعہ فرشتہ کو دیکھ کر آپ ﷺ کو اپنی جان کا خوف ہو گیا تھا ایسی صورت میں دانشمند خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آپ ﷺ کو تسلی دینے اور خود مطمئن ہونے کا سوا اس کے اور کوئی ذریعہ نہ تھا کہ اپنے چچیرے، بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس جائیں جو عرب میں اس معاملہ میں سب سے بڑے عالم تھے اور عیسائی ہو چکے تھے انہوں نے یہود و نصاریٰ کی کتابیں مطالعہ کی تھیں۔

۷۔ اگر آپ ﷺ کو اپنی نبوت کی امید اور توقع تھی تو ان کے قول کے مطابق غار حرا میں خلوت و عبادت اور بیان کردہ اضطراب، جوش و خروش اور سوزش قلبی کے بعد جب آپ ﷺ کے اندر نبوت کی پوری صلاحیت پیدا ہو گئی تھی اور یہ امید جلوہ گر ہو گئی تھی کہ آپ ﷺ کی مراد پوری ہو رہی ہے۔ تو ایسی صورت میں آپ پر اس کامیابی کا اس قدر اثر ہوتا کہ آپ ﷺ کی ہنگامہ خیز طبیعت اور روشن فکر و تخیل اس وقت کوئی زبردست سورت یا کئی فصیح و بلیغ سورتیں تصنیف کرتا جن میں ایمان کے اصول، خدائی توحید، شرک اور بت پرستی کی بیخ کنی، پادریوں اور راہبوں کی شریعت، کفر و طغیان کے سرداروں کی دنیا اور آخرت میں ذلت و رسوائی اور خدائے رحمٰن کا بیٹا بنانے کا ذکر ہوتا جیسا

کہ مفصل سورتوں میں بالخصوص (۱) ق والقرآن المجید۔(۲) والذاریات (۳) الطور (۴) الجمعہ (۵) القمر (۶) الحاقہ (۷) النباء میں ہے یا اس قسم کا بیان متوسط سورتوں میں بھی ہے جو دلائل اور عبرتوں سے مالامال ہیں اور ان میں دوسرے پیغمبروں کے ساتھ خدائی قوانین کی مثالیں بیان کی گئی ہیں جیسے سورۃ انبیاء۔ الحج اور المومنون۔

مگر اس کے برخلاف یہ ہوا کہ آغاز وحی کے تین سال بعد تک آپ ﷺ نے نہ تو کوئی سورت لوگوں کو سنائی اور نہ کوئی دعوت دی اور نہ اپنے گھر والوں اور دوستوں سے اس مذہبی تحریک کے بارے میں کوئی گفتگو کی، جس کا بقول ان کے آپ ﷺ نے عزم مصمم کر لیا تھا، نہ آپ ﷺ نے شرک کی ان خرافات باتوں کی مخالفت کی جس سے آپ ﷺ بیزار ہو چکے تھے کیونکہ اگر آپ ﷺ اس زمانے میں اس قسم کی کوئی بات بیان فرماتے تو ضرور اس کی روایت کی جاتی اور اگر کوئی نہیں تھا تو وہی لوگ کچھ کہتے جو آپ ﷺ کے دامن عاطفت سے سب سے زیادہ وابستہ تھے جیسے کہ آپ کے گھر میں حضرت خدیجہ، حضرت علی اور حضرت زید بن حارث تھے اور حضرت ابو بکر صدیق تو ساری عمر آپ ﷺ کے ساتھ رہے تھے۔ لہٰذا ان لوگوں کی خاموشی وحی کے التوا کے زمانے میں اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ ان مغربی علماء نے نفسیاتی اور ذاتی وحی کے لیے آپ ﷺ کی تیاری اور لوگوں کی سنی سنائی باتوں سے مدد لینے کے سلسلے میں جو بیانات گھڑے ہیں وہ سراسر غلط اور بے بنیاد ہیں۔

۸۔ وحی کے التوا کے طویل عرصے کے بعد نزول وحی کے سلسلے میں جو روایات مذکور ہیں وہ ہنگامی حالات اور نئی نئی ضروریات کے عین مطابق ہیں اور ان کی بیان کردہ باتوں کے برعکس نہیں۔ مثلاً سورۃ المدثر کے پہلے حصہ کے بعد چند آیات ولید بن مغیرہ کے قول کی تردید میں ہیں، اس کا واقعہ یہ ہے کہ ابو جہل کو معلوم ہوا کہ ولید نے آپ ﷺ سے قرآن مجید سنا اور اس سے بہت متاثر ہوا، لہٰذا ابو جہل نے یہ چاہا کہ ولید ایسی بات کہے جس سے اس کی قوم کو پتہ چل جائے کہ وہ قرآن کریم کو ناپسند کرتا ہے، ولید نے کہا میں کیا کہوں خدا کی قسم! میں اشعار سے خواہ وہ رجز ہوں یا قصیدہ یا جنات کے اشعار تم سے زیادہ واقف ہوں بخدا! محمد (ﷺ) نے جو کچھ کہا ہے وہ اس طرح کی کوئی چیز نہیں ہے۔ خدا کی قسم! اس کے کلام میں بڑی حلاوت ہے، اس میں کتنی تروتازگی

ہے۔ اس کے اوپر بھی روشنی اور نیچے بھی روشنی ہے۔ در حقیقت وہ ایک اعلیٰ کلام ہے جس پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔ جو چیز بھی اس کے نیچے آئے گی اسے وہ پاش پاش کر دے گا۔ ابو جہل نے کہا "بہر حال تمہاری قوم اس وقت تک مطمئن نہیں ہوگی جب تک کہ تم اس کی برائی نہیں کرو گے" اس پر اس نے کہا اچھا مجھے سوچنے دو، سوچ کر اس نے کہا کہ "یہ وہ پرانا جادو ہے جو دوسروں سے متاثر ہے۔" اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

ذَرۡنِیۡ وَ مَنۡ خَلَقۡتُ وَحِیۡدًا ۝ (۷۴:۱۱)

یہ روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے حاکم نے امام بخاری کی شرط پر نقل کی ہے۔

سورتوں کے نزول کی ترتیب اس طرح ہے کہ سورۃ اقرا کے بعد سورہ ن والقلم اس کے بعد سورہ مزمل، سورہ مدثر اس کے بعد متوسط اور مفصل سورتوں کی تیس سے زیادہ چھوٹی سورتیں نازل ہوئیں۔ مگر ان تمام ابتدائی سورتوں میں کوئی ایسا مضمون نہیں ہے جسے ان کے قول کے مطابق لوگوں کی معلومات سے ماخوذ یا مشاہدہ سفر کا نتیجہ کہا جاسکے، نہ غار حرا میں ان کے بیان کردہ تخیلات کا نمونہ ان سورتوں میں پایا جاتا ہے (سورتوں کے نزول کی ترتیب کے لیے ملاحظہ ہو کتاب الاتقان للسیوطی)

۹۔ نویں دلیل یہ ہے کہ مسئلہ وحی کا تحلیل و تجزیہ کرنے والے مغربی مصنفوں نے محمدی معلومات کا جو کچھ تصور پیش کیا ہے اس کا مواد اس قدر کم اور اس کا دائرہ اسی قدر تنگ ہے کہ وہ معلومات قرآنی وحی کا سرچشمہ نہیں بن سکتی ہیں۔

قرآن کریم ان تمام باتوں سے اعلیٰ اور وسیع تر اور کامل تر ہے جنہیں بحیرا، النسطور بلکہ شام اور دنیا کے تمام یہود و نصاریٰ جانتے ہیں۔ وہ بیچارے بادیہ نشین عرب کس شمار میں ہیں جو سفر شام میں آپ ﷺ کو ملے ہوں گے۔

قرآن اور آسمانی کتب:

قرآن کریم نے نازل ہو کر اہل کتب کی کتابوں کی یوں تصدیق کی کہ یہ کتب حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت داؤد و سلیمان پر وحی کی صورت میں نازل ہوئی تھیں مگر اس کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کو انکی نگرانی کرنے اور بالادستی کی حیثیت حاصل ہے جیسا

کہ سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۸۴ میں صاف تصریح کی گئی ہے۔ اس نے یہود و نصاریٰ کے بارے میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ کتاب الٰہی کا صرف ایک حصہ محفوظ رکھ سکے ہیں، پورا حصہ نہیں محفوظ رکھ سکے۔ اس کے ایک حصے کو وہ بالکل فراموش کر چکے ہیں اور جا بجا کتاب میں تحریف کی ہے۔ قرآن کریم نے ان بڑے بڑے مسائل کو بھی بیان کیا ہے جس کی انہوں نے مخالفت کی تھی یا ان میں اختلاف ہے، ان میں عقائد، احکام اور تاریخی واقعات سبھی شامل ہیں۔

صاف ظاہر ہے کہ ایسے اعلیٰ احکام راہبوں یا دوسرے لوگوں سے ماخوذ نہیں ہو سکتے، جس سے بقول ان کے آپ ﷺ کو شام کے تجارتی سفر میں واقف کرایا گیا تھا، خواہ ان میں سے کچھ لوگ موسوی اور عیسوی توحید پر قائم رہے ہوں یا نہ رہے ہوں جیسے آریوس اور اس کے پیر دتھے یا ان کے پاس ان انجیلوں کا کوئی حصہ موجود ہے جسے کلیسا نے غیر قانونی قرار دیا تھا جیسے انجیل طفولیت مسیح یا انجیل برناباس۔ حقیقت ہے کہ آپ نے شام میں یا مکہ میں کلیساؤں کی کانفرنس کی طرح کوئی مسیحی کانفرنس منعقد نہیں کی تھی جو مختلف انجیلوں اور مختلف مسیحی فرقوں کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتی اور کسی کو صحیح اور کسی کو غلط قرار دیتی۔

اس قسم کے تجارتی سفر میں ایسے واقعات ہونے عقلاً محال ہیں۔ اس حقیقت کو ان خبروں کے گھڑنے والے بھی بخوبی جانتے ہیں۔ نیز اس سلسلے کی کوئی روایت (صحیح یا غلط) بھی منقول نہیں ہوئی۔ اگر فرض کریں کہ ایسا ہوا تھا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ تجارت کے اس تھوڑے سے وقت میں آپ ﷺ نے ان انجیلوں اور ان فرقوں کے بارے میں غور کر کے فیصلہ کر لیا اور کس طرح آپ ﷺ کو یقین ہو گیا کہ اس میں کوئی غلطی نہیں ہو گی۔ حالانکہ صحیح احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے اہل کتاب کے بارے میں اپنے صحابیوں کو حکم دیا تھا:

"نہ تم ان کی تصدیق کرو اور نہ تم انہیں جھٹلاؤ۔"[1] یہ فیصلہ ان باتوں کے لئے تھا

---

[1] صحیح بخاری میں اس طرح روایت کی گئی ہے۔ اور امام احمد اور بزار نے حضرت جابر کی روایت سے نقل کیا ہے۔ "تم اہل کتاب سے کوئی بات مت پوچھو، اس لئے کہ وہ خود گمراہ ہو گئے ہیں۔ اس لئے وہ تمہیں صحیح بات نہیں بتائیں گے۔ ایسی صورت میں یا تم حق بات کو جھٹلاؤ گے یا جھوٹ کی تصدیق کرو گے۔ خدا کی قسم اگر حضرت

جن کے بارے میں قرآن کریم نے خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ آپ ﷺ کا یہ ارشاد اس لئے تھا کہ اس چیز کی تکذیب ہو جائے جو اصلی آسمانی کتاب میں محفوظ ہے یا اس بات کی تصدیق ہو جائے جس کی اصل حقیقت کو وہ فراموش کر چکے ہیں یا اس میں تحریف کر دی ہو۔

(۱۰) قرآن کریم میں ایسی باتیں بھی ہیں جو کتاب مقدس کے عہد نامہ قدیم و جدید دونوں کے خلاف ہیں۔ یہ وہ حقائق ہیں جن کے بارے میں آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ کسی یہودی یا عیسائی نے اس کا دعویٰ کیا ہو۔ مثلاً قرآن کریم نے کتاب خروج کی مخالفت کی ہے۔ تورات میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی بیٹی نے متبنّیٰ بنایا، مگر قرآن میں ہے کہ فرعون کی بیوی نے انہیں متبنّیٰ بنایا۔ اس طرح تورات میں ہے کہ وہ بچھڑا جسے بنو اسرائیل پوجنے لگے تھے، حضرت ہارون علیہ السلام نے بنایا تھا۔ مگر قرآن کریم نے اسے سامری کی جانب منسوب کیا ہے اور حضرت ہارون علیہ السلام کو اس سے بری قرار دیا ہے۔

محمد (ﷺ) جو تعلیمات لے کر آئے تھے وہ ان تعلیمات سے بہت اعلیٰ اور ارفع ہیں جو آسمانی کتابوں میں موجود ہیں۔ خواہ ان کتابوں کی صحت ثابت ہو یا نہ ہو۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گی۔

اے خود پسندو! ٹھہر جاؤ، تم وہ کہتے ہو جسے خود بھی نہیں جانتے۔ قرآن کریم کی وحی تمہارے باطل خیالات سے بہت بلند ہے اور تمہارے تصورات اور بیانات سے بہت بالاتر ہے۔ محمد (ﷺ) تمہارے بیان کردہ کسی علم سے کم تر مگر روح القدس کے ذریعے خدائی کلام کو سمجھنے کے لئے تمہارے توہمات سے زیادہ مستعد تھے۔

قرآن کی وحی خدا کے تمام پیغمبروں کو محفوظ تعلیمات سے زیادہ اعلیٰ اور کامل تر ہے۔ کیونکہ اس نے سب کے آخر میں آکر ان کی مخصوص اور ہنگامی شریعتوں کی تکمیل کی ہے۔ اس لئے لامحالہ یہ یونانی فلسفی سولن کے قوانین سے بھی زیادہ مکمل ہے جسے ہمارے زمانے

موسیٰ علیہ السلام تمہارے درمیان ہوتے تو انہیں میری ہی پیروی کرنی پڑتی۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہودیوں کے بارے میں تورات سے کوئی بات لکھی۔ رسول اللہ ﷺ کو جب معلوم ہوا تو ناراض ہو کر آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا۔

کے ایک مصری ملحد نے محمد ﷺ کے برابر قرار دیا ہے۔ حالانکہ دونوں میں بہت فرق ہے آپ ﷺ امی تھے اور ناخواندہ لوگوں میں آپ ﷺ کی پرورش ہوئی اور وہ سولن فلسفی تھا جس نے حکمت، قانون، سلطنت اور سیاست کی ماہر قوم میں پرورش پائی اور قوم و سلطنت کے ہر معاملہ میں دخیل رہا۔ [1]

رسول اکرم ﷺ کی پیغمبرانہ صلاحیتیں :

حضرت محمد ﷺ کی ابتدائی زندگی میں خدا کی طرف سے آپ ﷺ کو جو پیغمبرانہ صلاحیتیں ودیعت کی گئیں، ان کے بارے میں اصل حقیقت یہ ہے کہ خدا نے آپ ﷺ کو فطری طور پر مکمل انسان پیدا کیا تاکہ آپ ﷺ دین فطرت کے علم بردار بن سکیں۔ اس کے ساتھ آپ ﷺ کو مکمل ذہنی اور عقلی صلاحیتیں بھی عطا کی گئی تھیں تاکہ آپ ﷺ ایک مستقل اور سائنٹیفک مذہب پیش کر سکیں۔ خدا نے آپ ﷺ کو اعلیٰ اخلاق سے مکمل فرمایا تھا تاکہ آپ ﷺ شریفانہ اخلاق کا اعلیٰ معیار قائم کریں۔ بچپن ہی سے آپ ﷺ بت پرستی اور بت پرستوں کی خرافات اور برائیوں سے بیزار تھے۔ آپ ﷺ خلوت پسند ہو گئے تھے۔ تاکہ آپ ﷺ اپنی قوم کی شہوت پرستی، جسمانی لذتوں یا وحشیانہ برائیوں سے دور رہیں جیسے خون ریزی، لوگوں پر دست درازی، کمینانہ خواہش مثلاً لوگوں کا ناحق مال کھانا وغیرہ۔ یہ اوصاف آپ ﷺ کو اس لیے عطا فرمائے گئے تھے تاکہ آپ

---

[1] سولن یونان کے سات ممتاز فلسفیوں کا ایک رکن تھا۔ وہ پیدائش مسیح سے سات صدی پہلے گزرا تھا۔ اس کی والدہ ایتھنز یونان کے پایہ تخت کے آخری بادشاہ بسترادں کی رشتہ دار تھی۔ سولن مالدار اور فوجی افسر تھا اپنے ملک میں بعض انتظامی اور فوجی عہدوں پر مامور تھا۔ وہ سپہ سالا بھی تھا ۵۱۴ق م میں وہ تمام جماعتوں کے اتفاق رائے سے قوم کا صدر منتخب ہوا۔ اسے مکمل اختیارات دیئے گئے تاکہ ملک کے نظم و نسق اور ان قوانین میں جس طرح چاہے ترمیم و اضافہ کرے جنہیں زار کوت نے اس سے پہلے تیار کیا تھا چنانچہ اس نے ایک نیا نظام تیار کیا جسے حکومت اور قوم نے دس برس کے لیے منظور کیا۔ اس طرح سولن حکمت اور تمدن کی سب سے بڑی قوم کا زبردست مقنن تھا۔ وہ بہت بڑا تعلیم یافتہ، فلسفی، حاکم، سپہ سالار اور صدر قوم تھا کیا اس سے محمد مصطفٰے ﷺ کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے جو امی تھے اور انہوں نے ایک سطر تک بھی نہیں پڑھی تھی نہ کوئی کتاب دیکھی تھی اور نہ کسی انتظامی یا سیاسی عہدے پر مامور رہے تھے۔ علاوہ ازیں جو کچھ آپ ﷺ نے پیش کیا وہ مقامی قانون نہیں تھا، نہ کسی قانون کی ترمیم شدہ شکل تھی بلکہ وہ لوگوں کے عقائد، آداب، احکام سیاست و جنگ کی اصلاح کے لیے ایک عالمگیر تحریک تھی۔ ان ملحد مسلمانوں کے شبہات ملاحظہ فرمایئے جو اپنے مذہب اور اس پیغمبر کے بارے میں باتیں بناتے ہیں جو ان کے لیے دوسری قوموں کے مقابلے میں مایہ ناز اور باعث شرف ہے۔

بگڑی ہوئی روحوں کی اصلاح کر سکیں۔ اور آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے ان کا تزکیہ نفس ہو۔ آپ ﷺ انسانیت کا اعلیٰ نمونہ بنا کر بھیجے گئے تھے تاکہ آپ ﷺ خدا کی اعلیٰ شریعت کو نافذ کر سکیں۔

آپ ﷺ کا خلق عظیم:

آپ ﷺ کی عفت اور پاک بازی کا یہ حال تھا کہ آپ ﷺ نے اپنی جوانی اور فارغ البالی کی زندگی کے مکمل پچیس سال اپنی بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ گزار دیئے جو پہلے دس سالوں میں ادھیڑ عمر کی بچوں والی خاتون تھیں اور آخر کے پندرہ سال میں بالکل بوڑھی اور اولاد پیدا کرنے کے ناقابل ہو گئی تھیں۔ ان کا پینسٹھ سال کی عمر میں انتقال ہوا، مگر آپ ﷺ ان سے سب سے زیادہ محبت کرتے تھے اور انہیں ساری عمر یاد کرتے رہے بلکہ بعد کی تمام بیویوں پر بھی انہیں ترجیح حاصل رہی، یہاں تک کہ انہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ پر بھی فضیلت حاصل تھی جو بہت زیادہ خوبصورت، نوعمر اور بے حد ذہین تھیں اور ان میں تبلیغ کی بہترین صلاحیت تھی۔ ان کے والد کا مرتبہ بھی آپ ﷺ کے صحابیوں میں بہت بلند تھا۔

آپ ﷺ ساری عمر خون ریزی کو ناپسند فرماتے رہے خواہ وہ حق کے لیے کیوں نہ ہو۔ اس لیے یہ عجیب بات ہے کہ اس قدر بہادر ہونے کے باوجود کہ آپ ﷺ اپنے دشمنوں اور خدا کے دشمنوں کے خلاف جو آپ ﷺ کے مذہبی امور میں مداخلت کرتے تھے، مسلمانوں کے لشکر کی قیادت فرمایا کرتے تھے مگر اپنے ہاتھ سے ایک شخص کے علاوہ جو ابی بن خلف تھا اور کسی آدمی کو قتل نہیں کیا۔ یہ شخص بھی وہ تھا جو آپ ﷺ کو قتل کرنے کے درپے تھا اور اس نے خود اور زرہ سے مسلح ہو کر حملہ کیا تھا۔ لہٰذا آپ ﷺ کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہا تھا کہ آپ ﷺ اسے قتل کریں۔ آپ ﷺ نے زرہ اور خود کے درمیان خالی جگہ پر ضرب لگائی اور اس کا کام تمام کیا۔

آپ ﷺ ساری عمر زہد و قناعت، سخاوت اور ایثار کے اعلیٰ اخلاق پر قائم رہے حالانکہ آپ ﷺ کو مشرکین مکہ اور یہودیوں کی لڑائیوں سے مال غنیمت حاصل ہوتا تھا۔ تاہم آپ ﷺ سادہ اور قناعت پسندانہ زندگی کو ترجیح دیتے رہے۔ لو آپ ﷺ کی شرایت

میں پاکیزہ مال سے لطف اندوز ہونے کی اجازت ہے اور محض مذہبی نقطہ نظر سے انہیں ترک کرنے کی مخالفت کی گئی ہے۔ اس کے باوجود آپ ﷺ اپنے کپڑوں میں خود پیوند لگاتے تھے اور اپنی جوتی خود گانٹھتے تھے، اگرچہ مذہب اسلام نے زیب وزینت کو جائز قرار دیا ہے اور ہر عید کے موقع پر اس کا حکم دیا ہے۔ آپ ﷺ گھر کے کاموں میں گھر والوں کی مدد بھی کرتے تھے۔

خدا نے آپ ﷺ کی فطری صلاحیتوں کی تکمیل کی تھی یہ خداداد تھیں، آپ ﷺ نے اسے تعلیم یا دوسرے لوگوں کے ذریعے حاصل نہیں کیا تھا۔ یہ اس لیے ہوا تاکہ آپ ﷺ تمام پیغمبروں کے دین کی تکمیل کر سکیں اور ایک ایسی مکمل شریعت پیش کریں جو روز قیامت تک عالم انسانیت کی اصلاح کے لیے کافی اور اصلاح انسانیت کی ذمہ دار ہو۔ خدا نے آپ ﷺ کو ساری دنیا کے لیے اس طرح حجت بنا کر بھیجا کہ اس نے آپ ﷺ کو قوم کے عام افراد کی طرح ایسا امی پیدا کیا کہ آپ ﷺ نے انسانی علوم میں سے نہ اپنی ناخواندہ ہم قوم عربوں سے کچھ سیکھا نہ اہل کتاب سے۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ نے اس علم کی طرف بھی توجہ نہیں فرمائی جو آپ ﷺ کی قوم کا مایہ ناز سرمایہ تھا یعنی زبان کی فصاحت وبلاغت، شعر وخطابت یا حسب ونسب پر غرور وفخر کے مقابلے۔ جب کہ اس مقصد کے لیے اہل عرب حج کے موسم میں مختلف میلوں میں شریک ہوا کرتے تھے جن میں عکاظ [1] کا میلہ بہت مشہور تھا۔ یہاں وہ چاروں طرف سے آکر اپنی فصاحت وبلاغت کا اظہار کرتے تھے۔ اس سے ان کی زبان کو بہت ترقی حاصل ہوئی، ان کی معلومات میں اضافہ ہوا اور ان کے اشعار میں علم وحکمت کے مضامین شامل ہوئے۔

مگر یہ عجیب بات ہے کہ آپ ﷺ نے بنفس نفیس ان محفلوں میں شریک ہونا پسند

---

[1] دور جاہلیت میں عربوں کے ہاں بازار اور محفلیں لگا کرتی تھیں جہاں وہ حج کے موسم میں خرید وفروخت اور اپنی اور اپنے آباء واجداد اور قبائل کی خوبیاں بیان کرنے کے لیے جمع ہوتے تھے۔ ان میں سب سے اول نمبر عکاظ کا تھا۔ یہ یمن کے راستے میں طائف کے قریب ایک مقام تھا۔ ابو عبیدہ کہتے ہیں کہ یہ وہ چٹیل میدان ہے جہاں نہ کوئی ٹیلہ ہے نہ کوئی پہاڑ۔ یہ نجد اور طائف کے درمیان ہے۔ یہاں ذوالقعدہ میں نصف مہینے تک بازار لگا کرتا تھا پھر وہ ذوالجنہ کے بازار میں آتے تھے۔ یہ عکاظ کے بہ نسبت مکہ کے زیادہ قریب ہے۔ یہاں وہ ذوالقعدہ کے آخر تک رہتے تھے بعد ازاں وہ ذوالمجاز کے بازار میں خیمہ زن ہوتے تھے۔ یہ مکہ معظمہ کے سب سے زیادہ قریب تھا یہاں وہ ذوالحج کی آٹھ تاریخ تک عرفہ سے ایک دن پہلے رہا کرتے تھے جہاں سے وہ منیٰ اور عرفات جایا کرتے تھے۔

نہیں کیا اور نہ ان باتوں کا تذکرہ کیا۔ آپ ﷺ نے نبوت کے بعد صرف امیہ بن ابی الصلت کے تقریباً سو شعر سن کر یہ فرمایا تھا "قریب تھا کہ وہ ایمان لے آتا" آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا "اس کی شاعری مومن ہے مگر اس کا دل کافر ہے"۔ نیز آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا۔ بعض بیان میں جادو ہوتا ہے اور بعض اشعار میں حکمت و دانائی کی باتیں ہوتی ہیں (حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کو مالک، احمد، بخاری، ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا)۔

خداداد صلاحیت:

ہمارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ ﷺ کی پیغمبرانہ صلاحیتیں فطری اور الہامی تھیں، اس میں آپ ﷺ کی تعلیم، زبان اور ذہنی علم کا کوئی دخل نہ تھا۔ نہ ایسی کوئی روایت منقول ہے کہ آپ ﷺ نبوت کے آرزو مند تھے جیسا کہ امیہ بن ابی الصلت متمنی تھا بلکہ خداوند تعالیٰ نے تو یہ بیان کیا ہے کہ آپ ﷺ کو نبوت کی توقع نہ تھی۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں مگر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں روایت ہے کہ جب انہوں نے اپنے غلام میسرہ کی زبانی آپ ﷺ کی ایمانداری، فضائل و کرامات اور بحیرا راہب کے قول کا تذکرہ سنا تو انہیں توقع ہو گئی تھی کہ آپ ﷺ ہی وہ پیغمبر ہوں گے جس کا لوگ چرچا کر رہے ہیں۔ مگر یہ روایت بھی اس درجہ صحیح نہیں ہے جس درجہ آغاز وحی والی حدیث ہے جسے ہم بیان کر چکے ہیں۔ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے قسم کھا کر (ابتدائی وحی کا حال سن کر) یہ کیوں کہا "خدا آپ ﷺ کو رسوا نہیں کرے گا"۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ آپ ﷺ کی خوبیاں جانتی تھیں جن کا انہوں نے (امین کہہ کر) ذکر کیا۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے یہ ضرورت محسوس کی کہ اس بارے میں اپنے چچیرے بھائی ورقہ بن نوفل سے مزید استفسار بھی کر لیں۔

گوشہ نشینی کی اصل وجہ:

اس میں کوئی وجہ نہیں ہے کہ آغاز وحی کے سال میں غار حرا میں آپ ﷺ کی گوشہ نشینی کی عبادت آپ ﷺ کا ذاتی اور کسبی فعل تھا جس نے آپ ﷺ کی خداداد فطری

قابلیت کو تقویت پہنچائی۔ اس کا ایک منفی پہلو یہ بھی تھا کہ اس طرح آپ ﷺ مشرکین کی عبادات اور ان کی عادتوں سے الگ تھلگ رہے۔ مگر اس کا اصل مقصد پیغمبرانہ صلاحیت کو بروئے کار لانا نہیں تھا کیونکہ اگر یہی مقصد ہوتا تو فرشتہ کو دیکھ کر یا اس کے دیکھنے کے بعد آپ ﷺ کو یقین ہو جاتا کہ آپ ﷺ کی تمنا بر آئی اور آپ ﷺ کا مقصد پورا ہو گیا بلکہ اس کو دیکھ کر آپ ﷺ کو اپنی جان کا اندیشہ نہ ہوتا۔ لہٰذا غار میں آپ ﷺ کی گوشہ نشینی اور عبادت کی اصل وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ لوگوں کی بری حالت سے پریشان ہو گئے تھے اور ان سے گریز کر کے خدا کی یاد میں سکون قلب کے خواہاں تھے۔ آپ ﷺ اس کشمکش سے نجات حاصل کرنے کے لیے خدا کی ہدایت کے طالب تھے جیسا کہ ہمارے استاذ امام (مفتی محمد عبدہ) نے سورۃ والضحیٰ کی آیت ووجدك ضالا فهدیٰ : کی تفسیر میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس مضمون کو خود اللہ تعالیٰ نے سورۃ الشوریٰ میں تفصیل کی ساتھ بیان کیا ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ۝ (۴۲: ۵۲، ۵۳)

اس طرح ہم نے (اے پیغمبر) اپنے حکم سے تمہاری طرف قرآن بھیجا۔ تم نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے؟ مگر ہم نے قرآن کریم کو نور بنادیا ہے جس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں ہدایت بخشتے ہیں۔ درحقیقت آپ سیدھی راہ کی طرف راہنمائی کرتے ہیں اس اللہ کی راہ کی طرف جس کا وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے بے شک سب کام خدا کی طرف لوٹتے ہیں۔

مفتی محمد عبدہ کی رائے:

مفتی محمد عبدہ نے رسالہ التوحید میں مختصر مگر مفید انداز میں اس بات کو اس طرح بیان فرمایا ہے۔

عام دستور ہے کہ آپ ﷺ جیسا یتیم، امی اور غریب بچہ بچپن سے بڑھاپے کے زمانے تک جو کچھ دیکھتا ہے وہ اس کے دل پر نقش ہو جاتا ہے اور اس کی عقل اپنے میل جو

ل کے انسانوں سے بالخصوص اپنے رشتہ داروں سے اور برادری کے لوگوں کی باتوں سے بہت متاثر ہوتی ہے۔ جب کہ کوئی کتاب اس کی رہنمائی کے لئے نہ ہو اور نہ کوئی استاد اسے تنبیہ کرنے والا ہو اور نہ اس کا کوئی سہارا ہو جو اس کے ارادہ کی پشت پناہی کرے۔ لہٰذا اگر آپ ﷺ کے معاملے میں بھی یہی دستور جاری ہوتا تو آپ ﷺ بھی ضرور انہی لوگوں کے عقائد پر عمل پیرا ہوتے اور انہی کی روش پر چلتے۔ یہاں تک کہ جب آپ ﷺ سن شعور کو پہنچتے اور عقل و تدبیر کا مادہ پختہ ہوتا تو اگر ان کی گمراہی کے خلاف آپ ﷺ کو کوئی ثبوت ملتا تو آپ ﷺ اس کی مخالفت کرتے۔ جیسا کہ آپ ﷺ کے زمانے کے چند آدمیوں نے کیا۔ (جیسے امیہ بن ابی الصلت اور عمرو بن نفیل تھے)۔

مگر معاملہ معاشرہ کے عام دستور کے خلاف تھا۔ کیونکہ بچپن ہی میں آپ کو بت پرستی سے نفرت تھی اور جس طرح آپ ﷺ کی شکل و صورت اچھی تھی، اسی طرح شروع ہی سے آپ ﷺ کے عقائد پاکیزہ تھے۔ یہ جو قرآن کریم میں آیا ہے وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى ۝ (۹۳:۷) تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ توحید کی ہدایت سے پیشتر آپ ﷺ بت پرست تھے یا (نعوذ باللہ) خلق عظیم سے پہلے آپ ﷺ سیدھے راستے پر نہیں تھے، یہ محض کھلا بہتان ہے۔ بلکہ اس سے مراد وہ حیرت اور ذہنی پریشانی ہے جو بعض دفعہ مخلص افراد کے قلوب پر چھا جاتی ہے کہ وہ کیسے راہ ہدایت تلاش کریں اور کس طرح وہ تباہ ہونے والے انسانوں کو نکال کر سیدھی راہ پر لائیں اور گمراہوں کو کس طرح ہدایت کریں۔ لہٰذا خدا نے آپ ﷺ کو نبوت کے لئے منتخب کر کے اس راستے پر ڈال دیا جسے آپ ﷺ کی بصیرت تلاش کر رہی تھی اور خدائی شریعت کو پیش کرنے کے لئے آپ ﷺ ہی کا انتخاب کیا گیا۔

میرا قول یہ ہے کہ نبوت و رسالت کے لئے آپ ﷺ کی فطری اور خداداد صلاحیت یہی تھی کہ خدا نے آپ ﷺ کی پاکیزہ روح کو ایک صاف و شفاف آئینہ کی طرح بنا دیا تھا جس میں تمام دنیا کے خراب مذہبی رسومات، موروثی آداب اور بری عادتیں منعکس ہونے کا کوئی امکان نہ تھا بلکہ آگے چل کر اس میں وحی الٰہی اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ تجلی پذیر ہوئی تاکہ خدا کے اس دین مطلق کی تجدید ہو جائے جو اس کے رسولوں کے ذریعے مختلف قوموں کی طرف ان کے مختلف حالات اور صلاحیتوں کے مطابق نازل کیا جاتا تھا۔ مگر

اس نے اس دین کی تکمیل آپ کے ذریعے کی اور آپ ﷺ کو سب سے آخری نبی بنایا۔ چنانچہ آپ ﷺ کی رسالت ہمیشہ کے لئے عالمگیر ہے اور اس کے بعد انسانیت کو کسی اور وحی کی ضرورت نہیں ہو گی۔

وحی محمدی کی نورانی مثالیں:

آپ ﷺ سلیم الطبع تھے اور آپ ﷺ کا مزاج کریمانہ تھا۔ آپ ﷺ پر اعلیٰ علوم نازل ہوئے جن پر خدا کا نور جلوہ گر ہوا۔ جیسا کہ مذکورہ بالا سورۃ الشوریٰ کی آخری آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ نور ضرب المثل بن گیا تھا۔ جیسا کہ سورۃ النور کی ان آیات میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّھَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیْتُوْنَۃٍ لَّا شَرْقِیَّۃٍ وَّلَا غَرْبِیَّۃٍ یَّکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَضْرِبُ اللّٰہُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۳۵﴾ (۲۴:۳۵)

(خدا آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے طاق میں چراغ رکھا ہو۔ چراغ شیشے کے اندر ہو، شیشہ ایسا ہو جیسے چمکتا ہوا ستارہ۔ اس چراغ میں ایسے مبارک زیتون کے درخت کا تیل جلایا گیا ہو جو نہ مغربی ہو نہ مشرقی۔ اس کا تیل سلگ اٹھنے کو ہے۔ گو اس کو آگ نہ لگی ہو۔ نور پر نور ہے۔ اللہ اپنے نور کے ذریعے جسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔ اس طرح اللہ لوگوں کو مثالیں بیان کرتا ہے اور وہ ہر چیز سے واقف ہے۔)

لہٰذا روح محمدی کا چراغ اپنی پاکیزہ فطرت کے شیشے میں چمکتے ستاروں کی طرح چمک رہا ہے۔ یہ چراغ خدائے قدوس کے مبارک درخت سے، روشن ہے جو نہ مغربی ہے نہ مشرقی، نہ یہودی ہے نہ نصرانی۔ بلکہ اس کا تعلق عالم بالا کے خدا سے ہے اور ہمارے زمانے کی بجلی سے مشابہ ہے۔ جس کے فطری کمال کا روغن آگ لگے بغیر روشن رہتا ہے۔ تاہم خدا کے نور نے آپ ﷺ پر وحی نازل فرما کر اس چراغ کو اس قدر روشن کیا کہ تمام عالم اس کی روشنیوں سے جگمگا اٹھا۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے، کیونکہ خدا نے حضرت محمد ﷺ کو نور قرار دیا اور اس کی کتاب، جو آپ ﷺ پر نازل ہوئی، وہ بھی نور

ہے اور آپ ﷺ کا دین بھی نور ہے۔ جس کا ثبوت مندرجہ ذیل آیات میں ہے:

(۱) قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ (۵:۱۵)

(تمہارے پاس خدا کا نور (محمد رسول اکرم ﷺ ہیں) اور کھلی کتاب آئی ہے۔)

(۲) اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ (۳۹:۲۲)

(وہ شخص جس کا سینہ خدا نے اسلام کے لئے کھول دیا ہے وہ خدا کے نور پر ہے۔)

(۳) فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا (۶۴:۸)

(اللہ اور اس کے رسول اور اُس نور پر ایمان لاؤ جسے ہم نے نازل کیا۔)

(۴) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۵۷:۲۸)

(اے وہ جو ایمان لائے! اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ وہ اپنی رحمت سے تمہیں دوگنا ثواب عطا فرمائے گا اور تمہیں ایک نور دے گا جس کے ذریعے تم چل سکو گے اور وہ تمہیں معاف کرے گا۔ خدا بہت بخشنے والا ہے۔)

(۵)۔ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (پ۷:۱۵۷)

(وہ لوگ جو اللہ پر ایمان لائے، اس کی مدد اور حمایت کی اور اس نور کی اتباع کی جو اس کے ساتھ نازل کیا گیا تھا، تو وہی لوگ فلاح پائیں گے۔)

دعائے نورانی:

رسول اکرم ﷺ بعثت کے بعد بھی یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

اے خدا! میرے دل میں بھی نور پیدا کر۔ میری زبان میں بھی نور ہو۔ آنکھوں اور کانوں میں بھی نور عطا کر۔ میرے دائیں بائیں، سامنے پیچھے، اوپر نیچے، ہر طرف نور ہو۔ میرے دل میں بھی نور ہو۔ (بخاری، امام احمد، مسلم، نسائی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے۔)

اے موسیو درمنگھم! تم نے اس کے چمکتے ہوئے نور کا ایک شعلہ ملاحظہ کیا ہے۔ تم یہ خیال نہ کرو کہ حضرت محمد ﷺ نے اسے مدین کے بدویوں اور مدینہ کے یہودیوں اور

شام کے عیسائیوں سے حاصل کیا ہے یا کائنات اور اس کی مخلوق کی باتوں پر غور و فکر کر کے اسے حاصل کیا ہے۔ اصل حقیقت اس سے بہت بلند ہے، کیونکہ بجلی کی روشنی اس سے بلند تر ہے کہ وہ عرب بدویوں کے ایندھن کی آگ سے یا یہودی اور نصرانی کلیسائیوں کے شعلوں سے یا ان کے پیغمبروں کی باقی ماندہ اصلی کتابوں کی روشنی سے حاصل کی جائے۔ یہ تو خدائے بزرگ و برتر کے نور کا فیضان تھا جو اس نے اپنے رسول اور خاتم الانبیاء محمد ﷺ کو عطا فرمایا۔ جیسا کہ شاعر بوصیری کہتا ہے:

(۱) اللہ اکبر! محمد (ﷺ) کا دین اور اس کی کتاب بہت زبردست ہے اور اس کا کلام بہت درست ہے۔

(۲) اس کے سامنے گزشتہ کتابوں کا ذکر مت کرو (اس کی مثال ایسی ہے کہ) صبح نے نمودار ہو کر مشعلیں بجھا دیں۔

اسی شاعر نے ہمزیہ قصیدہ کے شروع میں جو اشعار کہے ہیں اس کا ترجمہ مندرجہ ذیل ہے:

(۱) انبیاء کرام آپ ﷺ کے مانند کیسے بلندیوں پر چڑھ سکتے ہیں جبکہ آپ ﷺ ایسے آسمان پر ہیں جس کا کوئی آسمان مقابلہ نہیں کر سکتا۔

(۲) وہ آپ ﷺ کے بلند صفات کی برابری نہیں کر سکتے۔ کیونکہ آپ ﷺ کی چمک دمک اور بلندی ان کے راستے میں حائل ہے۔

(۳) آپ ﷺ کی صفات مثال کے طور پر لوگوں کے سامنے بیان کی جاتی ہے۔ جیسے ستاروں کو پانی کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔ ورنہ آپ ﷺ میں اور ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

(۴) آپ ﷺ ہر خوبی اور فضیلت کا چراغ ہیں۔ لہٰذا تمام روشنیاں آپ ﷺ کے نور سے روشن ہیں۔

وہ شخص جس کے بارے میں یہ آیات نازل ہوں، جن کے نور سے زمین اور آسمان منور ہوں اور جسے خدا کے نور سے معمور اس دعا کی تلقین کی گئی ہو، کیا اس کے بارے میں یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ ان لوگوں سے روشنی حاصل کرے گا جو بت پرستی اور کاہنوں کی سیاہ رسومات کی تاریکیوں میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ جن کی مثال سورۃ نور کی مذکورہ

آیات کے بعد خداوند تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمائی ہے:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـــًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّـجِّيٍّ يَّغْشٰـىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۭ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۭ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۭ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ۝ (۲۴: ۳۹،۴۰)

(اور جنہوں نے کفر کیا ان کے عمل ایسے ہیں جیسے بیابان میں سراب ہو جسے پیاسا آدمی پانی سمجھتا ہو۔ یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس آتا ہے تو کچھ بھی نہیں پاتا۔ اس نے خدا کو اپنے قریب پایا۔ جس نے اس کا حساب پورا کر دیا کیونکہ وہ جلد حساب لینے والا ہے یا ان کے اعمال ایسی تاریکیوں کی مانند ہیں جو گہرے سمندر میں ہوں۔ اس میں لہریں ایک دوسرے پر چھائی ہوئی ہوں اور ان سب پر بادل چھایا ہوا ہو۔ تاریکیوں پر تاریکیاں اس قدر ہیں کہ اگر ہاتھ نکالا جائے تو ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ (نتیجہ یہ ہے) جس کو خدا نور نہ دے اس کے پاس کوئی روشنی نہیں ہے۔)

اے منصف ناظر! تم اپنے ضمیر کی طرف دیکھو اور ان خدائی مثالوں اور اس کتاب کے تمام مضامین پر غور کرو۔ ممکن ہے کہ خدا تمہارے انصاف کے نور کی تکمیل کرے اور پھر تم ایک دوسری کتاب لکھو جس پر تم اپنی فرانسیسی بلاغت میں حضرت محمد (ﷺ) خاتم الانبیاء پر خدا کی وحی کو ثابت کر سکو اور اپنی قوم کو اس کی صحیح کتاب سے ہدایت حاصل کرنے کی دعوت دو تاکہ وہ اپنے ایمان اور خیانتوں کی خرابیوں کو دور کر سکیں اور سیدھے راستے پر چل کر دوسروں پر ظلم نہ کریں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ آپ ﷺ کی ذاتی صلاحیت اور "نفسیاتی وحی" کے بارے میں ان لوگوں نے جو تصویر کشی کی ہے، اس کی تردید کے لئے یہ بیان کافی ہے۔

اس کے بعد زیادہ مدلل اور اہم موضوع کا بیان ہے۔ یعنی خود وحی کے موضوع کا بیان ہوگا جو آپ ﷺ کی نبوت کی لازوال نشانی، زبردست حجت اور انوار الٰہی کا سرچشمہ ہے۔ وہ قرآن کریم ہے۔

خدا کی سب سے بڑی نشانی، قرآن کریم:

قرآن کریم کو قرآن حکیم، قرآن مجید اور کتاب العزیز بھی کہتے ہیں۔ جس کے آ کے

اور پیچھے باطل قدم نہیں رکھ سکتا۔ یہ خدائے حکیم و حمید کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

یہ عام کتابوں کی طرح کتاب نہیں ہے اور نہ یہ معمولی نشانیوں کی طرح ایک نشانی ہے۔ نہ یہ عام معجزوں کی طرح ایک معجزہ ہے۔ یہ عام روشنیوں کی طرح ایک نور ہے اور نہ یہ معمولی اسرار و کلام ہے۔ بلکہ یہ زندہ اور لافانی خدا کا کلام ہے جس سے روح القدس جبرئیل امین علیہ السلام کا صرف اتنا تعلق ہے کہ انہوں نے اسے عربی الفاظ کے ساتھ "افق اعلیٰ" سے اس سرزمین تک پہنچایا۔ حضرت محمد ﷺ نے جبریل امین سے بجنسہ انہی الفاظ کے ساتھ حاصل کر کے اسے عوام تک پہنچایا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے اپنے قول اور فعل سے اس کی وضاحت فرمائی، تاکہ لوگ اس سے ہدایات حاصل کریں۔

لہٰذا یہ قرآن کریم اپنے الفاظ، ترتیب، طرز بیان، ہدایات، تاثیر اور معلومات کے لحاظ سے دنیا کے لئے معجزہ ہے۔ خود محمد ﷺ کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اپنی ذاتی جدوجہد، ذہانت یا ذاتی معلومات اور فصاحت و بلاغت کے زور سے قرآن کریم جیسی کوئی سورت پیش کر سکیں۔ آپ ﷺ کی جو معلومات اور قوت بیانیہ تھی وہ سب اسی قرآن کریم کی بدولت تھی۔ بلکہ قرآن کریم کی صریح اور واضح آیات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ ان قرآنی علوم سے اس سے پیشتر واقف نہیں تھے۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ آپ ﷺ بھی دوسروں کی طرح اس جیسی سورت پیش کرنے سے عاجز تھے۔ چنانچہ خداوند تعالیٰ نے آپ ﷺ کو یہ بات کہنے کی اس وقت ہدایت کی تھی، جب آپ ﷺ نے انہیں اس کا چیلنج پیش کیا تھا اور اس کے ذریعے اپنی نبوت کو ثابت کیا تھا، وہ آیت یہ ہے:

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾ قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶﴾ (۱۰: ۱۵، ۱۶)

(جب ان پر ہماری کھلی نشانیاں تلاوت کی جاتی ہیں۔ تو وہ لوگ جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے ہیں، کہتے ہیں اس قرآن کے علاوہ اور لاؤ یا اُس کو تبدیل کرو (اے پیغمبر) کہہ دو میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں اسے اپنی طرف سے تبدیل کروں۔ میں اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی نازل ہوتی ہے۔ اگر میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو مجھے برے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔ کہہ دیجئے اگر

اللہ چاہتا تو میں تمہیں یہ آیتیں پڑھ کر نہ سناتا اور نہ خدا تمہیں اس سے واقف کرتا، کیونکہ میں اس سے پہلے ایک عرصہ تک تمہارے ساتھ رہ چکا ہوں۔ کیا تم عقل نہیں رکھتے ہو۔)

ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ آپ خدا کے حکم سے یہ آیات تلاوت فرمارہے ہیں۔ آپ ﷺ عرصہ دراز تک ان لوگوں کے ساتھ رہے، مگر اس سے پہلے اس طویل عرصہ میں جو چالیس سال تک رہا، آپ کی طرف سے کوئی علم و عرفان اور فصاحت و بلاغت کا نمونہ پیش نہیں ہوا تو کیا یہ کفار اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ جب جوانی میں آپ ﷺ سے اس قسم کا کوئی فعل سرزد نہ ہوا تو ادھیڑ عمر میں یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ ﷺ کے اندر اتنی قابلیت پیدا ہو جائے کہ آپ ﷺ ایسا بے نظیر کلام پیش کر سکیں۔

سورۃ بقرہ کی جس آیت میں چیلنج بیان کیا گیا ہے (۲: ۳۲) اس کی تفسیر میں لفظی اور معنوی اعجاز کو اجمال و اختصار کے ساتھ بیان کر چکا ہوں اور وہ کئی اقسام پر مشتمل ہے۔

(۱) طرز بیان (۲) بلاغت (۳) ماضی، حال اور مستقبل میں علم غیبت کی باتیں۔

(۴) گوناگوں متضاد بیانات سے محفوظ ہے۔ (۵) قرآن کریم کے مذہبی علوم اور شریعت۔ (۶)۔ جدید علوم پیدا ہونے کے باوجود دنیا اس کی کسی بات کی تردید سے عاجز ہے۔ (۷)۔ اس میں ایسے مسائل بیان کئے گئے ہیں جو نزول قرآن کے زمانے میں لوگوں کو معلوم نہیں تھے۔

ان قسموں کے بعد آپ ﷺ کی نبوت پر دلائل اور آیت کی تفسیر، تفسیر المنار (صفحہ ۱۹۱۔۲۲۸) میں ملاحظہ فرمایئے۔

اس کے بعد میں نے قرآن کی بلاغت اور ترتیب پر اس چیلنج کو واضح کیا ہے جو سورۂ یونس کی دو آیتوں (۱۰: ۳۷: ۳۸) میں کیا گیا ہے۔ ان دو آیتوں میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اکرم ﷺ بھی دوسروں کی طرح خود اپنی طرف سے اس جیسی کوئی سورت پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ اس میں اس جیسی دس سورتوں کے چیلنج کی وجہ بھی بیان کی گئی ہے اور چھوٹی سورتوں کی معجز بیانی کی وجہ بھی بیان کی گئی ہے۔ تاہم کتاب کے آخر میں ان مسائل کو دوبارہ بیان کیا جائے گا۔

یہاں میں قرآن کریم کے علوم، اس کے طرز بیان اور تاثیر کا ذکر کروں گا۔ جس سے انسانوں کی اصلاح ہوئی۔ اُسے صرف اس قدر تفصیل کے ساتھ بیان کروں گا۔ جس

کی یہاں گنجائش ہے۔ وہ یہ ہے کہ تاریخ نے انبیاء، حکماء، قانون دان اور ماہرین سیاست و اقوام کے جس قدر علوم محفوظ رکھے ہیں، قرآنی علوم ان سب سے زیادہ اعلیٰ ہیں۔

چنانچہ جس شخص کا یہ ایمان ہے کہ اس دنیا کا پروردگار علم و حکمت والا، مہربان، صاحب ارادہ اور بااختیار خدا ہے تو اسے یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ قرآن کریم بلاشک و شبہ اس خدائے بزرگ و برتر کی وحی ہے جو اس نے سب سے آخری پیغمبر پر انسانوں کے لئے از راہ عنایت نازل فرمائی تاکہ وہ اس کی ہدایت سے اپنی فطرت کی تکمیل اور اپنا تزکیہ نفس کر سکیں اور اپنے سماج کی ان بیماریوں کا علاج کریں جو تمام قوموں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ایسی حالت میں محمد ﷺ کی اتباع کرنا خدا کی طرف سے تمام انسانوں کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ۨ الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِىِّ الْاُمِّىِّ الَّذِىْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ (۹:۱۵۸)

(اے پیغمبر! کہہ دیجئے میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول (بنا کر بھیجا گیا ہوں) جس کی ملکیت میں آسمان اور زمین ہیں۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہی زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ لہٰذا اللہ اور امی رسول پر بھی ایمان لاؤ۔ جو اللہ اور اس کے کلام پر ایمان رکھتا ہے تم اس کی پیروی کرو تاکہ ہدایت پاؤ۔)

جو کوئی اس علم و حکمت والے پروردگار کو نہیں مانتا ہے اس کے لئے بھی اس قرآن کریم میں ایسے دلائل موجود ہیں کہ خدا کا وجود برحق ہے اور وہ مخلوقات سے بالاتر ہستی ہے۔ قرآن کریم نے ایسی کھلی نشانیاں پیش کی ہیں جو کائنات کے مطالعہ اور خود انسانوں کے اندرون نفس کی چیزوں پر غور و فکر کرنے سے معلوم ہو سکتی ہیں اور جو کوئی اندرونی اور بیرونی نشانیوں کو نہیں سمجھ سکتا، اسے بھی یہ یقینی طور پر تسلیم کرنے پڑے گا کہ دنیا میں جتنے ہدایت یافتہ رہنما اور حکماء مشہور و معروف گذرے ہیں، محمد ﷺ ان سب سے زیادہ کامل، افضل، عالم اور دانشمند تھے۔ عقل کے تقاضے کے مطابق ان لوگوں کے لئے یہ ضروری ہو جائے گا کہ وہ اس بات کا اعتراف کریں کہ آپ ﷺ تمام انسانوں سے افضل ہیں اور سب سے زیادہ آپ ﷺ اس کے مستحق ہیں کہ آپ ﷺ کی پیروی کی جائے۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ مشرق و مغرب کے بہت سے اہل علم نے اس

بات کا اعتراف کیا ہے۔ جن کی شہادتیں آگے چل کر ہم بیان کریں گے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بعض منصف مزاج غیر مسلم جو سیرت محمد ﷺ کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کو بھی کسی قدر سمجھتے ہیں، یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ آپ ﷺ جیسا کوئی انسان نہیں اور نہ مستقبل میں ایسا کوئی انسان ہوگا۔ انہی میں سے ایک مشہور انگریز سر ولیم میور [1] ہے۔

دوسرا ایک فلسفی شامی ڈاکٹر ہے جس نے کیتھولک مذہب میں پرورش پائی اور مادہ پرستی میں زندگی گذاری۔ مگر رسالہ "المنار" میں رسول اکرم ﷺ کے بعض محاسن کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں اس نے ایک خط لکھا جسے ہم نے رسالہ المنار ۱۳۲۶ھ کی پہلی جلد میں شائع کیا تھا۔ اس کا متن یہ ہے:

شبلی شمیل کا خط

بخدمت جناب غزالی عصر سید محمد رشید رضا مدیر "المنار"۔

"آپ محمد ﷺ کو ایک پیغمبر کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور انہیں ایک عظیم شخصیت سمجھتے ہیں۔ مگر میں آپ ﷺ کو ایک انسانی حیثیت سے عظیم ترین ہستی خیال کرتا ہوں۔ اگرچہ ہم مذہبی عقائد کے لحاظ سے ایک دوسرے کے مخالف ہیں مگر وسیع عقل اور مخلصانہ کلام ہمارے درمیان مشترک ہے۔ جس کے ذریعے ہمارے درمیان دوستی کے تعلقات زیادہ مستحکم ہوں گے۔" (اس کے بعد اس نے آپ ﷺ کی شان میں چند عربی اشعار ذیل کے عنوان کے ماتحت تحریر کئے ہیں ترجمہ مندرجہ ذیل ہے)۔

کلمہ حق:

(۱) محمد (ﷺ) نے اپنے قرآن کریم کا تانا بانا تیار کیا ہے تاکہ اپنا مقصد پیش کیا جائے۔

(۲) اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ میں آپ ﷺ کے دین کو تسلیم نہیں کرتا ہوں لیکن کیا میں

---

[1] سر ولیم میور اپنی کتاب "لائف آف محمد" میں آپ ﷺ کے اوصاف حسنہ کو بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے "الغرض جس قدر ہم محمد (ﷺ) کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں اس قدر ہم ہمیشہ آپ کو مجسم فضائل کا مجموعہ دیکھتے ہیں۔ آپ کی اندرونی زندگی پاکیزہ ہے اور آپ کے اخلاق بلند ہیں۔ ماضی، حال، مستقبل کسی زمانے میں نہیں ایسی خوبیوں اور فضائل کی نظیر نہیں مل سکے گی۔

ان کھلی نشانیوں سے انکار کر سکتا ہوں؟

(۳) یا (اس سے انکار ہو سکتا ہے) کہ قرآن کریم میں صاف اور واضح الفاظ میں بری خواہشوں کے روکنے والی حکمت کی باتیں ہیں۔

(۴) اور اس میں ایسے شرعی قوانین ہیں کہ اگر انہیں انسان سمجھ سکیں تو وہ تہذیب کو عادات و رسوم میں محدود نہ رکھیں۔

(۵) آپ ﷺ بہت عمدہ مدبر اور حکیم تھے اور آپ ﷺ منتخب الفاظ اور وضاحت کے بادشاہ تھے۔

(۶) آپ ﷺ عقل و سیاست اور حکمت عملی کے مرد میدان تھے جنگوں میں فتح و نصرت آپ ﷺ کی حلیف تھی۔

(۷) آپ ﷺ نے قرآن کریم کی بلاغت کے ذریعے انسانوں کی عقلوں کو مغلوب کر لیا تھا اور اپنی شمشیر سے دشمنوں پر غالب آ گئے تھے۔

(۸) دنیا میں آج تک جتنے بہادر انسان گذر چکے ہیں یا حال و مستقبل میں ہوں گے وہ سب آپ ﷺ سے کم تر ہیں۔

تمام قوموں کے آزاد خیال انسانوں میں اس حقیقت کو تسلیم کرنے والے بہت ہیں مگر پروردگار عالم کے منکروں کی تعداد بہت کم ہے۔ وہ محمد (ﷺ) کی شخصیت کو تسلیم کرتے ہیں اور آپ ﷺ کی خوبیوں کو آپ ﷺ کی ذاتی استعداد اور صلاحیت کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، حالانکہ آپ ﷺ ان تعلیمات کو خدا کی وحی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ڈاکٹر شبلی شمیل بھی یہ خیال کرتا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے قرآن کریم کا تانا بانا حکمت اور مذہب سے تیار کیا ہے تاکہ عوام اسے قبول کر سکیں۔ بہر حال اس خیال کو ہم تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں باطل کر چکے ہیں اور آپ ﷺ کی نبوت کو بھی ثابت کر دیا ہے جو وجود باری تعالیٰ بلکہ الوہیت اور نبوت کے تمام عقلی اور فطری دلائل کا مجموعہ ہے۔

یہ دلائل اس کتاب کے خاتمہ میں تفصیل کے ساتھ بیان کئے جائیں گے، اب میں اعجاز قرآنی کے بارے میں تمہید کے طور پر دو فصلیں دو قسم کے نقطہ نگاہ کے مطابق تحریر کروں گا جو ہمارے گذشتہ علماء کی تصنیفات سے زیادہ مستحکم ہوں گی اور دور حاضر کے آزاد خیال لوگوں کو قائل کر کے چھوڑیں گی۔

فصل نمبر ۴:

اعجاز قرآنی اور اس کے انقلابی اثرات

قرآن کریم کا مخصوص انداز بیان:

اگر اسلامی عقائد کو جو قرآن کریم میں بیان کئے گئے ہیں عقائد کی کتابوں کی طرح جمع کیا جاتا تو انہیں تین چار یا پانچ سورتوں میں ترتیب کے ساتھ بیان کیا جا سکتا تھا جیسے خدا اور اس کی صفات پر ایمان لانا، فرشتوں، اس کی کتابوں، رسولوں اور قیامت کے دن پر ایمان لانا، حساب اور جزاء، جنت اور دوزخ پر ایمان لانا وغیرہ۔

اسی طرح فقہ کی کتابوں کی طرح عبادات، طہارت، نماز، زکوۃ، روزہ، حج، دعا اور اذکار کے مسائل کو الگ الگ بابوں میں تقسیم کر کے چند سورتوں میں جمع کیا جا سکتا تھا۔ آداب واخلاق، حکمت، واجب اور مستحب فضائل اور ان کے برعکس برائیوں، محرمات اور مکروہ چیزوں کو اخلاقی کتابوں کی طرح دس یا اس سے زیادہ سورتوں میں بیان کیا جا سکتا تھا۔

اس کے بعد قرآن کے قوانین، شخصی، سیاسی، مالی، جنگی، شہری احکام اور تعزیرات قانون کتب کی طرح چند خاص سورتوں میں مدون ہو سکتے تھے۔ پیغمبروں کے قصے، اس کے عبرت آمیز اسباق اور قوانین فطرت کو تاریخی کتب کی طرح جداگانہ سورتوں میں مرتب کیا جا سکتا تھا۔

اگر ان سب مضامین کو اور قرآن کریم کے دیگر غیر مذکور مضامین کو جن کے بیان کرنے سے خدا کا مقصد انسانی اصلاح ہے، اسی طرح الگ الگ بابوں میں جمع کیا جاتا جیسے کہ تورات کی ان تاریخی کتب کو ترتیب دیا گیا ہے جس کے مولف کو کوئی نہیں جانتا، یا جس طرح فقہ، قانون اور دوسرے علوم کی کتابیں ہیں تو ایسی صورت میں قرآن کریم کا اہم مقصد ہدایت فوت ہو جاتا جو نزول وحی کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس کی روز مرہ، تلاوت عبادت بن کر ہدایت کا ذریعہ بن سکے اور اس کی چند چھوٹی چھوٹی سورتوں کا

حافظ، ایمان، فضائل، احکام اسلامی اور بہت سی ایسی مفید باتوں سے زیادہ مستفید ہو سکے جو تمام سورتوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اگر مذکورہ بالا طریقہ پر قرآن کریم کی ترتیب ہوتی تو اس کی ہر سورت میں صرف ایک مضمون ہوتا۔ بعض سورتوں میں صرف طلاق یا حیض کے احکام ہوتے۔ ایسی حالت میں وہ شخص جسے ایک ہی موضوع کی طویل سورت یاد ہوتی۔ اسی ایک سورت کو تلاوت کرتا رہتا اور بلاشک وشبہ اس سے اکتا جاتا۔

مگر موجودہ عجیب وغریب ترتیب میں ایک ہی طویل آیت اور ایک ہی چھوٹی سورت میں رنگا رنگ کی ہدایتیں ہیں۔ خواہ وہ ایک ہی موضوع پر کیوں نہ ہوں مثلاً سورہ فیل وقریش کی چھوٹی سورتوں کو دیکھ لو۔ ان میں دو تاریخی واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ ان واقعات کو مشرکین قریش کے خلاف حجت بنادیا گیا ہے تاکہ وہ اس خدا کی توحید اور اس کی عبادت کو ضروری سمجھیں جس نے خانہ کعبہ کی حفاظت کر کے اور اسے امن کی جگہ بنا کر ان پر احسان کیا ہے اور اس پر ان کی عزت وشرافت، فخر، زندگی، تجارت اور رزق کا دارومدار رکھا ہے۔

اگر قرآن کریم عام کتابوں کے انداز بیان اور ان کی ترتیب کے مطابق نازل ہوتا تو اسکا ایک اہم مقصد ہدایت فوت ہو جاتا یا دوسرے لفظوں میں جدید اصطلاح کے مطابق یوں کہا جاسکتا ہے اگر قرآن کریم کی ترتیب ابواب کے لحاظ سے ہوتی تو شکل اور موضوع دونوں کے لحاظ سے دوسرے کتابوں پر جو اسے امتیازی خصوصیات حاصل ہیں، وہ باقی نہ رہتیں۔

پروردگار عالم اور علم وحکمت والے خدا کے نازل کردہ قرآن کریم کی ترتیب واسلوب میں بہت سے فوائد ہیں جن میں سے کچھ ہم نے بیان کئے ہیں اور کچھ آگے چل کر بیان کریں گے۔ قرآن کریم کے تمام مضامین کو ایک دوسرے سے ملا دیا گیا ہے اور انہیں بہت سی سورتوں میں خواہ وہ طویل ہوں یا چھوٹی، مختلف مناسبات کے لحاظ سے بلیغ اور موثر عبارتوں کی تکرار کے ساتھ منتشر کر دیا گیا ہے تاکہ وہ دلوں پر اثر کریں اور احساس کو بیدار کریں اور وہ شخص جو قرآن کریم کی ہمیشہ تلاوت کرتا ہو اکتا نہ سکے۔ اس کی ترتیل (خوش الحانی) اس کی مخصوص ترتیب کے مضمون کے ساتھ ہے۔ آیات کے فواصل (وقفے) ایسے گوناگوں اور طرح طرح کے نغمے پیدا کرتے ہیں جن سے قلب میں خشوع

وخضوع پیدا ہوتا ہے اور پروردگار کے جاہ وجلال کا رعب، اس کی مقدس صفات وکمالات کی معرفت، اس کے جمال وجلال کا مشاہدہ اور اس کے صفات واسماء کا جلوہ نظر آتا ہے۔ نیز اس کی تلاوت سے خدا کی صنعت گری پر غور وخوض ممکن ہے اور اس کی رضا مندی اور رحمت کی امید بندھتی ہے۔ اس کے غضب اور سزا سے خوف لاحق ہوتا ہے اور اس کے فطری قوانین سے عبرت حاصل ہوتی ہے۔ بہر حال اس کلام کا خواہ وہ ترغیب وترہیب کے لئے ہو یا تعجب، نفرت، محبت یا رجز وتوبیخ اور افکار واقرار کے موقع پر بولا جائے۔ ہر صورت میں معیار اس قدر بلند ہے کہ انسانی کلام میں خواہ وہ نثر ہو یا نظم، رجز ہو یا مسجع، اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اپنے اس بلند انداز بیان، اس درجہ حسین وبلیغ تعبیر کی وجہ سے قرآن کریم کے بارے میں یہ کہا گیا ہے "اس کی جدت پرانی نہیں ہوگی اور نہ اس کی مکرر تلاوت سے اس کی آب وتاب میں کمی آئے گی"[1] اس کی حکمت، اور اس کا مقصد خود واقعات سے معلوم ہو جائے گا۔ مختصر بیان مندرجہ ذیل ہے۔

---

[1] اس حدیث سے یہاں یہ مراد ہے کہ قرآن کریم کے عجائبات، جو اسے خدا کا کلام ثابت کرتے ہیں کہیں ختم نہ ہوں گے، اس کی تلاوت کی کثرت موجب ملال نہیں ہوگی اور امتداد زمانہ سے اس کی دلکشی میں کمی نہیں آئے گی۔
اس مضمون کی سب سے زیادہ صحیح حدیث وہ ہے جسے ابن ابی شیبہ نے اپنی تصنیف میں اور محمد بن نصر اور ابن الانباری نے کتاب المصاحف میں اور حاکم نے المستدرک میں نقل کیا ہے۔ حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور بیہقی نے ابن مسعود کی مرفوع حدیث کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔ وہ حدیث یہ ہے۔

"یہ قرآن کریم، خدا کا خوان نعمت ہے تم جس قدر ممکن ہو اس کی ضیافت سے لطف اٹھاؤ۔ حقیقت میں یہ قرآن کریم خدا کی رسی اور اس کا کھلا نور ہے اس میں کار آمد شفا ہے۔ اس شخص کے لئے سلامتی ہے جس نے اس کا سہارا لیا اور اس کے لئے نجات ہے جس نے اس کی پیروی کی۔ یہ راہ صداقت سے نہیں ہٹتا ہے اور نہ کجروی اختیار کرتا ہے کہ اسے سیدھا کیا جائے اور بار بار تلاوت سے یہ پرانا نہیں ہوتا۔ تم قرآن کریم کی تلاوت کرو کیونکہ خداوند تعالیٰ اس کے ہر حرف کے بدلے دس نیکیوں کا ثواب عطا کرے گا۔ میں نہیں کہتا ہوں کہ الم ایک حرف ہے بلکہ الف، لام اور میم (الگ الگ حروف ہیں۔)

حاکم فرماتے ہیں "یہ صحیح حدیث ہے بخاری اور مسلم نے اس کے راوی صالح بن عمر پر اعتراض کی وجہ سے اسے اپنی کتابوں میں شامل نہیں کیا" مگر واقعہ ایسا نہیں ہے۔ امام مسلم نے صالح کی حدیث نقل کی ہے۔ اس حدیث کو ترک کرنے کے اصل باعث اس کے شیخ ابراہیم بن مسلم الھجری ہیں جنہیں جمہور نے ضعیف قرار دیا ہے۔ یہ صداقت یا حافظہ کی کمی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے کئی احادیث رسول اکرم ﷺ کی طرف مرفوع کر کے روایت کی ہیں حالانکہ وہ حضرت عبداللہ ابن مسعود اور ابن عمر پر ختم ہو جاتی ہیں اور موقوف ہیں۔ مگر سفیان بن عیینہ نے یہ تصریح کی ہے کہ وہ ابراہیم کے پاس آئے انہوں نے اپنی تحریری احادیث اس طرح صحیح کر کے دیں کہ انہوں نے صاف طور پر یہ بتایا کہ یہ احادیث رسول اللہ ﷺ سے مروی ہیں اور یہ حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابن عمر کی روایت کردہ ہیں۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث وہ ہے جسے حضرت سفیان بن عیینہ نے مرفوع قرار دیا ہے، اس وجہ سے مذکورہ بالا حضرات نے اسے مرفوع لکھا ہے۔ ایسی ایک حدیث حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بھی مروی ہے جسے قاضی باقلانی نے اپنی کتاب اعجاز القرآن میں درج کیا ہے۔

قرآنی انقلاب :

قرآن کریم ایک ایسی کتاب ہے جو ایسے امی انسان پر نازل ہوئی جس نے صحیح انسانی فطرت پر نشوونما پائی تھی۔ آپ ﷺ کی عقل سلیم تھی اور دل صاف وشفاف اور اخلاق پاکیزہ تھے۔ آپ ﷺ کے دل پر نہ تو بری مذہبی رسومات کا تسلط تھا اور نہ دنیاوی خواہشوں کا۔ اس کتاب نے عرب میں زبردست انقلاب برپا کر کے اقوام عالم میں انقلاب برپا کیا۔ عالم کی فطرت شرک اور بت پرستی سے آلودہ ہو چکی تھی لہٰذا اسے ایسی آلودگیوں سے صاف کیا گیا جنہوں نے انسان کو اس کے افق اعلیٰ سے نیچے زمین پر گرادیا تھا یہاں تک کہ وہ اپنے سے بھی کمتر مخلوقات کی پرستش کرنے لگا تھا۔ قرآن کریم نے کلیساؤں کی تمام بدعتوں اور ان بری مذہبی رسومات کا خاتمہ کر دیا جنہوں نے عقل انسانی کو بگاڑ کر اس کی آزادی فکر کو چھین لیا تھا اور پیغمبروں کی توحید کو شرک میں، حق کو باطل میں اور ہدایت کو گمراہی میں تبدیل کر دیا۔ ان کے علاوہ ظالم بادشاہ اور جابر حاکموں کے استبداد نے انسانی بہادری کو بگاڑ کر ان کی خودداری کو مجروح کر دیا تھا اور ان کی خود مختاری سلب کر رکھی تھی (قرآن کریم نے آکر ان سب چیزوں کا بھی خاتمہ کر دیا۔)

یہ ایسا انقلاب تھا جس نے انسانی عقل اور اس کے ارادہ کو ایسے جھوٹے خداؤں کی غلامی سے نجات دلائی جو مطلق العنان حاکم کی حیثیت سے خدا کے نائب بن کر عوام کے دل و دماغ کے مالک بن بیٹھے تھے اور انہیں ان کے جسم اور جان ومال میں ہر قسم کے تصرف کرنے کا حق حاصل تھا۔ قرآن کریم کی اس آزادی کی بدولت ہر انسان آزاد اور خوددار بن کر اپنے خدا اور معبود کا بندہ بن گیا تاکہ وہ اپنی مادی اور معنوی طاقتوں کو اپنی ذات اور اپنی نوع کی تکمیل میں استعمال کر سکے۔

اس قسم کا انسانی انقلاب صرف قرآن کریم کے اس اصول پر برپا ہو سکتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (رعد-۱۱)

(خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلے۔)

اب غور کرنا چاہئے کہ قومیں اپنے ایسے عقائد، اخلاق وخصائل کو کیسے تبدیل کر سکتی ہیں جنہیں موروثی عبادت اور راسخ عادات نے پختہ کر دیا ہے۔

کیا اس بات کے لئے یہ کافی ہے کہ ایک مصلح کھڑا ہو اور علوم وفنون کی کتابوں کی

طرح ایک خشک تعلیمی کتاب لکھ کر لوگوں سے یہ کہے "اے لوگو! تم خود گمراہ اور بگڑے ہوئے ہو اور دوسروں کو گمراہ کرتے ہو اور انہیں بگاڑتے ہو لہٰذا تم اس کتاب پر عمل کرو، ہدایت پاؤ گے اور تمہاری اصلاح ہو جائے گی" یا وہ شہری قوانین تیار کر کے اس کے مقدمہ میں یہ لکھے "اس قانون کو نافذ کر و تمہارے حقوق محفوظ ہو جائیں گے۔ تمہاری قوم معزز اور تمہاری سلطنت طاقتور ہو جائے گی۔"

اس طرح یہ اصلاح کیسے ممکن ہے جب کہ فاسد اور مفسد لوگوں نے خود اپنے پیغمبروں کی کتابوں میں بدنیتی سے تصرف کیا ہے اور اپنے مصلح رہنماؤں کے قوانین کو چھوڑ دیا ہے جیسا کہ پہلی قوموں نے کیا اور بعد کے مسلمان بھی اس کے مرتکب ہوئے ہیں۔

ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، قوانین باقاعدہ اور منظم حکومتوں کے لئے بنائے جاتے ہیں جو انہیں نافذ کرانے کے اختیارات رکھتی ہوں مگر محمد ﷺ اس عرب قوم کے لئے ایسا کام کیسے کر سکتے تھے جو ہر حکومت اور ہر قسم کے نظام سے آزاد تھی۔ آپ ﷺ خدائی حجت لے کر تن تنہا آئے تھے۔ نہ تو آپ ﷺ کو قوم کی حمایت حاصل تھی نہ حکومت آپ ﷺ کے پاس تھی۔ تاہم آپ ﷺ سب سے زیادہ منصفانہ اصول لے کر آئے تھے جن کی بنیادوں پر مناسب حالات کی صورت میں جب کوئی حکومت قائم ہو، تو قوم اچھے قوانین بنا سکتی تھی۔ آپ ﷺ صحیح دلائل کے ذریعے عوام کے اخلاق اور ان کے مزاج بدلنے کے لئے آئے تھے۔ تاکہ وہ جبریہ احکام کے ذریعے نہیں بلکہ اپنی خوشی سے مطمئن ہو کر اس عقیدے کے ساتھ اپنے اندر انقلاب پیدا کر سکیں۔ اس کے بعد خدا اسے اجی نظام کے فطری قوانین کے مطابق ان کی کایا پلٹ دے گا۔ خود قرآن کریم میں آیا ہے کہ رسول صرف تبلیغ و نصیحت کرنے کے لئے آئے ہیں وہ لوگوں پر زبردستی کرنے یا حکومت جتانے کے لئے نہیں آئے ہیں۔

یہ انقلاب اسی طرح ممکن تھا جس طرح یہ رونما ہوا۔ یہ انقلاب عرب قوم کے دلوں پر صرف قرآن کی تاثیر سے برپا ہوا۔ جو دنیا کی بدوی اور متمدن اقوام میں سب سے زیادہ اسلامی اثرات سے فطری طور پر متاثر ہونے کی صلاحیت رکھتی تھی جیسا کہ ہم نے اپنی کتاب "خلاصہ سیرت محمدی" میں بیان کیا ہے اور آگے چل کر بھی بیان کریں گے۔

انسان کی طبیعت کچھ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ خواہشوں، رسم ورواج اور عادات

کے مقابلے میں محض حق وباطل کی تمیز اور نیکی بدی کو پہچاننا، محض اس کو بیان کرنا، حکم دینا، روکنا اور اس کے مطابق عمل کرنا کافی نہیں ہے اور نہ یہ کافی ہے کہ جب معلومات حاصل ہو جائیں تو اس کے مطابق نیک کام کے فرائض انجام دیئے جائیں اور برائی کو چھوڑ دیا جائے کیونکہ جیسا کہ ہم نے ابھی اشارہ کیا ہے اس راہ میں کئی نفسیاتی اور عملی مواقع در پیش ہوتے ہیں۔ جماعتوں اور قوموں کی اس طرح اصلاح نہیں ہوتی البتہ بعض افراد ایسے ضرور نکل آتے ہیں۔

لوگوں کے دلوں میں حق اور نیکی کے راسخ کرنے اور اس کے ذریعے عملی اثر پیدا کرنے کے لئے خدائی قانون یہ ہے کہ صداقت اور نیکی پر انسان کا ایمان اس قدر پختہ ہو جائے کہ وہ قلب پر مسلط ہو کر ضمیر کی آواز بن جائے کہ اس کے مقابلے میں ہر قسم کے لالچ، خوف، امید وبیم پر وہ غالب رہے۔ نو عمروں میں یہ صورت علمی اور عملی تربیت نیز والدین، رشتہ داروں اور معاشرہ کے اسوۂ حسنہ کی بدولت پیدا کی جاسکتی ہے۔

مگر عمر رسیدہ لوگوں میں عالمگیری صداقت اور نیکی کو ضمیر کی آواز، صرف اسی طریقے سے بنایا جاسکتا ہے جس طریقے سے قرآن کریم نازل ہوا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ قرآن کریم اسی طرز بیان میں امتیازی خصوصیت رکھتا ہے کیونکہ اس طرح اس نے فوراً نوجوانوں اور بوڑھوں کے طبائع، ان کے اخلاق وعادات اور رسم ورواج میں انقلاب پیدا کر دیا اور انہیں مخالفانہ سمت میں علم وعمل کی راہ پر اس طرح گامزن کرایا کہ اس کی نظیر عالم انسانیت میں نہیں ملتی اور جس طرح قرآن کریم اپنی زبان اور اسلوب میں معجزہ ہے اس طرح اپنی تاثیر میں انسانی سماج کے لئے خلاف معمول ایک ایسا معجزہ ہے جس نے اپنی تعلیمات کی بدولت قوموں کی حیرت انگیز طریقہ سے کایا پلٹ دی۔

قرآن اور تورات کے اثرات کا مقابلہ:

مثال کے طور پر پیغمبروں کی اولاد بنو اسرائیل کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے مصر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کئی معجزے دیکھے، اس کے بعد صحرائے سینا میں بھٹکتے ہوئے کتنے معجزات مشاہدہ کئے۔ اس وقت خدا کی ان پر بڑی عنایت تھی اور جیسا کہ تورات کا بیان ہے انہوں نے اپنے کانوں سے آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں خدا کی آواز

سنی (ہمارے ہاں خدا سے ہم کلامی صرف ان کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے ثابت ہے) مگر ان تمام چیزوں کے باوجود ان کے دلوں سے، مصری بت پرستی اور وہاں کے خرافات کے پختہ اثرات محو نہیں ہو سکے جو فرعون کے ظالمانہ سیاست کی بدولت ان کے دلوں میں راسخ ہو چکے تھے۔ بلکہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بہت ستایا۔ ہر حکم میں ان کی سرکشانہ مخالفت کی یہاں تک کہ جب وہ اپنے پروردگار سے مناجات کے لئے گئے تو اپنے آقا فراعین مصر کی عبادت کی تقلید میں سونے کے بچھڑے کو پوجنے لگے۔ خود خدا نے انہیں تورات میں موئی اور سخت گردن والی قوم بتایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بہت بیوقوف، سرکش، جھگڑالو اور ٹیڑھی قوم ہے۔ ان کی یہی حالت رہی یہاں تک کہ چالیس سال کے بعد یہ بگڑی ہوئی نسل ختم ہو گئی اور ان لوگوں کی نسل آگئی جو مصر سے خروج کے وقت بچے تھے، یا صحرا میں بھٹکنے والے زمانے میں پیدا ہوئے تھے، صرف یہ لوگ توحید اور شریعت کو سمجھ سکے اور اس پر عمل بھی کرنے لگے بلکہ انہوں نے اس کے لئے جہاد بھی کیا مگر یہ سب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد رونما ہوا۔

کہاں یہ سرکش بنو اسرائیل اور کہاں محمد ﷺ کے صحابی رضی اللہ عنہ، جنہوں نے قران کریم کو سنا۔ اسے پڑھ کر اور سمجھ کر تربیت حاصل کی۔ اس طریقے سے ان کا ایمان اس قدر پختہ ہو گیا تھا کہ انہوں نے سچے دین کی راہ میں بڑے ہی صبر کے ساتھ مشرکین کے مظالم اور اذیتیں برداشت کیں پھر ہجرت کے بعد جب جہاد کرنا ممکن ہوا تو انہوں نے ان مشرکین اور ان کے مددگار اہل کتاب (یہودیوں) سے جہاد کیا اور عہد نبوی ہی میں ان دونوں جماعتوں کے کفر سے حجاز بلکہ تمام جزیرہ عرب کو پاک صاف کیا۔ بعثت محمدی ﷺ کی یہ پوری مدت صرف بیس (۲۰) سال ہے جو یہودیوں کے عہد بادیہ پیمائی سے نصف ہے، اس میں سے بھی نصف مدت اہل مکہ کی تبلیغ میں گذر گئی، باقی نصف مدت یعنی دس سال کے اندر انقلاب عرب ہوا۔ شریعت کی تنفیذ، جہاد اور فتوحات کی تکمیل ہوئی۔

پھر غور کرو کہ یہ مسلمان کس طرح بے پناہ سیلاب کی طرح جزیرۂ عرب کے ہر گوشے سے کود پڑے اور انہوں نے ان قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں الٹ دیں جو اس زمانے میں سب سے بڑے بادشاہ تھے ان ممالک سے شرک و ظلم کو دور کیا۔ توحید اور حق وانصاف کو پھیلایا بلکہ ان لوگوں کی ہدایت سے متاثر ہو کر دوسری قومیں اپنی خوشی سے جوق

درجوق دین الٰہی میں داخل ہونے لگیں۔ انہوں نے دین اسلام کے ساتھ ساتھ عربی زبان بھی سیکھی، یہاں تک کہ نصف صدی میں اپنے استادوں کے ساتھ مل کر وہ نصف دنیا پر قابض ہوگئے۔ یہ لوگ رحم اور عدل [1] میں ضرب المثل ہوگئے، یہاں تک کہ ماہرین اجتماعیات اور بڑے بڑے فوجی جرنیل بھی حیران رہ گئے ہیں۔ [2]

وہ قوم جسے خود خدا نے اپنی کتاب میں سرکش اور موٹی گردن والی قوم بیان کیا ہے، ان لوگوں کے درجے تک کیسے پہنچ سکتی ہے جن کی تعریف خود رب العالمین نے اس طرح بیان فرمائی ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللهِ وَرِضْوَانًا (۲۹:۴۸)

(محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت ہیں اور باہم ہمدرد ہیں۔ تم انہیں رکوع و سجود میں پاؤ گے وہ خدا کی مہربانی اور خوشنودی کی جستجو میں لگے رہتے ہیں۔)

چنانچہ امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب، جو جاہلیت کے دور میں بہت سخت مزاج اور سنگ دل تھے اس وقت ان کے متعلق یہ بیان کیا گیا تھا کہ انہوں نے اپنی ایک لڑکی کو زندہ دفن کیا تھا مگر اسلام کی ہدایت پا کر سب سے زیادہ رحم دل بن گئے یہاں تک کہ ایک رات انہوں نے اپنی بیوی کو ساتھ لے کر ایک غریب زچہ کے لئے کھانا پکایا جس کا اسی وقت بچہ ہوا تھا۔ اس کا شوہر موجود تھا مگر اس نے ان کا ہاتھ نہیں بٹایا اور نہ اسے یہ علم تھا کہ وہ امیر المومنین تھے۔ بے شک اس انقلاب کا باعث اس قرآن کریم کے اسلوب بیان کی تاثیر تھی جسے ہم مصاحف میں دیکھ رہے ہیں۔ اسی قرآن کریم کے ذریعے آپ ﷺ کافروں پر جہاد کرتے تھے جیسا کہ خدا نے اس طرح حکم دیا تھا۔

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِينَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيرًا ۝ (۵۲:۲۵)

(کافروں کی اطاعت نہ کرو بلکہ قرآن کریم کے ذریعے ان پر زبردست جہاد کرو۔)

---

[1] مشہور فرانسیسی فلسفی گستاف لیبان اپنی کتاب "تمدن عرب" میں تحریر کرتا ہے "تاریخ میں عربوں سے زیادہ انصاف پسند اور رحم دل فاتح نہیں گذرا ہے۔"

[2] نپولین بوناپارٹ نے جو دنیا کا مشہور جرنیل ہے، یہ کہا ہے عربوں نے دنیا کے نصف حصہ کو نصف صدی میں فتح کر لیا تھا۔ اس نے یہ بھی تصریح کی تھی کہ وہ اسلام کو قبول کرے گا جیسا کہ آپ کتاب "حاضر العالم الاسلامی" کے ضمیمہ مرتبہ امیر شکیب محمد ارسلان صفحہ ۴۲ جلد اول دوسرے ایڈیشن میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

اس قرآن کریم کے ذریعے آپ ﷺ مسلمانوں کی تربیت اور تزکیہ نفس فرماتے تھے جیسا کہ ارشاد ہے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (۳:۱۵۹)

(خدا کی مہربانی کی بدولت آپ ان کے لئے نرم ہوئے ہیں اگر آپ بدخلق اور سخت دل ہوتے تو وہ آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے لہذا آپ انہیں درگذر کیجئے اور ان کے لئے معافی مانگا کریں اور اپنے کاموں میں ان سے مشورہ لیا کریں۔)

پھر اسی قرآن کریم کی ہدایت اور اپنے مبلغ اعظم حضرت محمد ﷺ کے نمونے پر چل کر صحابہ رضی اللہ عنہ نے قوموں کی تربیت کی اور انہیں مہذب بنایا۔ آج کل جو کوئی قرآن کریم کا اسی طرح مطالعہ کرے گا جیسے وہ لوگ مطالعہ کرتے تھے تو ضرور اسی طرح ہدایت یاب ہو گا جس طرح وہ لوگ ہدایت یافتہ تھے، حالانکہ ان میں زبان، شخصیات اور زمانے کے اختلاف کا بہت بڑا فرق موجود ہے۔

ہمدرد انسانیت مسلمان:

قرآن کریم کے ماننے والے کیونکر انسانیت کے ہمدرد نہ ہوں جب کہ خداوند تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۱۰:۵۷)

(اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے (۱) نصیحت (۲) دلوں کی شفا (۳) ہدایت اور (۴) مسلمانوں کے لئے رحمت آئی ہے۔)

ہم نے قرآن کریم کی ان چار خصوصیات کی تفسیر المنار (جلد ۱۱) میں وضاحت کرتے ہوئے "رحمت" کے بارے میں اس طرح لکھا ہے۔

مسلمانوں کے لئے رحمت:

قرآن کریم کی ہدایت اور ان کے دلوں پر اس کے فیضان کا یہ اثر ہے کہ خدا کی

مخصوص رحمت ان پر نازل ہوئی ہے۔ یہ ایک صفت کمال ہے جس کا نتیجہ مصیبت زدہ کی امداد، نیک کام کرنا، ظلم کو دور کرنا، سرکشی اور زیادتی کو روکنا اور دوسرے بھلائی اور برائی کے مخالفانہ کاموں کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ خدا نے مومنوں کے اوصاف میں یہ بیان کیا ہے۔ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (وہ آپس میں رحم دل ہیں) اور ایک جگہ ارشاد ہے۔ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (وہ ایک دوسرے کو صبر اور رحم کی تلقین کرتے ہیں۔)

یہ چاروں صفات انسانی فطرت کے صحیح قوانین کی ترتیب کے مطابق ہیں۔ سب سے پہلے موعظت (نصیحت) وہ تعلیمات ہیں جب کہ نفس انسانی اپنے نقائص اور اعتقادی واخلاقی امراض کا خطرہ محسوس کرتا ہے اور ان کے علاج وشفا کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ شفاء سے کامل صحت اور پوری (روحانی) تندرستی ہوتی ہے، اس کا نام ہدایت ہے اور اس کا نتیجہ یہ رحمت ہے جو بدرجہ کمال ہدایت یافتہ مومنوں کو حاصل ہوتی ہے مگر مادہ پرست کافر اس سے محروم رہتے ہیں۔ کیونکہ بعض مادہ پرست یہ کہتے ہیں کہ رحم، دل کی بیماری ہے، جو انسانوں کو احسان اور شفقت پر مجبور کرتی ہے۔ مگر درحقیقت ایسا قول فطری خرابی، سنگدلی اور کافرانہ فلسفہ کا نتیجہ ہے۔ ورنہ سرور کائنات محمد ﷺ رسول اللہ خاتم النبیین سب لوگوں سے زیادہ بہادر اور جسم وقلب کے لحاظ سے سب سے زیادہ طاقتور تھے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ رحم دل اور مہربان بھی تھے۔ خدا نے قرآن کریم میں آپ ﷺ کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ الرَّحِيمِ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ

(مسلمانوں پر بہت شفقت کرنے والے مہربان ہیں ہم نے آپ ہی کو تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا)

آپ ﷺ کے صحابی رضی اللہ عنہ بھی ایسے ہی تھے یہاں تک کہ ان میں جو سختی اور سنگدلی میں زیادہ مشہور تھے جیسے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، وہ سب سے زیادہ رحم دل بن گئے تھے۔ آپ ﷺ کے اسی قسم کے واقعات بہت مشہور ہیں ان میں سے ایک واقعہ کی طرف ہم نے ابھی اشارہ کیا تھا۔

رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے "صرف بدبخت ہی رحمدلی سے خالی ہوتا ہے"۔ ان الفاظ کو ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت ابوہریرہ کی روایت سے بیان کیا ہے نیز یہ

بھی صحیح روایت ہے کہ جب آپ ﷺ نماز میں کسی بچے کے رونے کی آواز سنتے تھے تو آپ ﷺ اس پر اور اس کی والدہ پر ترس کھا کر نماز کو مختصر کر دیتے تھے۔ ابن اسحاق نے روایت کی ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ صفیہ اور ان کی چچازاد اور بہن کے پاس سے گذرے جب کہ جنگ خیبر کے اختتام کے بعد وہ دونوں اپنے مقتول یہودی رشتہ داروں پر ماتم کر رہی تھیں۔ انہوں نے دیکھا کہ صفیہ کی چچیری بہن اپنے چہرے پر دوہتڑ مار رہی تھی اور چہرے پر خاک ڈال کر چلا رہی تھی اور رو رہی تھی، آپ ﷺ نے یہ واقعہ سن کر فرمایا، تم ان دو عورتوں کے پاس سے گذرے تھے، جب کہ وہ اپنے مقتولین پر رو رہی تھیں تو کیا اس وقت تمہارا دل رحم سے خالی ہو گیا تھا؟

ایک دفعہ ایک اعرابی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور اس نے کہا "آپ لوگ اپنی اولاد کو چومتے ہیں لیکن ہم نہیں چومتے ہیں۔" آپ نے فرمایا میرے اختیار میں نہیں ہے کہ میں تمہیں اس چیز کا احساس دلاؤں جس کا تمہیں شعور نہیں ہے۔ کیونکہ خدا نے تمہارے قلب سے رحم کے جذبات کو نکال لیا ہے۔" امام بخاری اور مسلم نے حضرت عائشہ کی روایت سے اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔

بلکہ آپ ﷺ چوپاؤں، پرندوں اور حشرات الارض پر بھی ترس کھاتے تھے اور اکثر آپ ﷺ، ان کے بارے میں بالخصوص چھوٹے بچوں اور ان کی ماؤں کے حق میں بہت تاکید فرماتے تھے۔ ایک دفعہ آپ ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا۔ وہ کمبل اوڑھے ہوئے تھے اور اس کے ہاتھ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز تھی اس نے کہا "اے رسول اللہ! جب میں نے آپ کو دیکھا تو میں آپ کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں ایک جھاڑی کے پاس سے گذرا وہاں میں نے پرندے کے چوزوں کی آوازیں سنیں، میں نے انہیں پکڑ کر کمبل میں لپیٹ لیا اس پر ان کی ماں آکر میرے سر کے گرد منڈلانے لگی۔ جب میں نے انہیں کھول کر دکھایا تو وہ ان پر گر پڑی اور میں نے انہی کے ساتھ اس کو بھی لپیٹ لیا۔ اب یہ سب میرے ساتھ ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا "انہیں زمین پر رکھ دو" اس نے انہیں رکھ دیا مگر ان کی ماں بدستور ان سے چمٹی رہی۔ آپ ﷺ نے فرمایا "کیا تم ان چوزوں کی ماں کی رحم دلی پر تعجب کرتے ہو" لوگوں نے کہا "ہاں" آپ ﷺ نے فرمایا "اس ذات کی قسم جس نے مجھے سچا رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اللہ اپنے بندوں پر اس سے زیادہ رحم فرماتا ہے

جس قدر ان چوزوں کی ماں اپنے چوزوں پر مہربان ہے۔ تم جہاں سے لائے ہو وہیں جا کر انہیں ان کی ماں کے ساتھ رکھ دو۔" چنانچہ وہ آدمی انہیں ماں کے اصلی مقام پر واپس کر آیا۔ اس حدیث کو ابو داؤد نے عامر الرامی کے واسطہ سے نقل کیا ہے۔ امام مالک، امام بخاری اور مسلم اور ابوداؤد نے حضرت ابوہریرہ کے واسطہ سے دو مرفوع حدیثیں نقل کی ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے ایک مرد اور ایک بدکار عورت کی مغفرت فرمائی کیونکہ دونوں نے ایک کتے کو دیکھا تھا جو بہت پیاسا تھا، انہوں نے اس پر ترس کھایا اور اپنے موزے کے ذریعے کنویں سے پانی نکال کر پلایا۔ اس پر صحابہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا "یارسول اللہ! کیا چوپایوں پر بھی ثواب ملتا ہے"۔آپ ﷺ نے فرمایا "ہر تروتازہ جگر والی (زندہ) شے پر ثواب ہے۔" امام احمد نے حضرت عبداللہ بن عمر اور سراقہ بن مالک کے واسطوں سے بھی اس قسم کی حدیث روایت کی ہے۔

امام ترمذی اور ابوداؤد نے حضرت عبداللہ بن عمرو کے واسطے سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا "رحم کرنے والوں پر خدائے رحمٰن رحم کرتا ہے تم ان لوگوں پر رحم کرو جو زمین پر ہیں۔ خدا جو آسمان پر ہے تم پر رحم کرے گا۔ بقول حالی:

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر | خدا مہربان ہوگا عرش بریں پر

ہم نے اپنے استاد شیخ ابوالمحاسن القاوقجی کے واسطے یہ مسلسل حدیث روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "بے شک اللہ کے پاس سو (۱۰۰) طرح کی رحمتیں ہیں، جن میں سے صرف ایک قسم کا رحم اس نے جنات، انسانوں، چوپایوں اور کیڑوں پر نازل فرمایا ہے جس کے ذریعے وہ ایک دوسرے پر رحم اور شفقت سے پیش آتے ہیں اور اس کی بدولت جنگلی جانور اپنی اولاد سے محبت کرتے ہیں۔ باقی ننانوے (۹۹) رحمتیں خدا نے ملتوی کر رکھی ہیں جن سے وہ قیامت کے دن اپنے بندوں پر رحم فرما کر کام لے گا۔"

ایک دوسری روایت میں آیا ہے کہ "اگر کافر کو یہ معلوم ہو جائے کہ خدا کس قدر رحیم ہے تو وہ جنت سے مایوس نہیں ہوگا اور اگر مومن کو معلوم ہو جائے کہ خدا کسی قدر عذاب دے سکتا ہے تو وہ دوزخ سے بے خوف نہیں ہوگا، اسی حدیث کو امام بخاری، مسلم اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔

اگر قرآن کریم علمی اور قوانین کی کتابوں کے انداز پر ہوتا تو اس میں وہ دلکشی ہرگز پیدا نہیں ہوسکتی تھی جس کی بدولت نہ صرف عربوں میں انقلاب آیا بلکہ انہوں نے عجمی قوموں میں بھی انقلاب برپا کیا۔ اس زمانے کے مسلمان ویسے تھے جیسے کہ خدا نے فرمایا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (پ ۴ : ۱۱۰)

(اے مسلمانوں) تم بہترین قوم ہو جو لوگوں (کی ہدایت) کے لئے تیار کی گئی ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ اگر اہل کتاب ایمان لے آئیں تو ان کے حق میں اچھا ہے ان میں سے کچھ ہی مومن ہیں اور اکثر فاسق ہیں۔)

ان عربوں کے پاس قوموں کی سیاست وانتظامات کے بارے میں کچھ بھی معلومات نہ تھیں۔ ان کے سامنے صرف قرآن کریم اور اسلام کے پہلے مبلغ اعظم رسول اللہ ﷺ کا اسوۂ حسنہ تھا۔ لہٰذا اب بھی مسلمانوں کی گذشتہ شان وشوکت صرف اسی وقت واپس آسکتی ہے جب وہ قرآنی ہدایت کی طرف متوجہ ہو کر اس کی انقلابی تحریک کو از سر نو زندہ کریں۔

ان لوگوں پر خدا کی لعنت ہو، جو یہ کہہ کر مسلمانوں کو قرآن کریم سے باز رکھتے ہیں کہ ان کے مشائخ کی کتابوں نے انہیں قرآن کریم اور اس کے شارح کی سنت پر عمل کرنے سے بے نیاز کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ کتابیں خشک اور بے جان ہیں اور ہر اس چیز سے خالی ہیں جو ایمان کو زندہ، ہمت کو بلند، روحوں کو پاکیزہ اور دلوں میں جانی اور مالی جہاد کا جذبہ پیدا کر سکے۔

اصلی حقیقت یہ ہے کہ خدا نے قرآن کریم کے علاوہ اور کوئی چیز نازل نہیں فرمائی لہٰذا دنیا کی تمام الہامی اور غیر الہامی تصنیفات ہمیں قرآن کریم پر غور وفکر کرنے اور اس سے ہدایت یاب ہونے یا اس کی کسی ایک سورت کے سمجھنے سے بے نیاز نہیں کر سکتیں۔ شیطان نے اس مسلمان قوم کو اس قدر زیادہ نقصان نہیں پہنچایا جس قدر اس نے یہ فتنہ وفساد برپا کیا کہ اس نے مسلمانوں کو قرآن کریم اور اس کی شارح سنت نبوی کے ذریعے اپنی اصلاح وتربیت کرنے سے روکا، اور اس وجہ سے وہ تمام اقوام عالم کو بھی قرآنی ہدایت

کی دعوت نہ دے سکے۔ حالانکہ ہم نے قرآن اور تورات کے اثرات کو اچھی طرح واضح کر دیا۔ اب ہم اجمالی طور پر یہ بیان کرتے ہیں کہ قرآن کریم نے عرب قوم میں اور اس کے بعد دنیا میں کیا انقلاب برپا کیا۔

قرآن کے ذریعے عالم گیر انقلاب:

بہت سے عرب اسلام سے صدیوں پہلے یہودی اور عیسائی ہو گئے تھے، ان میں سے ہر ایک اپنے مذہب کی تعریف کرتا تھا اور اس کی دعوت دیتا تھا مگر عوام نے کبھی ان کے ساتھ دشمنی نہیں کی یا اس کے مذہب کو حقیر نہیں سمجھا بلکہ عرب یہودی رہنما اور عیسائی شعراء کو اپنے ہم پلہ مشرکین مکہ کے برابر درجہ حاصل تھا۔ تاہم یہودیت اور نصرانیت کا مکہ میں کوئی رعب اور دبدبہ نہ تھا اور نہ قریش کے سرداران کی مذہبی اور دنیاوی قیادت سے خائف تھے مگر جب محمد بن عبداللہ (ﷺ) اللہ کے نام پر انہیں قرآن کریم پڑھ کر سنانے لگے تو ان کی سرزمین میں زلزلہ آگیا اور ان میں چھوٹا انقلاب برپا ہوا، اس کے بعد اس کا اثر تمام قوم تک پھیلا اور ایک بہت بڑا انقلاب رونما ہوا جس سے ان کی زمین ایک دوسری زمین میں تبدیل ہوئی اور لوگوں کے دلوں اور عقل کی کایا پلٹ ہو گئی بلکہ تمام سماجی نظام الٹ پلٹ ہو گیا۔

اس انقلاب عظیم کے رونما کرنے میں قرآن کریم نے عربوں پر دو گونہ اثر کیا۔ سب سے پہلے اس نے مشرکین مکہ کے ایوان میں تہلکہ مچا دیا۔ دوسرا مرحلہ یہ تھا کہ اس نے مسلمانوں کا تزکیۂ نفس کیا اور ان کے دلوں کو جہالت، ظلم، فساد اور کینہ سے پاک و صاف کیا۔ اور ان کے ذریعے عالم گیر اصلاح ہوئی۔ اس بیان کی وضاحت کے لئے میں تمہیداً ظہور اسلام کے زمانے کا حال تحریر کروں گا۔

عربوں کی فطری صلاحیت:

ہم بار بار بتا چکے ہیں کہ خدا نے عرب قوم کو اور بالخصوص قریش اور اس کے ماحول کو عالمگیر انسانی اصلاح کے تیار کر رکھا تھا کیونکہ وہ تمام قوموں سے زیادہ سلیم فطرت رکھتے تھے۔ اور ان کے پاس اظہار تاثیر و اظہار خیال کے لئے سب سے زیادہ ترقی یافتہ زبان تھی

نیز وہ عقل وارادہ میں سب سے زیادہ خود مختار تھے کیونکہ وہاں استبداد پسند بادشاہ نہ تھے جو ان کی ہمتوں کو کمزور اور ان کے حوصلوں کو خراب کرتے اور ان کی خود داری کو ٹھیس لگاتے۔ عربوں کے ہاں روحانی اقتدار رکھنے والے مذہبی رہنما بھی نہ تھے جو اُن کے دل و دماغ پر مسلط رہتے اور ان کے عقائد و خیالات سے کھیلتے اور اپنے مفادات کے لئے انہیں آلۂ کار بناتے۔ ان کے برعکس اس وقت کی تمام مہذب قومیں ان دونوں قسم کے رہنماؤں کی غلام بن کر ذلیل ہو چکی تھی۔

چنانچہ جب محمد ﷺ اس قرآن کو لے کر آئے جو حق اور صراط مستقیم کی دعوت دے رہا تھا۔ تو اس وقت عرب آپ کی تحریک کو قبول کرنے کی مکمل فطری صلاحیت رکھتے تھے لیکن قریش کے سردار وسیع دولت سے لطف اندوزی، جھوٹی عظمت، شہرت پرستی، اور عیش پسندی کی وجہ سے عجمی بادشاہوں کے قریب ہو گئے تھے اور انہیں مذہبی رہنماؤں کی طرح مذہبی حیثیت بھی حاصل تھی کیونکہ وہ خانہ کعبہ کے مجاور تھے جس کی تعظیم کا جذبہ عربوں کے دلوں میں حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کے زمانے سے موجزن تھا۔ لہٰذا جب انہوں نے دیکھا کہ یہ آزاد مذہب ان کی موروثی عظمت کی ٹھیکیداری کو چھین لے گا اور ممکن ہے کہ وہ بعض غریبوں اور غلاموں کو ان پر فوقیت دے نیز یہ منصب انہیں اور ان کے مایہ ناز آباء واجداد کو کفر جہالت، ظلم اور فسق وفجور کی طرف منسوب کرتا ہے اور انہیں مویشیوں کے برابر سمجھتا ہے۔ اس لئے انہوں نے اپنا پورا زور اور اثر واقتدار کو اس کام کے لئے وقف کر دیا کہ وہ محمد (ﷺ) کو دعوت اسلام سے روکیں خواہ انہیں آپ ﷺ کو بادشاہ یا دولت مند ترین شخص ہی بنانا پڑے لیکن وہ مال اور بادشاہت کی ترغیب سے بھی آپ ﷺ کو نہ روک سکے کیونکہ جب انہوں نے یہ تجویز آپ ﷺ کے چچا ابو طالب کے سامنے پیش کی تو آپ ﷺ نے نہایت بلند الفاظ میں جواب دیا۔

"اے میرے چچا! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج کو اور چاند کو میرے بائیں ہاتھ پر رکھ دیں تو میں اس وقت بھی اس کام کو نہیں چھوڑوں کا یہاں تک کہ خدا اس کا بول بالا کرے یا میں اس کام میں ہلاک ہو جاؤں۔"

انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ زور اور تشدد سے آپ ﷺ کی تبلیغ کو روکیں گے اور بازاروں، میلوں اور خانہ کعبہ میں لوگوں کو آپ تک پہنچنے سے روکیں گے، اور انہیں آپ

ﷺ کے پاس آنے اور خدا کا کلام سننے سے منع کریں گے بلکہ انفرادی طور پر جو آپ ﷺ کی دعوت قبول کرے گا اس پر ظلم کریں گے بشرطیکہ اس کا کوئی رشتہ دار یا حلیف حمایتی نہ ہو:

یہ عیش پسند متکبر سردار سب سے زیادہ آپ ﷺ کی صداقت سے واقف تھے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِىْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (پ ۲۸: ۳۳)

(ہم جانتے ہیں کہ آپ کو (اے پیغمبر) ان کی باتوں سے رنج پہنچتا ہے وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے ہیں بلکہ وہ ظالم، خدا کی آیتوں کا جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں۔)

انہوں نے محض اپنی قیادت اور مفادات کے تحفظ کے خیال سے سرکشی اور تکبر کے ساتھ حق سے منہ موڑا۔ حالانکہ عربوں میں وہ سب سے زیادہ قرآنی دعوت کے قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے کیونکہ وہ اسے سب سے زیادہ بخوبی سمجھتے تھے اور انہیں اس کی معجز بیانی کا وسیع ترین علم تھا مگر انہوں نے بے حد سرکشی کی۔

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا (النمل: ۱۴)

(انہوں نے اللہ کی آیتوں کا ظلم اور سرکشی کی وجہ سے انکار کیا حالانکہ ان کے دلوں میں ان کا یقین پیدا ہو چکا تھا۔)

انکی حالت ایسی تھی جیسی فرعون، قارون اور ہامان کی حضرت موسیٰ کے معجزوں کو دیکھ کر ہوئی تھی۔

قرآن کے اثرات مشرکین عرب پر:

ہم نے پہلے بیان کیا تھا کہ قرآن کریم کے عربوں پر دو طرح کے اثرات تھے۔ اس کا پہلا اثر مشرکوں پر ہوا دوسرا مومنوں پر۔ پہلا اثر اس کی اعلیٰ بلاغت اور اس حیرت انگیز ترتیب اور طرز بیان کا نتیجہ تھا جس کی کشش اس کی دعوت کو سمجھنے اور اس پر ایمان لانے پر مجبور کرتی تھی کیونکہ، اس کا حسن و جمال کسی سے پوشیدہ نہیں تھا۔ تاہم اس معاملے میں ان سب کی قوت ادراک یکساں نہ تھی۔ ہر ایک اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اس کی بلاغت اور اعلیٰ

خیالات کو سمجھتا تھا۔

قرآن کریم کا یہی بے پناہ اثر تھا جس نے ولید بن مغیرہ المخزومی کو ابو جہل کے سامنے بلند الفاظ کہنے پر مجبور کیا اور اس نے اعتراف کیا کہ "یہ وہ صداقت ہے جو بلند ہوتی جائے گی مگر اس پر کوئی چیز غالب نہیں آسکتی اور جو چیز اس کے مقابلے میں آئے گی اسے وہ پاش پاش کر دے گا"۔ یہ بات اس کی عقل کے نور اور ضمیر کی گہرائیوں سے نکلی تھی جب ابو جہل نے بہت مجبور کیا تو وہ اس اعتراف کے خلاف جو کچھ کہہ سکا وہ تکلف اور اس کے ضمیر کے خلاف بہت غور و خوض کا نتیجہ تھا۔ اس نے جو کچھ کہا وہ منہ بنا کر اور تکبر سے کہا، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

قرآن کریم کا یہی وہ عجیب اثر تھا کہ قریش کے سرکش اور منکر سردار ایک طرف سب کو قرآن کریم کی سماعت سے روکتے تھے، دوسری طرف وہ راتوں کو چھپ چھپ کر آپ کے گھر کے قریب کشاں کشاں جاتے تھے۔ تا کہ آپ کی تلاوت سنیں۔ اس کے بعد واپسی پر ایک دوسرے کو نصیحت کرتے تھے اور قسمیں کھاتے تھے کہ وہ ہرگز نہیں سنیں گے۔ مگر اس کے باوجود چپکے سے تن تنہا چلے جاتے تھے اور جب راستے میں ملاقات ہوتی تو ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے تھے۔ [1]

---

[1] یہ لوگ ابو جہل، ابو سفیان اور اخنس بن شریق تھے۔ ان میں سے ہر ایک ایسے رخ سے آکر آپ کی تلاوت کو سنا کرتا تھا جس رخ سے کوئی ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکے۔ واپسی پر جب وہ ملتے تھے تو ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے تھے اور وعدہ کرتے کہ وہ دوبارہ نہیں آئیں گے ایسا نہ ہو کہ دوسروں کو یہ بات معلوم ہو جائے اور وہ بھی ان کی پیروی کرنے لگیں۔ تیسرے دن انہوں نے پختہ عہد کیا کہ پھر نہیں جائیں گے۔ جب صبح طلوع ہوئی تو اخنس ابو سفیان کے گھر گیا اور اس سے پوچھنے لگا "اے ابو حنظلہ! محمد (ﷺ) سے جو آپ نے سنا اسکے بارے میں مجھے اپنی رائے ظاہر کیجئے" اس نے کہا "اے ابو ثعلبہ! خدا کی قسم میں نے وہ باتیں سنیں جنہیں میں جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اس سے کیا مراد ہے" (یعنی وہ ان باتوں کا منکر نہیں ہے) اخنس نے کہا میری بھی یہی رائے ہے پھر اخنس نے ابو جہل کے گھر جا کر ابو جہل سے وہی سوال کیا جو اس نے ابو سفیان سے کیا تھا اس پر ابو جہل نے کہا "میں نے کیا سنا؟ بات دراصل یہ ہے کہ شرافت اور بزرگی پر ہمارا عبد مناف کی اولاد سے جھگڑا اور مقابلہ چلا آ رہا ہے، وہ کھانا کھلاتے تھے تو ہم نے بھی کھانا کھلانا شروع کیا وہ اونٹوں پر سوار کراتے تھے تو ہم نے بھی ایسا کرنا شروع کیا انہوں نے بخشش کی تو ہم بھی بخششیں کرنے لگے یہاں تک کہ جب ہر معاملے میں ہم گھوڑ دوڑ کے دو گھوڑوں کی طرح ہو گئے تو وہ کہنے لگے "ہم میں سے ایک نبی ہوگا جس کے پاس آسمان سے وحی آتی ہے"۔ "ہمیں کب یہ بات حاصل ہوگی؟ خدا کی قسم ہم اس کا کلام نہیں سنیں گے اور نہ اس کی تصدیق کریں گے۔ بیہقی نے اسے دلائل النبوۃ میں روایت کیا ہے۔ اس سے ابو جہل کے اس اقرار کا پتہ چلتا ہے کہ وحی ایسا مقام ہے جسے حاصل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ انسان کی طاقت سے باہر ہے۔

قرآن کریم کا یہی وہ اثر تھا جس کی وجہ سے انہوں نے حضرت ابو بکر صدیق کو خانہ کعبہ میں نماز پڑھنے اور تلاوت کرنے سے منع کر دیا تھا کیونکہ آپ کی تلاوت اور نماز میں آپ کی گریہ وزاری ان کے لئے اسلام کی طرف کشش کا ذریعہ بن گئی انہوں نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ ایسا نہ ہو کہ عورتیں اور بچے انہیں اسلام کے معاملے میں بے بس کر دیں۔ مگر جب انہوں نے اپنے گھر کے صحن میں اپنی مسجد بنالی تو وہاں بھی عورتیں اور کم عمر لڑکے ہر طرف سے چپکے چل کے رات کے وقت قرآن کریم سننے کے لئے آنے لگے۔ اس پر مشرکوں کے سرداروں نے پھر منع کیا اور کہنے لگے کہ اصل سبب ابھی باقی ہے۔ انہیں اندیشہ ہے کہ ان کی عورتیں اور بچے انہیں اسلام پر مجبور نہ کر دیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ہجرت پر مجبور کیا اور وہ روانہ ہو گئے۔ راستے میں ابن الدغنہ ملا جو اپنی قوم کا سردار تھا جب اس نے ان سے ہجرت کا سبب دریافت کیا، تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے سب ماجرا سنایا۔ یہ شخص حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خوبیوں سے اچھی طرح واقف تھا، اس لئے اس نے انہیں اپنی پناہ دے دی اور مکہ معظمہ لوٹایا تاکہ وہ اس کی حفاظت اور پناہ میں رہیں۔

اسی واقعہ کو امام بخاری نے اپنی کتاب کے باب الہجرۃ میں بیان کیا ہے اس کی عبارت مندرجہ ذیل ہے "قریش نے ابن السرغنہ کی پناہ کو تسلیم کر لیا اور ابن الدغنہ سے کہا "ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کہہ دو کہ وہ اپنے رب کی گھر میں عبادت کر لے مگر اپنی نماز کا اعلان نہ کرے اور اپنے گھر کے علاوہ اور کسی جگہ تلاوت نہ کرے"۔ اس کے بعد حضرت ابو بکر نے اپنے گھر کے صحن میں ایک مسجد بنائی اور وہاں نماز اور قرآن کریم پڑھنے لگے۔ مشرکین کی عورتیں اور بچے وہاں بھی ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ وہ انہیں بہت پسند کرتے تھے اور انہیں غور سے دیکھا کرتے تھے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بہت روتے تھے اور جب قرآن شریف پڑھتے تھے تو آنسو ضبط نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا قریش کے سردار یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئے اور انہوں نے ابن الدغنہ کو بلا بھیجا جب وہ آیا تو وہ کہنے لگے "ہم نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو تمہاری پناہ میں اس شرط پر دیا تھا کہ وہ اپنے گھر ہی میں اپنے خدا کی عبادت کر لے مگر انہوں نے اس سے تجاوز کر کے اپنے گھر کے صحن میں مسجد بنالی ہے اور کھلم کھلا نماز اور قرآن شریف پڑھنے لگے ہیں، ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ ہماری عورتوں اور

لوگوں کو نہ بہکا دیں۔ اس لئے تم اسے منع کرو اگر وہ چاہے کہ وہ صرف اپنے گھر میں عبادت کر لے تو اسے اجازت ہے، لیکن اگر وہ عبادت اعلانیہ کرنے پر مصر ہیں تو ان سے کہو وہ تمہاری پناہ کو لوٹا دیں کیونکہ ہم نہیں چاہتے کہ تمہاری عہد شکنی ہو، ہم ابو بکرؓ کو علانیہ قرآن پڑھنے کی اجازت نہیں دے سکتے" حضرت عائشہ فرماتی ہیں ابن الدغنہ حضرت ابو بکرؓ کے پاس آکر کہنے لگے "آپ کو معلوم ہے جو میں نے معاہدہ کیا تھا للذا یا تو آپ اس پر قائم رہیں یا میری پناہ کو لوٹا دیں کیونکہ مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ عربوں کو یہ معلوم ہو کہ میں نے کسی شخص کے ساتھ عہد شکنی کی ہے"۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "میں تمہاری پناہ لوٹا دیتا ہوں، میرے لئے خدا کی پناہ کافی ہے۔"

قرآن کریم کا یہی اثر دیکھ کر مشرکین طاقت کے زور سے آپ ﷺ کو خانہ کعبہ، حج کے میلوں اور مجمعوں میں قرآن کریم کی تلاوت سے روکتے تھے یہاں تک کہ وہ آپ ﷺ پر پتھر بھی پھینکتے تھے اور ایک دوسرے کو آپ ﷺ کے خلاف ورغلاتے تھے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ ﴿٢٦﴾ (٤١:٢٦)

(کافروں نے کہا کہ اس قرآن کو نہ سنو اور اس کے مقابلے میں شور و غل کرو شاید تم غالب آجاؤ۔)

فرانس کے ایک فلسفی نے اس نکتہ کو سمجھ لیا تھا اس نے عیسائی پادریوں کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "محمد (ﷺ) نے اپنی نبوت کے ثبوت میں حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ جیسے معجزات نہیں دکھائے"۔ اس کے بعد اس نے ان کی تردید میں یہ لکھا ہے۔

"محمد (ﷺ) قرآن کریم بہت خشوع و خضوع کے ساتھ والہانہ انداز میں پڑھا کرتے تھے، ان کی تلاوت لوگوں کے لئے اس قدر ایمانی کشش رکھتی تھی کہ گذشتہ پیغمبروں کے تمام معجزات اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔"

ہم کہتے ہیں کہ اگر قرآن کریم دوسری قانون اور فنی کتابوں کی طرح ابواب میں مرتب ہوتا تو اس کے کسی حصے میں وہ دلکشی نہ ہوتی جو اب اس کی الہامی سورتوں میں پائی جاتی ہے۔

اس فلسفی کے قول کی تائید میں بہت سے واقعات ہیں، ان میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ (ابتدائی تبلیغ کے زمانے میں) قریش کے بڑے بڑے سردار جمع ہوئے اور آپس میں

کہنے لگے "تم میں سے جو کوئی سحر، کہانت اور شاعری میں سب سے زیادہ واقف ہو، وہ اس آدمی کے پاس جائے جس نے ہماری جماعت میں تفریق ڈال دی ہے وہ ہمارے نظام کو درہم برہم کر کے ہمارے مذہب میں عیب نکالتا ہے۔ ایسا شخص جا کر اس سے گفتگو کرے اور دیکھے کہ وہ کیا جواب دیتا ہے۔" انہوں نے کہا: "ہمیں عتبہ بن ربیعہ کے علاوہ اور کوئی آدمی نظر نہیں آتا ہے وہی اس کے لئے موزوں ہے۔" لہٰذا عتبہ بن ربیعہ آپ ﷺ کے پاس آیا اور جو بات انہوں نے کہی تھی وہ بیان کی۔ اس نے کہا کہ انہیں یہ اندیشہ ہے کہ اس (تبلیغ) کا انجام یہ ہوگا کہ لوگ ایک دوسرے کے خلاف تلواریں لے کر اٹھ کھڑے ہوں گے لہٰذا جو آپ چاہیں۔ مال ہو یا حکومت، یا قریش کی بہترین دس عورتوں سے شادی کریں ان سب کے لئے وہ تیار ہیں۔ جب اس نے اپنی گفتگو ختم کی تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے سامنے سورہ حم السجدہ تلاوت فرمائی۔ جب آپ ﷺ اس آیت تک پہنچے۔

فَاِنۡ اَعۡرَضُوۡا فَقُلۡ اَنۡذَرۡتُكُمۡ صٰعِقَةً مِّثۡلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوۡدَ ؁ (۴۱: ۱۳)

(اگر وہ نہ مانیں تو (اے پیغمبر) کہہ دیجئے کہ میں نے تمہیں عاد و ثمود جیسے عذاب سے خبردار کر دیا ہے۔)

یہ سن کر عتبہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے آپ ﷺ کا منہ بند کر کے رشتہ داری کا واسطہ دے کر درخواست کی کہ آپ ﷺ تلاوت سے باز آجائیں۔ جب وہ اپنی قوم کے پاس آیا تو انہوں نے اسے بدلا ہوا پایا وہ سمجھے کہ وہ بھی محمد (ﷺ) کی طرف مائل ہو گیا ہے اس نے پورا واقعہ سنایا اور بتایا کہ آپ ﷺ کی تلاوت سے اس کے دل پر کس قدر رعب چھا گیا تھا۔ آخر میں اس نے کہا "تمہیں معلوم ہے کہ محمد (ﷺ) جب کوئی بات کہتے ہیں، تو جھوٹ نہیں بولتے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر عذاب نازل ہوگا"۔ دوسری روایت میں یہ آیا ہے کہ اس نے یہ بھی کہا "آپ ﷺ نے مجھے ایسا کلام سنایا کہ خدا کی قسم میرے کانوں نے ایسا کلام کبھی نہیں سنا تھا اس لئے میری سمجھ میں نہیں آسکا کہ میں کیا کہوں" (یہ محدثین کی روایت کا خلاصہ ہے اس کی تفصیل سیرت نبوی ﷺ کی کتابوں میں مذکور ہے۔)

رسول اکرم ﷺ صرف یہی چاہتے تھے کہ یہ لوگ آپ ﷺ کو صرف اس بات

کا موقع دیں کہ آپ ﷺ لوگوں کے سامنے قرآن کریم کی تلاوت کر کے خدائی پیغام کو پہنچادیں جیسا کہ خداوند تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا ہے۔

قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللّٰهُ ۟ شَهِیْدٌۢ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ (۶:۱۹)

((اے پیغمبر) پوچھ کہ سب سے بڑی شہادت والی کون سی چیز ہے؟ کہہ دو اللہ تمہارے اور میرے درمیان گواہ ہے۔ یہ قرآن مجھ پر اس لئے نازل کیا گیا ہے کہ میں اس کے ذریعے تمہیں اور ان سب کو خبردار کروں جن تک وہ پہنچے۔)

اِنَّمَاۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِیْ حَرَّمَهَا وَ لَهٗ كُلُّ شَیْءٍ ؗ وَّ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۙ﴿۹۱﴾ وَ اَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰی فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ ﴿۹۲﴾ وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَیُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا ؕ وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾ (۲۷:۹۲، ۹۳)

(مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں اس شہر کے پروردگار کی عبادت کروں جسے اس نے عزت بخشی ہے اور ہر چیز اسی کی ہے اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں اسلام لانے والوں میں سے ہو جاؤں اور یہ کہ میں اس قرآن کی تلاوت کروں پس جو کوئی ہدایت حاصل کرے گا تو اپنے لئے حاصل کرے گا اور جو کوئی گمراہ ہو جائے تو (اے پیغمبر) کہہ دو کہ میں تو صرف خبردار کر دینے والا ہوں اور کہو تمام تعریف اللہ کے لئے ہے جو عنقریب تمہیں اپنی نشانیاں ظاہر کرے گا جسے تم پہچان لو گے۔ تمہارا پروردگار تمہارے کاموں سے غافل نہیں ہے۔)

قریش کے سرداروں کو خوب معلوم تھا کہ لوگوں کے لئے اسلام کشش کا باعث ہے کیونکہ وہ خود اس میں پھنس چکے تھے اس لئے ان سے زیادہ اور کون واقف ہو سکتا تھا؟ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ اس کی مخالفت کر سکتے ہیں مگر دوسرے عربوں کے لئے یہ بھی ناممکن ہے۔ اس بات کو دیکھتے ہوئے آپ ﷺ کے چچا ابو لہب نے ان سے کہنا شروع کیا تھا "اس شخص کا تدارک کرو اس سے پہلے کہ عرب اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں" چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔

جب انہوں نے دیکھا کہ آپ ﷺ بڑی ثابت قدمی سے اپنی دعوت پھیلا رہے ہیں اور ہر طرح کی سختیاں برداشت کر رہے ہیں تو انہوں نے آپ ﷺ کو اور مسلمانوں کو اور زیادہ تکلیفیں دینی شروع کیں یہاں تک کہ مسلمانوں کو بار بار ہجرت پر مجبور کیا گیا۔ اس

کے بعد انہوں نے متفقہ طور پر آپ ﷺ کے قتل کی سازش کی، اس لئے آپ ﷺ کو اپنے وطن سے ہجرت کرنی پڑی۔ وہ اس پر بھی باز نہیں آئے بلکہ دارالہجرت اور اس کے آس پاس بھی جنگ کرتے رہے مگر خدا کی نصرت ہمیشہ آپ ﷺ کے شامل حال رہی۔ آخر کار آپ کے دشمن مجبور ہوئے کہ ۶ھ میں حدیبیہ کا صلح نامہ تحریر کریں۔ صلح کی اہم شرط یہ تھی کہ مسلمانوں کو اجازت ہوگی کہ وہ مشرکین سے میل جول رکھیں۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ انہیں قرآن کریم کی سماعت کا موقع ملا اور قرآن کی تاثیر سے وہ لوگ جوق در جوق خدا کے مذہب میں داخل ہونے لگے، لہٰذا امن وامان کے چار سال میں اسلام اس سے کئی گنا زیادہ پھیلا جتنا وہ اسلام کے ابتدائی سولہ سال میں پھیل چکا تھا۔

مسلمانوں پر قرآن کریم کے اثرات:

ہجرت سے پہلے جو کوئی مسلمان ہوتا تھا اسے قرآن کی وہ سورتیں جو اس وقت تک نازل ہوئی تھیں سکھائی جاتی تھیں تاکہ وہ عبادت میں اس کی تلاوت کریں۔ اسے نماز بھی سکھائی جاتی تھی کیونکہ اس کے علاوہ دیگر ارکان اسلام مکہ معظمہ میں فرض نہیں ہوئے تھے۔ مسلمان آپ ﷺ کی اتباع میں یاد کی ہوئی سورتیں خوش الحانی کے ساتھ پڑھتے تھے۔ چنانچہ خدا سورۂ مزمل کے شروع میں فرماتا ہے۔

يَآاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۭ (۷۳:۱تا۴)

(اے کپڑے میں لپٹنے والے! رات کو (نماز کے لئے) اٹھا کرو مگر کم (ساری رات نہیں) آدھی رات یا اس میں سے کچھ کمی بیشی کرلو اور قرآن کریم خوب صاف صاف پڑھا کرو۔)

اسی سورت کے آخر میں ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَاۗىِٕفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ۭ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۭ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ۭ (پ ۷۳:۲۰)

(بے شک تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ تم اور تمہارے کچھ ساتھی (دو تہائی رات) آدھی رات اور ایک تہائی رات کے قریب اٹھا کرتے ہیں۔ رات اور دن کا پورا اندازہ اللہ ہی کرتا ہے اسے معلوم ہے کہ تم اسے

نباہ نہیں سکو گے اس لئے اس نے تمہیں معاف کر دیا اس لئے قرآن کریم میں سے اتنا پڑھو جتنا تم آسانی سے پڑھ سکتے ہو۔)

اس کے بعد اس میں ان مجبوریوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو تمام رات قیام کرنے سے روکتی ہیں۔ ایسی مجبوریاں کچھ اس زمانے میں موجود تھیں جیسے بیماری، سفر اور کچھ چند سالوں بعد ہونے والی تھیں جیسے خدا کی راہ میں جہاد کرنا۔

اس زمانے میں صحابہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ جو کوئی رات کے وقت ان کے گھر کے پاس سے گذرتا تھا تو ان کے قرآن کریم کی تلاوت کرنے کی آوازیں ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے شہد کی مکھی کی بھنبھناہٹ۔ بعض تو اس معاملے میں بہت آگے بڑھ گئے تھے وہ رات بھر کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی عورتوں نے شکایت کی، لہٰذا آپ ﷺ نے انہیں اس زیادتی سے روک دیا۔ آپ خود ہر رات گیارہ رکعتیں پڑھتے تھے جن میں سے ایک وتر ہوتی تھی باقی اس سے پہلے دو دو رکعتیں ہوا کرتی تھیں۔ آپ ﷺ کی رکعتیں بہت لمبی ہوتی تھیں یہاں تک کہ کھڑے کھڑے آپ کے قدم مبارک پر ورم ہو جاتا تھا۔ اس لئے آپ ﷺ کو تسلی دینے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی۔

طٰہٰ ۚ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۚ (۲۰:۲)

(اے پیغمبر ہم نے قرآن کریم اس لئے نازل نہیں کیا کہ تم بدنصیب ہو جاؤ۔)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی یہ تربیت تھی جس نے جاہلیت کی تمام خرابیاں دور کر دی تھیں اور انہیں اس قدر پاک وصاف کیا تھا کہ انہوں نے تاریخ میں سب سے بڑا روحانی اور سماجی انقلاب برپا کیا۔ ان کی یہ تربیت نماز میں اور نماز سے باہر قرآن کریم کی بکثرت تلاوت اور اس میں غور وفکر کا نتیجہ تھی۔ ان کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہ رات بھر کھڑے کھڑے ایک ہی آیت بار بار پڑھتے تھے، اس کے مطالب پر غور کرتے تھے، وہ لیٹے لیٹے بھی قرآن کریم پڑھا کرتے تھے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِهِمْ (۳:۱۹۱)

(وہ اللہ تعالیٰ کو اٹھتے بیٹھتے اور اپنے پہلوؤں پر (لیٹے ہوئے) بھی یاد کرتے ہیں۔)

سب سے بہتر ذکر الٰہی یہ ہے کہ اس کی کتاب کی تلاوت کی جائے جس میں اس کے پاکیزہ نام، مقدس صفات، احکام، فطری قوانین اور اس کی صناعی کا ذکر ہے۔

خداوند تعالیٰ نے مسلمانوں پر قرآن کریم کے اثرات کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا ہے۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ (۳۹:۲۳)

(خدا نے بہترین کلام یعنی کتاب (قرآن کریم) کو نازل فرمایا جو ملتی جلتی اور مکرر ہے جس سے خداترس لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کی جلد اور قلوب یاد الٰہی کی طرف نرم ہو جاتے ہیں۔)

اگر قرآن کریم قوانین اور علوم وفنون کی کتابوں کی طرح ہوتا تو نہ لوگوں کی طبیعتوں کو بدلنے میں اس کا یہ اثر ہوتا اور نہ وہ ماحول کو تبدیل کر سکتا، بلکہ اس کی تلاوت سے دل اکتا جاتے اور اسے چھوڑ دیتے۔ لٰہذا قرآن کریم کا یہ اسلوب بیان اپنے ادبی معجز بیانی اور روحانی اثرات کے لحاظ سے سب سے بلند ہے۔ جس کسی کو اس میں شک ہو اسے چاہئے کہ پہلے وہ کسی ایک سورۃ کے مسائل کو دیکھے پھر انہیں یا ویسے ہی مسائل کو اس سورت کے پیرایۂ بیان میں، یا کسی ایسی سورت کے انداز میں لکھے جس میں ایک ہی مضمون کو بار بار کبھی مختصر اور اجمالی طور پر اور کبھی کسی قدر تفصیل سے بیان کیا گیا ہو جیسے رسولوں کے قصوں سے عبرت حاصل کرنا جو مثلاً الذاریات، القمر، الحاقۃ کی مفصل سورتوں میں مذکور ہے یا ان سے اوپر کی سورتوں مثلاً المومنون، الشعراء، النحل کی سورتوں میں مذکور ہے یا اس کے طویل تر اعراف وھود کی سورتوں میں موجود ہے، پھر وہ دیکھے گا کہ اسے اس کوشش میں مضحکہ خیز ناکامی سے دوچار ہونا پڑا ہے جس کی تکرار سے طبیعت اکتا جائے، ذوق سلیم متلانے لگے اور قلوب اسے قے کر کے نکال دیں گے۔

گستاف لیبان نے اپنی کتاب "روح الاجتماع" میں بیان کیا ہے کہ مذہبی، سیاسی اور سماجی تحریکوں کی تقاریر اور مضامین میں بار بار اعادہ اور تکرار قوموں میں جوش اور محویت پیدا کرتا ہے۔ اس طریقے سے ان میں قربانی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور ہر بات اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی لیڈر اور مختلف پارٹیوں کے سربراہ ان طریقوں سے کام لیتے ہیں۔ تجارت پیشہ حضرات بھی اخباروں میں اور سڑکوں پر اس طریقے سے اشتہارات کی نشر واشاعت کرتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ اور ان کے زمانے کا کوئی آدمی بھی اس وقت ان رازوں سے واقف نہیں تھا البتہ خداوند تعالیٰ ان تمام عالموں اور فلسفیوں سے زیادہ

جماعتوں اور قوموں کے مزاج سے واقف ہے۔ چونکہ قرآن کریم خدا کا کلام ہے، اس لئے اس میں مضامین کی تکرار کا اصل مقصد یہی ہے کہ وہ خیالات ہی میں انقلاب برپا کر لے اور عقائد واخلاق کی اصلاح کرے۔ اگر سیاسی لیڈروں کے ان بہترین خطبوں کو جمع کیا جائے جنہوں نے ان کی پارٹیوں میں ہل چل مچادی تھی۔ اس کے بعد ان تقریروں کو بار بار پڑھا جائے تو ہر پڑھنے والا تھوڑی دیر میں اس سے اکتا جائے گا خواہ وہ مقرر اس کا ہیرو ہی کیوں نہ ہو۔ اگر وہ شخص جو قرآن کریم کا مفہوم سمجھتا ہے، اس کی تلاوت سے ہرگز نہیں اکتائے گا بلکہ وہ اس کی شیریں بیانی سے لطف اندوز ہوگا۔

یہ معلوم ہونا چاہئے کہ خیالات اور دلوں میں انقلاب پیدا کرنا چٹانوں کو پھاڑنے اور پہاڑوں کو گرانے سے زیادہ مشکل ہے اسی پر خدا نے ایک مثال پیش کی ہے۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۲۱:۵۹)

(اگر ہم اس قرآن مجید کو پہاڑ پر اتارتے تو تم دیکھتے کہ وہ عاجزی کے ساتھ خدا کے خوف سے پارہ پارہ ہو گیا ہے۔ یہ مثالیں ہم لوگوں کے سامنے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور کر سکیں۔)

عربوں پر قرآن کریم کی تاثیر کی یہ ایک مثال بیان کی گئی ہے۔ مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو مشاہدہ کرنے کے بعد بنو اسرائیل پر اس کا کیا اثر ہوا اس کے نتیجے کو ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِىَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ۭ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاۗءُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ (۲:۷۴)

(پھر تمہارے دل اس کے بعد سخت ہو گئے وہ پتھروں کی مانند تھے یا اس سے بھی زیادہ سخت ہوئے۔ کیونکہ بعض پتھر ایسے ہیں جس میں سے نہریں پھوٹتی ہیں۔ بعض ایسے ہیں جن میں سے پانی نکلتا ہے اور بعض خدا کے خوف سے گر جاتے ہیں۔ خدا اس سے غافل نہیں ہے جو تم کرتے ہو۔)

ہم نے قرآن کریم کے اسلوب، ترتیب و تکرار بیان کے اعجاز صوری کو اچھی طرح بیان کر دیا ہے۔ جس سے عالمگیر انقلاب رونما ہوا اسکے بعد ہم اس کی اصلاح اور اعجاز معنوی کو بیان کریں گے جس میں اس کی مذہبی، سیاسی اور تمدنی تعلیمات شامل ہیں۔

فصل نمبر۵:

قرآنی مقاصد اور ان کی تکرار

قرآن کریم کے اغراض و مقاصد میں یہ بات داخل ہے کہ انسانی افراد، جماعتوں اور قوموں کی اصلاح کی جائے۔ انہیں راہ راست پر لایا جائے۔ ان میں انسانی اخوت اور تحاد قائم کیا جائے، ان کی محفلوں کو بلند اور دلوں کو پاکیزہ بنایا جائے۔ اس سلسلے میں بعض مقاصد ایسے ہیں کہ انہیں ایک، دو یا چند مرتبہ بیان کر دینا کافی تھا، بعض احوال ایسے ہیں کہ انہیں بار بار دہرانے کی ضرورت تھی تاکہ دل کی گہرائیوں سے موروثی خیالات، برے رسم و رواج اور بری عادتوں کی بیخ کنی ہو جائے اور ان کی جگہ نیکی کے پودے لگائے جائیں۔ ان کی ایسی خبر گیری کی جائے کہ وہ باقاعدہ پھولیں اور پھلیں، بعض مقاصد ایسے ہیں کہ انہیں شروع ہی سے پورا بیان کرنا ضروری ہے مگر بعض کی تکمیل بتدریج ہی ہو سکتی ہے۔ کچھ ایسے اصول و مقاصد بھی ہیں جو صرف آئندہ قابل عمل ہو سکتے ہیں ان کے لئے عام اصول مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ بعض مقاصد ایسے ہیں کہ ان کے لئے اشارہ و کنایہ ہی کافی تھا۔

قرآن کریم صرف تعلیم کی کتاب نہیں ہے بلکہ تعلیم کے ساتھ ساتھ عملی تربیت کی کتاب بھی ہے لہٰذا اس کے لئے یہ مناسب نہ تھا کہ وہ ہر مسئلہ کو صرف ایک مرتبہ پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرے جیسا کہ علوم و فنون اور قوانین کی کتابوں کا طریقہ ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے (خاص طریقہ تعلیم و تربیت کی) بعثت محمدی کے سلسلے میں اس طرح وضاحت فرمائی ہے۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَۗ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍۙ (۶۲:۲)

(خدا وہ ہے جس نے ناخواندہ (عربوں) میں خود انہی میں سے ایک رسول بھیجا ہے جو ان کے سامنے اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے۔ انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں تھے۔)

اس آیت میں تلاوت کردہ آیات سے مراد قرآن کریم کی سورتیں ہیں جو اس کے کائناتی قوانین کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ تزکیہ سے مراد عملی تربیت اور اسوۂ حسنہ ہے۔ کتاب سے مراد نوشت وخواند کی تعلیم ہے تاکہ عرب امی اور ناخواندہ نہ رہیں۔ حکمت سے مراد وہ مفید علوم ہیں جو نیک کام کرنے کا ذریعہ ہیں اور جسے مہذب اقوام کی اصطلاح میں فلسفہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس طرح قرآن اور سنت کے تمام اغراض ومقاصد انہی تین محوروں پر گھومتے ہیں۔

یہاں ہم قرآنی مقاصد کے بنیادی اصولوں کو بیان کرتے ہیں جیسا کہ ہم نے اس دعوے کے وقت وعدہ کیا تھا۔ کہ محمد ﷺ نے جو کچھ پیش کیا ہے وہ آپ سے پہلے کے تمام انبیاء، حکماء اور حکام کی تعلیمات سے اعلیٰ اور اکمل ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن کریم خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے، محض آپ ﷺ کی ذاتی قابلیت کا نتیجہ نہیں ہے۔

ہم ان اغراض ومقاصد کو چند قسموں پر تقسیم کرتے ہیں۔ ہر ایک قسم کے اجمالی بیان کے وقت ہم اس کی حکمت اور امتیازی خصوصیات بھی واضح کریں گے ان کا مفصل بیان تو اس وقت ہو سکتا ہے جب خدا ہمارے اس وعدے کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے کہ ہم قرآن کریم کے تمام مقصد کی علیحدہ ابواب میں تشریح کریں اور ہر باب میں یہ بھی بیان کریں کہ انسانیت کو اس مقصد کی کیوں ضرورت ہے؟ نیز یہ کہ ان کی اس ضرورت کو قرآن کریم نے اچھی طرح پورا کر دیا ہے۔ ان تمام حقائق کو ہم قرآن کریم کی آیات پیش کر کے ثابت کریں گے۔ بہر حال یہ فصل ان تفصیلات کا ایک نمونہ ہے۔

قرآن کریم کا پہلا مقصد

دین کے ارکان کی اصلاح

مذہب کے وہ تین بنیادی اصول جنہیں لے کر تمام پیغمبر آئے اور جن پر انسانیت کی فلاح موقوف ہے۔ قرآن کریم میں ان کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (پ۲ : ۶۲)

(در حقیقت وہ لوگ جو ایمان لائے اور جو لوگ یہودی، نصاریٰ اور صابئین میں (ان میں سے) جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اور نیک کام انجام دیتا ہے تو ایسے لوگوں کا ثواب ان کے پروردگار کے پاس ہے۔ انہیں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگیں ہوں گے۔)

اب ان میں سے ہر ایک کی مختصر طریقے سے وضاحت کی جائے گی۔ کیونکہ ہمارا دعویٰ ہے کہ قرآن کریم کی تعلیمات دوسرے مذاہب کی مشہور تعلیمات سے زیادہ مکمل ہیں اور اس سلسلے میں گزشتہ پیغمبروں کے پیروؤں نے اپنی کتابوں کے ضائع ہونے اور ان میں تحریفات کی بدولت جو خرابیاں پیدا کی ہیں نیز ذاتی خواہشات اور موروثی رسم و رواج کی بناء پر جو نئی نئی باتیں نکالی ہیں، ان سب کی اصلاح کی گئی ہے۔ ہمارا یہاں یہ مقصد نہیں ہے کہ ان کی عملی تفصیل بیان کی جائے، کیونکہ جب آپ ﷺ کی نبوت کے اصل مقصد یعنی قرآن کریم کو خدا کی وحی ثابت کیا جائے گا تو اس وقت یہ بھی ثابت کیا جائے گا کہ اس پر ایمان لانے والے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس مذہب کے تمام فرائض کی تعلیم حاصل کرے۔

ان تین ارکان کا پرانی فناشدہ قوموں کے آثار میں بھی پتہ چلتا ہے۔ جیسے مصری، کلدانی نیز موجودہ قوموں کی کتابوں میں بھی اس کا ثبوت ملتا ہے جیسے ہندو، مجوسی اور چینی۔ اس کتاب میں ان کے ذکر کا مقصد یہ ہے کہ ہم تمام مہذب قوموں کو یہ سمجھا دیں کہ جن چیزوں کو وہ مذہبی اصول سمجھ رہے ہیں در حقیقت وہ خدائی اصول نہیں ہیں جنہیں اس نے گذشتہ رسولوں پر نازل فرمایا تھا اور نہ ان کے ذریعے ان کی ذات اور ان کے کاموں کی اصلاح ہوگی۔ بلکہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کی صداقت عقلی اور

نقلی طریقے سے ثابت ہو چکی ہے۔ اس میں ہدایت کے سلسلے کی تمام ضروری باتیں بیان کردی گئی ہیں اس وجہ سے ہم نے ان تینوں ارکان کو ایک مقصد میں شامل کیا ہے۔ تین بابوں میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ دوسرا مقصد پیغمبروں اور ان کی نبوت کے موضوع کے بارے میں ہوگا۔

دین کا پہلا رکن ... خدا پر ایمان:

دین کا سب سے بڑا اور پہلا رکن خدا پر ایمان ہے۔ اس بارے میں تمام قومیں گمراہ ہو چکی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ بھی گمراہ ہوئیں جو پیغمبروں کے عہد ہدایت کے بہت قریب ہیں۔ یہودیوں نے توحید کے اصل عقیدہ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی مگر ان پر بھی تشبیہات کا غلبہ ہو گیا، وہ ان مغالطہ آمیز عبارتوں کو نہیں سمجھ سکے جن میں خدا کی کامل صفات میں خلل پڑتا ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے خدا کو انسانوں کی طرح بنا دیا جیسے "وہ تھک گیا اور اپنے کام پر پشیمان ہوا کیوں کہ اسے معلوم نہ تھا کہ انسان اس جیسا ہوگا یا دیوتاؤں [1] کی طرح ہوگا"۔ ان کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ خدا انسانی شکل میں ظاہر ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے اسرائیل سے کشتی لڑی اور ان کی گرفت سے اس وقت تک نہ نکل سکا جب تک کہ انہیں برکت نہ دیدی۔ اس وقت انہوں نے خدا کو چھوڑا [2] علاوہ ازیں انہوں نے بعل اور دوسرے بتوں کی پرستش بھی کی ہے۔

عیسائیوں نے بھی قسطنطین کے زمانے سے پرانی بت پرستی کو زندہ کیا۔ انہوں نے حضرت مسیح کو پروردگار اور معبود بنایا اور اپنے مذہبی بزرگوں کی تصویریں بنا کر پرستش کرنے لگے۔ یہاں تک کہ عیسائیوں کے گرجے پرانی بت پرستی کے مندروں کی طرح تصویروں اور مجسموں سے بھر گئے۔ اس کے علاوہ عیسائیوں کی تثلیث صلیب اور کفارہ کے عقائد جن پر ان کے پورے مذہب کی بنیاد ہے، اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ کرشنا اور اس کے ثالوث سے ماخوذ ہے۔ ان کی عیسائیت کی بنیاد خیال اور غیر معقول فلسفہ پر ہے مگر ایسے

---

[1] پیدائش کے باب میں مذکور ہے "معبود خدا نے کہا دیکھو، یہ انسان ہماری طرح ہو گیا ہے اور وہ نیکی اور برائی کو پہچاننے لگا ہے۔" آگے مذکور ہے۔ "خدا رنجیدہ ہوا۔" دوسرے ترجمہ میں ہے "خدا اس پر پشیمان ہوا کہ اس نے انسان کو بنایا اور دل ہی دل میں اسے افسوس ہوا۔"

[2] ملاحظہ ہو پیدائش کے باب کی فصل ۳۲ کا آخری حصہ۔

نظام کو بڑے بڑے بادشاہ اور قیصر نافذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لیے سونے چاندی کے خزانے لٹائے جاتے ہیں۔ ان کی نئی پود کو بچپن سے اس قسم کے جذبات اور خیالات پر تربیت دی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آگے چل کر ان پر کوئی معقول دلیل اور حجت اثر نہیں کرتی۔ اس طرح شرک کا سیلاب تمام زمین پر چھا گیا اور بت پرستی لوگوں پر امنڈ پڑی۔

قرآن کریم نے بت پرستی کے ان قلعوں کو جس کی بنیادیں انسانوں کے خیالات اور دلوں میں مستحکم ہو چکی تھیں، منہدم کر دیا۔ اس کام کی تکمیل کے لیے یہ کافی نہیں تھا کہ ایک یا دو دلیلیں خدا کی توحید کو ثابت کرنے کے لیے پیش کی جاتیں بلکہ یہ ضروری تھا کہ تمام شبہات کو ایک ایک کر کے توڑا جاتا۔ عقلی، علمی دلائل اور دل نشین مواعظ اور مثالوں سے اس کی تشریح کی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں جس مسئلہ کو سب سے زیادہ بار بار دہرایا گیا ہے وہ یہی مسئلہ توحید ہے۔ چنانچہ بار بار اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ صرف اس ذات حق کی عبادت کرنی چاہیے۔ اس کے سوا جو کوئی ہو خواہ وہ بادشاہ ہو یا غلام خدا کے مقابلے میں کسی کو نہ فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان، بلکہ خود اپنے لیے بھی کچھ نہیں کر سکتا سوائے اس کے کہ خدا کے عالمگیر نظام سے فائدہ اٹھائے۔

خدا نے بار بار صرف یہی ثابت نہیں کیا ہے کہ دنیا کا پروردگار ایک ہے اور وہی سب کو پیدا کرتا ہے اور وہی تقدیر وتدبیر اور مذہبی شریعت کو نافذ کرتا ہے۔ کیونکہ اس کا مقصد مشرک اور ملحد انسانوں کو صرف اپنی ربوبیت کا قائل کرانا نہیں بلکہ اس کا بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ عبادت کے شرک کو باطل کیا جائے۔ عبادت کا شرک یہ بھی ہے کہ خدا کے سوا دوسرے لوگوں کو اس لیے پکارا جائے کہ اس کے واسطے سے خدا کا قرب حاصل کیا جائے یا ان سے سفارش کرائی جائے۔ یہ سب سے برا، سب سے گہرا اور کمزور عقلوں کے عقائد کو خراب کرنے والا شرک ہے، اس کی وجہ سے لوگ تجربات سے ثابت شدہ خدائی اسباب کو چھوڑ کر اپنے اوہام اور خرافات کو دین سمجھنے لگے ہیں۔ وہ اپنی تکلیف دور کرنے یا نفع حاصل کرنے کے لیے قدرتی اسباب سے کام نہیں لیتے بلکہ خدا کو چھوڑ کر دوسروں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

دعا:

قرآن کریم میں دعا کاذکر ستر مرتبہ سے زیادہ ہے کیونکہ دعا ہی عبادت کی روح اور مغز ہے۔ بلکہ دعا ہی عبارت اور سراسر دین فطرت ہے۔ اس کے سوا جتنی عبادتیں ہیں وہ احکام شرعی اور خدا کی وحی کے ذریعے مقرر کی گئی ہیں۔ دعا ان سب عبادتوں کی نشو ونما کرتی اور انہیں خیالات اور خواہشوں کی الائشوں سے پاک وصاف کرتی ہے۔

قرآن میں دعا کی بعض آیات ایسی ہیں جن میں صرف خدائے واحد سے مانگنے کا حکم دیا گیا ہے، بعض میں اللہ کے سوا دوسروں کو پکارنے کی مخالفت کی گئی ہے کچھ ایسی آیات ہیں جن میں شرک کی تردید یا توحید کو ثابت کرنے کے لیے دلائل موجود ہیں۔ کچھ مثالیں ایسی ہیں جن میں مناسب اور موثر طریقہ سے دونوں تصورات کو واضح کیا گیا ہے کچھ آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ غیر اللہ کو پکارنا مفید اور مقبول نہیں ہے اور جن کو پکارا جاتا ہے وہ بھی خدا کے بندے ہیں بلکہ اس کے افضل اور نیک بندے فرشتے اور پیغمبر بھی خدا کو پکارتے اور اسی کا وسیلہ تلاش کرتے ہیں۔ وہ اُسی کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عذاب سے خائف ہیں۔ وہ قیامت کے دن ان لوگوں سے بیزاری ظاہر کریں گے جو خدا کو چھوڑ کر انہیں پکارتے ہیں۔ یا خدا کے ساتھ انہیں بھی شامل کرتے تھے۔ ایسی اور باتیں بھی ہیں جن کی نہ صرف تشریح طوالت کا موجب ہے بلکہ اس کے خلاصے کی گنجائش بھی یہاں نہیں ہے۔

ذکر الٰہی کے فوائد:

قرآن کریم میں ایمان الٰہی کی مزید قسمیں بھی ہیں جو توحید کی نشو ونما کرتی ہیں وہ توحید پرستوں کو معرفت خداوندی کے بلند مقام پر مختلف درجوں پر پہنچاتی ہیں اور ان میں خدا پرستی اور والہانہ محبت کا جذبہ پیدا کرتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ خدا ہر قسم کے نقائص سے پاک وصاف ہے للذا اسی کی تسبیح پڑھی جائے۔ ان آیات میں خداوند کریم کے اسمائے حسنہ کو مختلف شرعی احکام کے ساتھ مل کر بیان کیا گیا ہے جیسا کہ طہارت، عورتوں، میراث اور مالیات، کائنات کی تخلیق وتدبیر، انسانی طبیعتوں اور ان کے سماجی معاملات پر قوانین قدرت کا اثر اس کے ہر صفاتی نام کو مناسب مقام پر درج کیا گیا ہے۔ جیسے علم وحکمت،

قدرت، مشیت، حلم، عفو، مغفرت، رحمت، محبت رضا وغیرہ نیز اس پر توکل کرنے اور اس سے اس کے جلال یا انصاف کی وجہ سے ڈرنے اور اس کی رحمت اور فضل کی توقع رکھنے کا حکم دیا گیا۔ غور کرو اعلیٰ ارواح کو خدا کے کمال مطلق میں جذب ہونے اور اس کی ذات میں اپنی تمام تمناؤں اور خواہشوں اور خود اپنی ذات کو فنا کرنے کے لیے کیا موثر انداز اختیار کیا گیا ہے۔ سورۃ حدید کے شروع میں ارشاد ہے۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

(پ ۵۷: ۱، ۲)

(ہر اس چیز نے جو آسمانوں اور زمین میں ہے اس کی تسبیح کی ہے اور وہی عزت وحکمت والا ہے آسمان اور زمین اُس کی ملکیت میں ہیں وہی زندہ کرتا ہے اور موت دیتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے وہی اول وآخر، ظاہر و باطن ہے اور وہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔)

سورۃ حشر کے آخر میں ارشاد ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۝ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (۵۹: ۲۳-۲۴)

(وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ پوشیدہ اور ظاہری باتوں کو جانتا ہے۔ وہی مہربان اور رحم کرنے والا ہے وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ بادشاہ بہت پاکیزہ سلامت، امن دینے والا، پناہ میں لینے والا غالب خود مختار اور صاحب عظمت ہے۔ خدا اس چیز سے پاک ہے جسے وہ اس کا شریک ٹھیراتے ہیں وہی اللہ خالق موجد اور صورت گر ہے اس کے اچھے نام ہیں آسمانوں اور زمین میں جو چیز ہے وہ اس کی تسبیح کر رہی ہے وہی زبردست اور حکمت والا ہے۔)

یہ اسمائے الٰہی روحانی زندگی کے سرچشمے ہیں اور مطلع انوار معارف الٰہی ہیں اور اس کی خوشہ چینی کر کے اہل عرفان، اولیاء اللہ اور آئمہ ربانی نے کثرت اذکار اور تلاوت قرآن کریم کی تربیت حاصل کی۔ اس کے بعد انہوں نے معرفت الٰہی، اسرار کائنات، مناجات اور عشق الٰہی کی نظمیں اور اعلیٰ حکمت کی بلند کتابیں تحریر فرمائی ہیں۔

قرآن کریم میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے خدا کا ذکر کیا کریں۔ اس کی بنیادی غرض وغایت یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کا اثر ان کے تمام کاموں پر غالب رہے جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے کہ ان کے کاموں پر خدا غالب تھا۔ اسی صورت میں وہ باطل اور شر سے متنفر ہوں گے اور زندگی میں ان کے ہر کام کی بنیاد حق اور نیکی پر ہوگی۔ ذکر الٰہی سے خدا اور اس کے فرشتوں کی رحمت ان پر نازل ہوگی تاکہ وہ انہیں اندھیرے سے نکال کر نورانی فضا میں لے آئیں جیسا کہ خدائے بزرگ و برتر فرماتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ۝ وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ۝

(۴۳تا۴۱:۳۳)

(اے ایمان والو! اللہ کو بہت یاد کرو اور صبح شام اس کی تسبیح پڑھا کرو (خدا) وہی ہے کہ وہ اور اس کے فرشتے تم پر رحمت نازل کرتے ہیں تاکہ وہ تمھیں اندھیرے سے نکال کر نورانی فضا میں لے آئے وہ مومنوں پر بہت مہربان ہے۔)

تکرار مضامین کی حکمت:

مضامین کی اسی تکرار نے قرآن کریم کے طرز بیان کو معجزہ بنادیا ہے۔ یہ طرز بیان ایسا مقبول ہوا کہ اس سے کوئی اکتاتا نہیں ہے۔ اسی کی ذریعے خدا نے عربوں کے دل ودماغ کو شرک کی نجاست اور بت پرستی کی خرافات سے پاک وصاف کیا، انہیں بلند اخلاق اور پاکیزہ خصائل بنایا۔ عربوں کے علاوہ دوسری قوموں کا بھی یہی حال ہوا کہ وہ اللہ پر ایمان لائے اس کی کتاب کی زبان پر عبور حاصل کیا اور اپنی عبادات میں خوش الحانی کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت کرنے لگے اور اس کی آیات پر غور کرتے رہے، لیکن جب امت میں قرآنی زبان سے جہالت سرایت کرنے لگی۔ اس پر غور وخوض جسے خدا نے ان پر فرض کیا تھا کم ہونے لگا اور مسلمانوں نے اپنے عقیدے کو سمجھنے میں علم کلام کی کتابوں پر اور عبادت کے کاموں میں کتب فقہ پر اور تزکیہ نفس کے لیے انسانوں کے بنائے ہوئے ورد وواذکار پر بھروسا کیا تو اس وقت سے توحید کا جذبہ بہت سے لوگوں کے دلوں میں کمزور

ہوتا گیا اور اس میں پہلے شرک اصغر اور پھر شرک اکبر کی آمیزش ہو گئی اور مسلمان اعتقاد، عمل، تاویل اور کج بحثوں میں گذشتہ قوموں کے قدم بقدم اور ایک ایک انچ پیروی کرنے لگے۔ یہاں تک کہ علم کے مدعی اپنے شبہات، خواہشات اور بدعات کے مطابق توحید کی بہت سی آیات کی تاویل کرنے لگے بلکہ قرآن کریم کو ناپسندیدہ طریقے سے ترک کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدا نے اپنے وعدے کے مطابق ان پر عذاب نازل کیا جیسا ہر ایک کو معلوم ہے اور وہ مشاہدہ کر رہا ہے۔

بعض متکلمین خدائی صفات کی اپنے منطقی نظریات کے مطابق تاویل کرنے لگے اور بعض صوفیائے کرام نے توحید اور اس کی صفات کے سمجھنے میں مبالغہ سے کام لیا یا اسے روحانی ذوق اور وجدان کے مطابق قرار دیا۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں نے دنیاوی امور میں اسباب کے اثر ہی سے انکار کر دیا جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ انہوں نے یہ بدعت نکالی کہ انسان مجبور محض ہے۔ اس عقیدہ نے لوگوں کی ہر چیز کو بگاڑ دیا اور بعض لوگ وحدۃ الوجود کے قائل ہو گئے۔ اس گروہ کے متقدمین وہی بات کہتے تھے جن کی طرف ان کی عقل یا روحانی ریاضت اور اس سے پیدا شدہ وجدانی شعور ان کی رہنمائی کرتا تھا، اس کے ساتھ ساتھ وہ لغت اور زبان کے لحاظ سے قرآنی متن اور احادیث کو بخوبی سمجھتے تھے مگر ان کے بعد مقلدین کی وہ جماعت آئی جن کا تعلق نہ قرآن کریم سے تھا نہ عقل و دلائل اور وجدانی شعور سے بلکہ وہ سراسر عوام الناس کی خواہشات کی پیروی کرتے تھے اور اپنے جیسے جاہل مصنفوں کے کلام کے حوالے سے عوام کے لیے تاویلیں گھڑتے تھے حالانکہ اگر انہوں نے توحید و تنزیہ کی سب سے چھوٹی سورۃ اخلاص ہی کو کما حقہ سمجھ لیا ہوتا تو ہرگز شرک کی رسائی ان کے دلوں تک نہیں ہو سکتی تھی۔

قرآن کا عقیدہ توحید علم و معرفت کا وہ اعلیٰ درجہ ہے جو انسان کو انسانیت کے بلند ترین معیار تک پہنچاتا ہے اور اُسے روحانی، ذھنی اور تمدنی کمالات کے قابل بناتا ہے۔ یورپ کے بہت سے علماء نے یہ تصریح کی ہے کہ یہ عقیدہ جلدی سے سمجھ میں آ جاتا ہے اور عقل و فطرت کے عین مطابق ہے، یہی وجہ ہے کہ اقوام عالم نے انہیں تسلیم کیا اور اس کے سامنے عیسائیت کو شکست ہوئی۔

مسلمانوں کے اسلاف میں توحید، معرفت و محبت الٰہی اور توکل کا یہ جذبہ تھا جس نے

ان کا تزکیہ نفس کر دیا تھا اور ان کی ہمتوں کو بلند کر دیا تھا نیز جذبہ خودداری، بہادری، حق وانصاف پسندی کے ذریعے ان کی تکمیل کی تھی۔ اس طرح ان کے لیے یہ ممکن ہوا کہ وہ فاتح بنیں اور قوموں کی سیاست کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں ہو۔ انہوں نے کاہنوں ،راہبوں ، مذہبی اور روحانی پیشواؤں اور ظالم بادشاہوں کے ظلم واستبداد سے انسانیت کو نجات دی اور تہذیب وتمدن کی بنیادوں کو مستحکم کر کے مردہ علوم وفنون کو نہ صرف زندہ کیا بلکہ انہیں ترقی بھی دی۔ چنانچہ انہیں جو کامیابی حاصل ہوئی اس کی نظیر دنیا کی کسی قوم میں نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر گستاف لیبان نے جو مشہور اجتماعی مورخ ہے اپنی کتاب "انقلاب امم" میں تحریر کیا ہے۔

"ہر ترقی پذیر قوم میں علوم وفنون کی قابلیت تین نسلوں میں جا کر پوری ہوتی ہے۔ پہلی نسل میں تقلیدی دور ہوتا ہے دوسری میں تقلید واجتہاد ملے جلے ہوتے ہیں۔ تیسری نسل میں جا کر ماہرین خصوصی اور آزاد خیال مفکرین کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔" ڈاکٹر موصوف کہتے ہیں "مگر اس قاعدہ سے عرب مستثنیٰ ہیں جن میں علوم وفنون کی پختہ صلاحیت پہلی نسل میں ہی پیدا ہو گئی جب کہ انہوں نے انہیں حاصل کرنا شروع کیا تھا۔"

ہماری رائے یہ ہے کہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ قرآن کی تربیت سے ان میں عقل و فکر کی آزادی پیدا ہو گئی تھی، وہ اندھادھند تقلید کو ناپسند کرتے تھے اس طرح وہ دینی اور دنیاوی کاموں میں انسانیت کی قیادت اور امامت کے قابل بن گئے تھے مگر جب اسلامی خلافت کا خاتمہ ہوا اور عربی تحریک کو زوال ہوا اور ان عجمی لوگوں کو حکومت ملی جن کا اسلام سے ظاہری تقلید کے سوا جو قرآنی ہدایت ہے بالکل مختلف تھی اور کوئی تعلق باقی نہ رہا تو عربوں کی نسل بھی ان چیزوں سے محروم ہو گئی۔

دین کا دوسرا رکن عقیدہ قیامت :

دین کا دوسرا رکن قیامت کے دن پر ایمان لانا اور اعمال پر حساب اور جزا وسزا کو ماننا ہے۔ یہ اس دین کا دوسرا رکن ہے جسے لے کر خدا کے تمام پیغمبر مبعوث ہوئے تھے اور اسی کی بدولت خدا پر ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔ نیک کام کرنے کا شوق اور برے کاموں سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ عرب کے تمام مشرک اس عقیدے کے منکر تھے۔ اہل کتاب

اور دوسری قومیں جن کے پاس آسمانی کتابیں مذہبی اور تمدنی شریعت تھی مگر ان کی کتابیں مفقود ہو گئیں یا ان میں تحریف کردی گئی اور ان پر بت پرستی کا غلبہ ہو گیا۔ وہ سب قومیں موت کے بعد زندگی اور جزاء کی قائل ہیں۔ اس معاملے میں ان کا کوئی اصلی اور بنیادی اختلاف نہیں ہے مگر ان دونوں عقیدوں کی کیفیت میں ان کا اختلاف ہے اور اس کی وجہ سے ان کے اس عقیدے میں بگاڑ پیدا ہو گیا ہے کیونکہ اس کی بنیاد ایسی بدعتوں پر رکھی گئی ہے جس سے اس کا اصلاحی فائدہ جاتا رہا ہے۔ اس کی بنیاد ہندوؤں اور دوسرے قدیم بت پرستوں کے عقائد پر ہے نیز عیسائیوں کی جانشین قوموں یعنی قیصر، قسطنطین کے مذہب کے پیرووں کے اس عقیدے پر ہے کہ ایک نجات دہندہ اور قربان ہونے والا انسان لوگوں کے تمام گناہوں کا کفارہ بن جائے گا اور خود قربان ہو جائے گا۔ وہ مسیحی ثالوث کا دوسرا اقنوم (رکن) ہے جو بعینہٖ اقنوم اول بھی ہے اور اقنوم ثالث بھی۔ اور ان دونوں میں سے ہر ایک باہم یکساں ہیں۔

عیسائی حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے انسانیت کے لیے اپنی پیدائش سے لے کر آسمان پر اٹھائے جانے تک قربانی پیش کی ہے۔ یہ عقیدہ وہی ہے جو ہندو کرشنا وغیرہ کے بارے میں کہتے ہیں۔ صرف ناموں کا فرق ہے۔ یہاں یسوع ہے تو وہاں کرشنا ہے۔[1]

یہودیوں کا مذہب بالکل قوم اسرائیل کے لیے مخصوص ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ خدا تمام قوموں کے مقابلے میں ان کی قوم کی حمایت کرے گا۔ اس لیے وہ اسے "خدائے اسرائیل" کے نام سے پکارتے ہیں گویا کہ وہ انہی کا پروردگار ہے۔ رب العلمین (تمام دنیا کا پروردگار) نہیں ہے۔ ان کا مذہب روحانیت سے زیادہ مادہ پرستی کے قریب ہے، لہٰذا اُن کے اس رکن کی خرابی پہلے رکن کی خرابی کا نتیجہ ہے یعنی ان لوگوں کا خدا پر نہ صحیح ایمان ہے اور نہ انہیں صحیح معرفت حاصل ہے اس لیے دونوں چیزوں میں ان کی اصلاح کی ضرورت ہے۔

---

[1] تثلیث اور کفارہ کا عقیدہ قوم مصری، بابلی اور مغربی بت پرستوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ اسے ایک خاص کتاب میں تاریخی واقعات کے ساتھ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ جس کا نام "عیسائیت میں بت پرستی کے عقائد" از جناب محمد طاہر استنبر البیروتی مطبوعہ ۱۳۳۱ھ۔

یہ اصلاح قرآن کریم نے تمام انسانوں کے لیے کی۔ اس نے پیغمبروں کے دین کو اس کی معقول بنیادوں پر لوٹا دیا ہے یعنی خداوند تعالیٰ نے انسان کو یہ اعزاز بخشا ہے کہ اس کی خوش بختی اور بد بختی کو خود اس کے ایمان و عمل پر موقوف کر دیا ہے جو اس کا ذاتی فعل اور کوشش کا نتیجہ ہو گی کسی دوسرے کے ایمان و عمل سے اسے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو گا۔ کفر اور گناہوں پر جو سزا ملے گی اس میں خدا تمام مخلوقات کے ساتھ مساوی طریقے سے عدل و انصاف فرمائے گا کسی ایک قوم کو دوسری قوم پر ترجیح نہیں دی جائے گی۔ اس طرح ایمان اور نیک کاموں پر جو ثواب ملے گا وہ اس کے فضل و عنایت کے مطابق ہو گا۔ ایک نیکی کا دس گناہ ثواب ملے گا اور خدا چاہے گا تو اس میں دوگنا اضافہ بھی کرے گا۔

قرآن کریم نے اس اصلاح کی تصریح کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ مشہور پیغمبروں کے بزرگ باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی اسی قسم کی ہدایت دی تھی جن کی نبوت کو یہود و نصاریٰ بھی مانتے ہیں اور حضرت موسیٰ اور دوسرے پیغمبر علیہم السلام نے بھی یہی تعلیمات پیش کی تھیں چنانچہ ارشاد ہے۔

أَعِندَهُ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرَىٰ ۝ أَمْ لَمْ يُنَبَّأْ بِمَا فِي صُحُفِ مُوسَىٰ ۝ وَإِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّىٰ ۝ أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۝ وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ۝ وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَىٰ ۝ ثُمَّ يُجْزَاهُ الْجَزَاءَ الْأَوْفَىٰ ۝ (۵۳: ۳۵تا۴۱)

(کیا اس کو غیب کا علم ہے جسے وہ دیکھ رہا ہے یا جو کچھ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور باوفا ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں میں ہے اس کی اسے کچھ خبر نہیں ہے کہ کوئی آدمی دوسرے آدمی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ انسان کو وہی ملتا ہے جیسی وہ کوشش کرتا ہے اور اس کی کوشش کو عنقریب دیکھا جائے گا۔ پھر اسے پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔)

یعنی تمام رسولوں کی دینی تعلیمات کی اصل بنیاد یہ ہے کہ کوئی گنہگار نفس کسی دوسرے کے گناہ کو قربانی دے کر یا کسی اور طریقے سے برداشت نہیں کرے گا صرف انسان کی کوشش اور اس کا عمل کام میں آئے گا، دوسروں کے عمل کا اسے بدلہ نہیں ملے گا۔ اس کے عمل میں وہ کام بھی شامل ہیں جو اس کے ذریعے سے سرانجام پائے ہوں جیسا کہ کوئی کام اس کا لڑکا یا اس کا شاگرد اس کی تعلیم و تربیت کے اثر سے کرے۔ اس طرح جو کوئی اچھا یا برا رواج یا قانون جاری کرے اسے بھی ویسا بدلہ ملے گا جیسا کہ اس کے بعد

آنے والے لوگ کریں گے۔

اس مسئلہ کی اصل بنیاد یہ آیات قرآنی ہیں۔

وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۪ۙ فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰىهَا ۪ۙ قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰىهَا ۪ۙ وَقَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰىهَا ؕ (الشمس ۷۔۱۰)

(قسم ہے نفس کی اور جیسا اُسے درست کیا پھر اچھے برے کی سمجھ دی۔ جس نے اسے پاکیزہ بنایا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اسے خراب کیا وہ نامراد ہوا۔)

یعنی خدا نے اس نفس کو پیدا کیا۔ عقل اور شعور بخش کر مکمل کر لیا پھر فطرت اور جبلت کے الھام کے ذریعے اس میں دونوں قابلیتیں پیدا کر دی ہیں برائی کی قابلیت بھی ہے جو اس کے لیے تباہ کن ہے اور پرہیزگاری کی طاقت بھی ہے جو اس کی نجات اور ترقی کی ضامن ہے۔ ان دونوں صورتوں کو اختیار کرنے میں نفس کو آزادی حاصل ہے کہ اپنے خیال اور خواہش سے جسے چاہے ترجیح دے۔ پھر اسے عقل اور دین عطا کیا، جو ہمیشہ حق اور بھلائی کا پلہ باطل اور شر پر بھاری رکھتے ہیں لہٰذا ایمان، شریفانہ اخلاق اور اچھے کاموں کے ذریعے نفس جس قدر پاکیزہ ہوتا جائے گا اسی قدر اسے دنیا اور آخرت میں ترقی ملے گی برعکس حالت میں نتیجہ بھی برعکس ہوگا۔ ایسی صورت میں جزا و سزا روحانی اور جسمانی عمل کا قدرتی نتیجہ ہے۔ اسی وجہ سے ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ہم ان کے عمل کے مطابق جزا دیں گے یہی وہ صداقت ہے جس کا اقرار ہر وہ شخص کرے گا جو انسانی حقیقت اور خدائی حکمت سے بخوبی واقف ہو۔ بہر حال مذاہب عالم کے اس اہم عقیدے کی اصلاح بھی قرآن کریم نے کی ہے۔

یہ معلوم ہو گیا ہے کہ عرب کے مشرک عقیدہ قیامت اور سزا اور جزاء کے سخت منکر تھے۔ اہل کتاب اور دوسری قوموں کے ایمان بھی اُس سلسلے میں خراب ہو چکے تھے حالانکہ اس عقیدے کے ذریعے خدا پر ایمان کی تکمیل ہوتی ہے اور اسے یاد رکھنے سے اِنسان، باطل، شر، ظلم اور سرکشی سے باز رہتا ہے اور اس کے دل میں حق پرستی، بھلائی اور نیک کام کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ ان تمام باتوں کے بعد یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اِس عقیدہ کی اِصلاح کسی بڑی قوم میں اس وقت تک پختہ اور زود اثر نہیں ہو سکتی جب تک کہ اسے قرآن کریم میں بار بار نہ دہرایا جاتا اور عجیب انداز میں حسنِ بیان اور دلکشی کے ساتھ پیش نہ کیا

جاتا جو کبھی دلائل و براہین سے مستحکم ہو رہا ہے اور کبھی مثالوں کے ذریعے اسے واضح کیا جارہا ہے۔ یہ مضمون سینکڑوں آیات میں دہرایا گیا ہے مگر اس کا اعجاز یہ ہے کہ اِس سے طبیعت اکتاتی نہیں ہے بلکہ پڑھنے والا اس کے مضامین کی تکرار کو محسوس نہیں کرتا۔ حالانکہ مضامین و خیالات اور سورتیں یکساں ہیں۔ یہ بات مفصل سورتوں میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے جس میں روز قیامت، سزا اور جزا کے مضامین کی تکرار کسی کو محسوس نہیں ہوتی کیونکہ اس کا طرز بیان، ترتیب اور آیات کے آخری حصے (فواصل) بدلے ہوئے ہیں۔ خاص کر قریب کی متشابہ سورتوں میں بھی یہی دلکش انداز ہے، جیسے سورۃالمرسلات کا تعلق سرۃالنباء کے ساتھ، سورۃالنازعات کا سورۃ عبس کے ساتھ نیز سورۃ تکویر، سورۃالانفطار کے ساتھ اور سورۃالمطففین سورۃالانشقاق کے ساتھ مل کر اور تکرار مضامین کے باوجود عجیب لطف دیتی ہے۔

ہماری رائے ہے کہ روز قیامت، جزا اور سزا پر ایمان تمام مذاہب میں دوسرا رکن ہے اور پہلے رکن یعنی ایمان باللہ کے لیے لازمی ہے خدا میں تمام صفات کمال پائی جاتی ہیں اس کے احکام و افعال بیکار اور عبث نہیں ہیں اسی وجہ سے قرآن کریم کے اس عقیدے کے ثبوت میں اس کے سب سے زیادہ نمایاں دلائل مندرجہ ذیل آیات ہیں۔

روز قیامت اور کافروں کو سزا دینے کا ذکر کرتے ہوئے سورۃ مومنون کے آخر میں ارشاد ہے۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (المومنون۔۱۱۵)

(کیا تم نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں بیکار پیدا کیا ہے اور تمہیں ہماری طرف لوٹنا نہیں ہے۔)

سورۃالقیامۃ کے آخر میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى (سورۃالقیامۃ۔۳۶)

(کیا انسان سمجھتا ہے کہ اسے یونہی چھوڑ رکھا جائے گا۔)

قیامت کے انکار کے نتائج:

جو کوئی ایمان کے اس رکن سے انکار کرتا ہے تو اسے مخلوقات کے ساتھ خدا کی حکمت اور عدل اور انسان کو اچھی حالت میں پیدا کرنے کی نعمت سے انکار کرنا پڑے گا۔ وہ

یہ بھی نہیں مانے گا کہ خدا نے اسے دنیا کی ان تمام مخلوقات پر جو ظاہری اور پوشیدہ دنیا میں موجود ہے برتری نہیں دی ہے اور انہیں اس کے مفاد کے تابع نہیں بنایا ہے۔ اسے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ وہ اپنے تمام حواس، قویٰ اور عقل کی صلاحیتوں سے ناواقف ہے۔ نیز اسے اس بات کا علم بھی نہیں ہے کہ خدا نے اسے اپنی حکمت سے ایسے لامحدود علم حاصل کرنے کے قابل نہیں بنایا ہے، جس سے یہ پتہ چلا سکے کہ اسے ابدی اور دائمی زندگی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

اس کفر اور جہالت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس میں احساس کمتری پیدا ہوگا اور وہ یہ سمجھے گا کہ اسے کسی اہم مقصد کے لیے نہیں بلکہ یونہی بیکار پیدا کر دیا گیا ہے۔ اور اس سرزمین پر اس کی زندگی اسی مختصر عمر کے دائرے میں محدود رہے گی جو تفکرات، مصائب، ظلم و سرکشی، اور گناہوں سے آلودہ ہے۔ وہ یہ بھی خیال کرے گا کہ ہر انسان یونہی چھوڑ دیا جائے گا۔ نہ تو ہر ظالم انسان کو اس کے ظلم کی سزا انسان کو اس کے ظلم کی سزا ملے گی اور نہ ہر انصاف پسند اور قابل انسان کو اس کے انصاف اور قابلیت کا کوئی ثمرہ ملے گا۔ حالانکہ جب اس دنیا میں تمام افراد کے ساتھ پورا پورا انصاف نہیں ہوتا۔ تو یہ نہایت ضروری ہے کہ قیامت کے دن ہر ایک کے ساتھ پورے پورے عام انصاف کا مظاہرہ کیا جائے جیسا کہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے۔ "قیامت کے دن تمہیں پورا پور بدلہ دیا جائے گا۔"

قرآن کریم کے مکرر طرز بیان کا بہترین نمونہ وہ ہے جس میں گمراہ لیڈروں اور ان کے پیروں کے مابین جھگڑے کا ذکر کیا گیا ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ گمراہ کرنے والے اور گمراہ شدہ انسان اور جنات کے شیاطین ایک دوسرے پر الزم لگائیں گے اور ہر ایک دوسرے سے اپنی بیزاری اور بریت کا اعلان کرے گا اور اہل دوزخ اور اہل جنت کے درمیان دلچسپ گفتگو ہوگی۔

دوبارہ روحانی اور جسمانی زندگی:

قیامت اور اعمال کی جزاء کے بارے میں عیسائیوں کا جو عقیدہ ہے قرآن کریم اس کا مخالف ہے۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ آخرت کی زندگی میں بھی انسان ویسا ہی نمودار ہوگا جیسا کہ دنیا کی زندگی میں تھا مگر پاکیزہ نفوس اور اعلیٰ روح والے انسانوں کی روحیں اور اجسام

اپنی سابقہ زندگی سے زیادہ مکمل ہوں گی کیوں کہ وہ دنیا میں تزکیہ نفس کر چکے ہوں گے مگر خبیث نفس اور پست روح والے پہلے کی بہ نسبت زیادہ پست اور خبیث بن جائیں گے۔ کیونکہ وہ دنیا میں اپنی روحوں کو خراب کر چکے ہوں گے۔ قدیم مصریوں اور دوسری قوموں کی روایات سے ثابت ہے کہ قدیم مذاہب انسانوں کو روح و جسم دونوں کے ساتھ دوبارہ زندہ ہونے کی تعلیم دیتے تھے مگر ان کے رسولوں کے چلے جانے کے بعد وہ یہ خیال کرنے لگے تھے کہ ان کے اجسام ان کی موت کے بعد باقی رہتے ہیں لہٰذا (قیامت کے دن) وہ بعینہٖ اسی حالت میں زندہ ہوں گے (جس حالت میں وہ محفوظ کیے گئے تھے) لیکن قرآن کریم یہ بیان کرتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز فانی ہے اور قیامت آنے پر ہر چیز فنا ہو جائے گی۔ اہل السنت والجماعت کے علمائے عقائد کا قول ہے کہ اجسام کا دوبارہ زندہ ہونا مکمل فنا کے بعد ہوگا۔ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے۔

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِيْنَ ۙ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ (۵۶: ۶۰، ۶۲)

(ہم نے تمہارے درمیان موت کو مقرر کر دیا ہے اور ہم اس سے ہارنے والے نہیں ہیں کہ تمہاری جگہ تم جیسے اور پیدا کر دیں اور تم کو ایسی حالت میں پیدا کریں جو تمہیں معلوم نہیں ہے تمہیں پہلی پیدائش معلوم ہے پھر تم کیوں نصیحت حاصل نہیں کرتے۔)

اگر صرف روحیں دوبارہ زندہ ہوں تو ملکوت الٰہی کی یہ معزز و محترم مخلوق (انسان) کم ہو جائے گی۔ جو روح اور جسم دونوں سے مرکب ہے اور وہ روحانی اور جسمانی دونوں لذتوں سے لطف اندوز ہوتی ہے۔ یہی مخلوق خدا کے حکم سے اس کی حکمت اور صنعتوں کے اسرار کی اس طرح تکمیل کرتی ہے کہ اللہ نے حیوانات اور نباتات کو روحانی لذتوں سے محروم کر رکھا ہے اور فرشتوں کو جسمانی لذتوں سے (دیگر انسان کو دونوں نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ مترجم)

فلسفیانہ نظریات رکھنے والے اصحاب صرف دوبارہ روحانی زندگی کے اس لیے قائل ہیں کہ وہ جسمانی لذتوں کو ہیچ سمجھتے اور اسے حیوانیت کے نام سے موسوم کرتے ہیں حالانکہ (عملی طور پر) ان میں سے اکثر اس کے دلدادہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جسمانی لذت انسان کے لیے اس وقت عجیب بن جاتی ہے جب کہ وہ محض جسمانی لذتوں کے لیے

اپنی عقل اور تمام طاقتیں صرف کردے اور علم و عرفان کی روحانی اور ذہنی لذتوں سے بالکل کنارہ کش ہو جائے۔ یہ افراط اور تفریط ہندوؤں سے آئی ہے جو جسم کو حقیر سمجھتے ہیں اور روحانی تربیت کو اس پر موقوف سمجھتے ہیں کہ سخت ریاضت کر کے جسم کو تکلیف پہنچائی جائے۔ عیسائی راہبوں نے بھی ان کی اس طرح پیروی کی ہے جس طرح انہوں نے صلیب کفارہ اور تثلیث کے معاملے میں ان کا اتباع کیا ہے حالانکہ وہ خود حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ واقعہ نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے عیدالاضحیٰ کے موقع پر رخصت ہوتے وقت اپنے شاگردوں کے ساتھ شراب پی تھی اور ان سے کہا تھا" آج کے بعد میں انگور کا رس کبھی نہیں پیوں گا جب تک کہ میں تمہارے ساتھ اپنے باپ کی بادشاہت میں آکر دوبارہ نہ پیوں "۔ (متی ۲۹:۶) یہودیوں کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ البتہ اسلام نے اعتدال کی راہ اختیار کی۔ اس نے انسان کو اس کے تمام حقوق عطا کیے اور اس سے ان تمام چیزوں کا مطالبہ کیا جن کی بدولت وہ انسان کامل بن سکتا ہو تاکہ وہ حیوانیت پر روحانیت کو ترجیح دے کر دنیا میں رہ کر آخرت کی تیاری کرے۔

روحانیت کا غلبہ :

آخرت کی زندگی کے بارے میں قرآنی آیات اور احادیث نبویہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہاں روحانی طاقتیں اجسام پر غالب اور حاوی ہونگی وہ لطیف شکلیں بدل سکیں گی تھوڑے وقت میں طویل مسافتیں طے کر سکیں گی۔ بلکہ اہل جنت اور اہل دوزخ کے درمیان گفتگو بھی ہوگی۔ ہمارے زمانے میں انسان نے علم کیمیا، بجلی کے خواص، مختلف صنائع اور مشینوں میں جو ترقی کی ہے اس کی وجہ سے یہ باتیں انسانی حواس زیادہ آسانی سے سمجھنے لگے ہیں حالانکہ مادہ پرست ملحد مندرجہ ذیل قسم کی آیات کو محمد ﷺ کے تخیلات کا نتیجہ قرار دیتے تھے۔

وَنَادَىٰٓ أَصْحَٰبُ ٱلْجَنَّةِ أَصْحَٰبَ ٱلنَّارِ أَن قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدتُّم مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ۖ قَالُوا۟ نَعَمْ ۚ فَأَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ أَن لَّعْنَةُ ٱللَّهِ عَلَى ٱلظَّٰلِمِينَ ﴿٤٤﴾ (۷:۴۴)

(جنت والوں نے دوزخ والوں سے پکار کر کہا کہ ہمارے پروردگار نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا ہم نے اسے سچا پایا کیا تم نے بھی اپنے پروردگار کا وعدہ سچا پایا؟ انہوں نے جواب دیا ہاں پھر ان کے درمیان پکارنے والا پکارا کہ ظالموں پر خدا کی لعنت ہو۔)

سچا پایا کیا تم نے بھی اپنے پروردگار کا وعدہ سچا پایا؟ انہوں نے جواب دیا ہاں پھر ان کے درمیان پکارنے والا پکارا ظالموں پر خدا کی لعنت ہو۔)

آج کل ہم مصر سے یورپ کے پائے تخت کے لوگوں سے ٹیلیفون کے ذریعے بات چیت کرتے ہیں اور ریڈیو کے ذریعے ان کی تقاریر اور گانے سنتے ہیں اور جب ٹیلیوژن کا عام طور پر رواج ہو جائے گا تو بات چیت کے علاوہ وہ ہمیں دیکھ سکیں گے اور ہم انہیں دیکھیں گے۔

مغربی اور غیر مغربی علمائے روحانیت نے ثابت کیا ہے کہ انسانی روحیں مرنے کے بعد فرشتوں اور جنات کی طرح کائناتی مادہ کو کام میں لا کر مختلف جسموں میں تبدیل ہو سکتی ہیں [1] جیسا کہ صوفیہ انسانوں کے بارے میں کہتے ہیں۔ ان مسائل کی تشریح ہم اپنی تفسیر میں کر چکے ہیں یہاں ہم اجمالاً ان لوگوں کی تردید میں ان مسائل کا تذکرہ کر رہے ہیں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ قرآن کریم یہود و نصاریٰ کی کتابوں سے ماخوذ اور محمد ﷺ کی عقل باطن اور روحانی الھامات کا نتیجہ ہے۔ [2]

---

[1] ا.... کہا جاتا ہے کہ فرانس میں ایک شخص نے ایک عورت کی روح کو جسم میں تبدیل ہوتے دیکھا تھا وہ کہتا ہے کہ وہ پہلے بخار اور کہر کی شکل میں ظاہر ہوئی پھر وہ کثیف بن کر ایسے خوبصورت جسم میں تبدیل ہو گئی جو سفید کپڑے میں طویل تھا اس نے اس عورت سے اُس کے کپڑے کا ایک ٹکڑا مانگا جس کی اس نے اجازت دے دی لہٰذا اس نے ٹکڑا لے لیا اور پھر اسے پیرس میں کپڑوں کے کارخانوں میں دکھا کر دریافت کیا کہ ایسا باریک کپڑا ان کے ہاں موجود ہے یا نہیں؟ انہوں نے نفی میں جواب دیا مگر یہ کہا کہ ایسا کپڑا بنانا ممکن ہے اگر کوئی اس کی فرمائش کرے۔ ایسے واقعات ہمارے صوفیائے کرام کے بارے میں بھی منقول ہیں جو کبھی جسمانی پیراہن اتار دیتے تھے اور کبھی مختلف شکلوں میں تبدیل ہو جاتے تھے جیسے ابن عربی تھے اور انہی میں سے قضیب البان بھی تھے۔ ایک دفعہ ان کی تلاش کی گئی تو یہ دیکھا گیا کہ وہ اتنے بڑے ہو گئے کہ پورا گھر جس میں وہ مقیم تھے ان کے لیے تنگ ہو گیا یہاں تک کہ ان کا اپنے جسم کے ساتھ نکلنا مشکل ہو گیا تھا اس لیے وہ اپنے جسم کو سکیڑ کر نکل گئے۔ ممکن ہے ماہرین کیمیا اس وجہ سے اس کی تصدیق نہ کریں کہ انہوں نے اس قسم کے واقعات مشاہدہ نہیں کئے ہیں مگر وہ اس کے امکان سے انکار نہیں کر سکتے۔

[2] ا۔ اس قسم کا ایک واقعہ حضرت جابر کی حدیث ہے جسے بخاری اور مسلم دونوں نے روایت کیا ہے کہ جنت میں ہر ایک کی دو بیویاں ہوں گی ہر ایک ایسی ہو گی کہ ان کی پنڈلیوں کا گودا ان کے گوشت کے اندر سے نظر آتا ہوگا ہم نے اخبار الجہاد میں پڑھا ہے کہ رومانیا میں ایک عورت ہے جس کی نظر کی شعاعیں پردوں کو پھاڑ کر اندر کی چیزیں دیکھ لیتی ہیں۔ جیسا کہ ارواح مجردہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے۔ انگریزی اخباروں کی یہ خبر ہے کہ ایک نامہ نگار نے ایک انگریزی اخبار میں لکھا ہے کہ جنوبی امریکہ کی ریاست چلی کے عبادت خانے میں کچھ پرانی دستاویزات ملی ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ چین میں ایک لڑکا پیدا ہوا تھا جس کا نام شی شوان تھا۔ چند سالوں کے بعد اس کا جسم اتنا شفاف ہو گیا تھا کہ وہ شیشے کی طرح اندر کی چیزیں دیکھ لیتا تھا۔

یہاں یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں دنیا کی بربادی اور قیامت کے رونما ہونے کے بارے میں جو ذکر آیا ہے وہ قیامت، سزا اور جزاء کے عقیدے کی ابتداء ہے اس خبر کی اصلیت نہ اہل کتاب کے ہاں موجود ہے نہ دوسروں کے ہاں اور نہ یہ ممکن ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے اسے اپنی ذہانت اور عقل سے معلوم کر لیا ہو۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک قارعہ (متصادم چیز) جو بظاہر ایک ستارہ ہے زمین سے ٹکرائے گا زمین کو ہلاک اور پاش پاش کر دے گا اور وہ باریک غبار اور خاک ہو کر فضا میں پھیل جائے گی۔ اس وقت اس چیز میں خلل آ جائے گا جسے سائنسدانوں کی اصطلاح میں جاذبیت کہتے ہیں۔ ستارے بکھر جائیں گے اس کے بعد دنیا ایک نئے دور میں داخل ہو گی جسے آخرت کی زندگی کہا جاتا ہے۔

یہ ایسا دقیق مسئلہ ہے جو نہ اس وقت کے علمائے کائنات سمجھ سکتے تھے اور نہ مذہبی علماء اس کا تصور کر سکتے تھے، لہٰذا یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ نے اسے اپنے شہر کے کسی آدمی سے یا سفر میں سنا ہو۔ نیز یہ بات بھی عقل میں نہیں آ سکتی کہ یہ بات آپ ﷺ نے اپنی ذاتی رائے اور عقل سے کہی ہو۔ اس لیے یہ بھی قرآن کریم کی ان پیشین گوئیوں میں سے ایک ہے جو نفسیاتی وحی کے قائلوں کی قطعی تردید کر رہی ہے۔ موجودہ زمانے کے کئی علماء ہیئت نے صاف طور پر کہا ہے کہ قرآن کریم کے بتائے ہوئے اسباب کے ذریعے دنیا کی بربادی کا تصور سائنس کے موجودہ نظریات کے زیادہ قریب ہے۔

قیامت کی آیات کا عربوں کے لیے زیادہ موثر حصہ وہ ہے جس میں نہایت دلکش بلیغانہ انداز میں اس مبالغہ کے ساتھ جو ان کی زبان کا طرہ امتیاز ہے، جنت کی نعمتوں اور دوزخ کے عذاب کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ دنیا کے خلاف معمولی غیبی چیزوں کا بیان ہے۔ جیسا کہ خداوند تعالیٰ نے آگ کی یہ صفت بیان کی ہے۔

الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْـِٕدَةِ ؕ (۱۰۴:۷) (وہ آگ جو دلوں پر چڑھ جائے گی۔)

یا جنت کے بارے میں یہ بیان کیا گیا ہے۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ ۚ (۳۲:۱۸)

(کوئی نفس نہیں جانتا کہ ان کے لیے کیا پوشیدہ رکھا گیا ہے جس سے ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک حاصل

وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ۔ (۹:۷۲) (خدا کی رضامندی سب سے بڑے (نعمت) ہے۔)
سب سے بڑھ کر خدائی مناجات اور اس کی زیارت کی سعادت حاصل ہوگی۔ جس کا معتزلہ اور ان کے ہم خیالوں نے انکار کیا ہے اور انہوں نے اس سے متعلقہ عبارتوں کی تاویل کی ہے اور ایسی آیات کو متشابہات میں شمار کیا ہے۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے کیونکہ آخرت کی تمام چیزیں متشابہات ہیں۔ جنت کے پھلوں کے بارے میں خدا خود فرماتا ہے۔

وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا (۲:۲۵) (انہیں متشابہ پھل پیش کیے جائیں گے۔)
حضرت ابن عباس نے اس کی تفسیر میں یہ فرمایا ہے: سوائے ناموں کے بہشت کی کوئی چیز دنیا کی چیزوں کے مشابہ نہیں ہے۔

تیسرا رکن عمل صالح:

پیغمبروں کے مقاصد بعثت کا تیسرا رکن عمل صالح ہے۔ یہ خدا پر ایمان اور روز حساب کے ایمان کا لازمی نتیجہ ہے بلکہ یہ رکن ان دونوں ارکان سے تقویت حاصل کرتا ہے اور انہیں بھی تقویت دیتا ہے اس طرح ایمان اور عمل دونوں مل کر ایک دوسرے کو مستحکم کرتے ہیں اور ہر ایک کا کمال ایک دوسرے پر موقوف ہے۔ چنانچہ جس کا ایمان خراب ہوگا اس کے عمل بھی خراب ہوں گے اور وہ ریاکاری، نفاق یا ظاہری تقلید کا نمونہ بن جائیں گے۔ کوئی کام صالح نہیں ہوگا اور وہ اس پر عمل کرنے والے کی اس وقت تک اصلاح نہیں کر سکے گا، جب تک کہ وہ اس طریقے پر سر انجام نہ دیا جائے جو خدا نے مقرر فرمایا ہے۔ اس کا ذکر بھی قرآن کریم کی سورتوں میں بار بار آیا ہے تاکہ اس رکن کی وہ خرابیاں دور ہو جائیں جو انسانوں نے پیدا کی ہیں۔ انہوں نے نیک کاموں کو بھی محض رسمی کام بنا دیا ہے اس لیے ان سے نہ تو ان کا تزکیہ نفس ہوتا ہے اور نہ سماجی کاموں کی اصلاح ہوتی ہے تاہم عمل صالح کی تکرار مضامین قرآن کریم میں توحید و تقدیس الٰہی سے کمتر ہے کیونکہ توحید اصل بنیاد ہے اور دوسری چیزیں خواہ اس سے قریب ترکیوں نہ ہوں اس کے تابع ہیں۔

قرآن کے عملی اثرات:

اگر دلوں میں اثر پیدا کرنے کے لیے اس تکرار مضامین کی ضرورت نہ ہوتی تو صرف سورۃ والعصر اس قدر مختصر ہونے کے باوجود علمی اور عملی اصلاح کے لیے اس طرح کافی تھی جس طرح سورہ اخلاص پہلے اعتقادی رکن کے لیے کافی تھی۔ یہ دونوں سورتیں ایک سطر میں لکھی جاسکتی ہیں لہٰذا یہ قرآن کریم کے ایجاز وہدایت کا معجزہ ہیں۔ اس طرح سورہ زلزال رکن ثانی کے لیے نازل ہوئی یہ تین سطرں میں لکھی جاسکتی ہے۔ امام احمد اور طبرانی نے معجم کبیر میں روایت کی ہے کہ صعصعۃ بن معاویہ نبی کریم ﷺ کے پاس آیا۔ آپ ﷺ نے اسے یہ آیات پڑھ کر سنائیں۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (۹۹: ۷،۸)

(جو کوئی ایک ذرہ کے برابر نیکی کرے گا وہ اس کا (ثمرہ) دیکھے گا اور جو کوئی ایک ذرہ کے برابر برائی کرے گا، وہ بھی اس کا نتیجہ دیکھے گا۔)

اس نے کہا "بس میرے لیے یہ آیت کافی ہے، مجھے دوسری بات سننے کی ضرورت نہیں ہے۔" یہ بھی روایت ہے کہ کسی اعرابی نے رسول اللہ ﷺ کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا۔ اس نے کہا "اے رسول اللہ ﷺ! کیا ایک ذرہ برابر بھی۔" آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں" اس اعرابی نے کہا افسوس! یہ کہہ کر وہ کھڑا ہوگیا۔ اس پر رسول اکرم ﷺ نے فرمایا "اس اعرابی کے دل میں ایمان داخل ہوگیا ہے۔ زید بن اسلم سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک آدمی کو ایک آدمی کے سپرد کیا تاکہ وہ اسے دین کی تعلیم دے جب وہ اس آیت تک پہنچا تو اس نے کہا "پس میرے لیے یہ کافی ہے۔ اس معلم نے آپ ﷺ کے پاس جاکر اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اسے چھوڑ دو کیونکہ اس نے اب دین کو سمجھ لیا ہے۔ ان روایات کو سیوطی نے الدرالمنثور میں کتابوں کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ ان میں سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایک بڑے صحابی نے کسی غریب کو انگور کا ایک دانہ دیتے ہوئے کہا "اس میں نیکی کے بہت سے ذرات ہیں"۔ اس بات میں مذکورہ بالا آیت اور صحیح مسلم کی اس حدیث کا اثر ہے "تم نیکی کے ذرا سے کام کو بھی حقیر نہ سمجھو۔" ان واقعات پر غور کرنے سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ عربوں کے دل

ودماغ قرآنی ہدایت کو قبول کرنے کی کسی قدر صلاحیت رکھتے تھے۔ انہوں نے اس طرح نہ صرف اپنی اصلاح کی بلکہ وہ اصلاحی تحریکات میں تمام انسانوں کے علمبردار بنے۔ ان آیات کو سن کر ان لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ آخرت میں ان کے نیک و بد عمل کا خواہ وہ ایک ذرہ کے برابر ہی کیوں نہ ہوں ضرور بدلہ ملے گا۔ اس لیے انہوں نے ہر نیک کام کا جس قدر ان سے ہو سکا اپنے آپ کو عادی بنایا اور برے کاموں کو چھوڑ دیا۔ یہی وہ دین کی سمجھ اور ہدایت ہے جس کا خود مبلغ اسلام حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ نے اعتراف فرمایا ہے۔

عمل صالح ایمان باللہ کے لوازم میں درجہ اوّل کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ جو اللہ تعالیٰ کو پہچانتا ہے اسے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ حمد و شکر، عبادت محبت، اور تعظیم کا مستحق ہے مگر جزا و سزا کے عقیدے کا دوسرے درجہ میں لازمی حصہ ہے کیونکہ اس میں سزا کا خوف اور ثواب کی امید ہوتی ہے۔ اس لیے یہ تینوں ارکان انسانی فطرت کے مطابق پیغمبروں کی ہدایت کے بموجب ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے ہیں برخلاف ان کے صنم پرستانہ رسم و رواج کا انسانی علم و عمل اور اس کی نجات سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ ان کا دارومدار اس عقیدہ پر ہے کہ سفارش کرنے والی اور قربان ہونے والی ایک ہستی موجود ہے خواہ یہ بات کسی کے سمجھ میں نہ آئے اور فطرت انسانی اس کو ماننے سے گریز کرے۔ اسی لیے قرآن کریم کی متعدد آیات میں کفارہ کے عقیدہ اور صنم پرستانہ شفاعت کی تردید کی گئی ہے۔

نیک کاموں میں وہ فرض عبادات بھی شامل ہیں جن سے خدا کا قرب حاصل ہوتا ہے اور نیکی کے وہ تمام کام بھی شامل ہیں جو خدا کو پسند ہیں اور جن سے انسانوں کی اصلاح ہوتی ہے۔ جیسے والدین کے ساتھ نیک سلوک، صلہ رحمی، یتیموں اور غریبوں کا خیال رکھنا۔ اس سلسلے میں چند اصول سورہ اسراء کی جامع ہدایات میں مندرج ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۳﴾ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿۲۴﴾ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ﴿۲۵﴾ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ

تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ﴿٢٦﴾ إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ ۖ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا ﴿٢٧﴾ وَإِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَاءَ رَحْمَةٍ مِّن رَّبِّكَ تَرْجُوهَا فَقُل لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُورًا ﴿٢٨﴾ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ﴿٢٩﴾ إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا ﴿٣٠﴾ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ ۖ نَّحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ ۚ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْئًا كَبِيرًا ﴿٣١﴾ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَىٰ ۖ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا ﴿٣٢﴾ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۗ وَمَن قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِف فِّي الْقَتْلِ ۖ إِنَّهُ كَانَ مَنصُورًا ﴿٣٣﴾ وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ ۚ وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ ۖ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا ﴿٣٤﴾ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ﴿٣٥﴾ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ﴿٣٦﴾ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّكَ لَن تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَن تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا ﴿٣٧﴾ كُلُّ ذَٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهُ عِندَ رَبِّكَ مَكْرُوهًا ﴿٣٨﴾ ذَٰلِكَ مِمَّا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۗ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ فَتُلْقَىٰ فِي جَهَنَّمَ مَلُومًا مَّدْحُورًا ﴿٣٩﴾ (۱۷: ۲۳تا۳۹)

(اور پروردگار کا یہ فیصلہ ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو اور جب ان میں سے کوئی ایک یا دونوں تمہارے آگے بوڑھے ہو جائیں۔ تو انہیں نہ سخت بات کہو نہ جھڑ کو (بلکہ) مہربانی کی بات کہو محبت سے ان کے آگے جھک جاؤ اور کہو خدایا ان دونوں پر اسی طرح رحم کر جس طرح انہوں نے بچپن میں مجھے پالا ہے تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ تمہارے دلوں میں کیا ہے اگر نیک بنو تو وہ توبہ کرنے والوں کے حق میں بہت بخشش کرنے والا ہے اور رشتہ داروں کو ان کا حق دو اور مسکین و مسافر کی مدد کرو (لیکن) اسراف نہ کرو اسراف کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا ناشکرا ہے۔ اور اگر کبھی رحمت خداوندی کی امید میں ان سے تغافل کرو۔ تو بھی ان سے اچھی بات کہو اور اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بالکل نہ باندھ لو اور نہ اسے بالکل چھوڑ دو (یعنی نہ بالکل بخیل بنو نہ مسرف) ایسا نہ ہو کہ ہارے ہوئے ملامت زدہ بن کر بیٹھنا پڑے۔ تمہارا پروردگار جس کے لیے چاہتا ہے رزق پھیلا دیتا ہے اور کم کر دیتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کی خوب خبر اور نظر رکھتا ہے اور اپنی اولاد کو غربت کے ڈر سے قتل نہ کرو ہم انہیں اور تمہیں رزق دیتے ہیں۔ انہیں قتل کرنا بڑی غلطی ہے اور بدکاری کے قریب نہ جاؤ یہ بے حیائی اور بری راہ ہے اور ناجائز طریقے پر کسی کو قتل نہ کرو جسے مارنا خدا نے حرام قرار دے دیا ہے اور جو کوئی مظلوم کو قتل کرے تو ہم نے مقتول کے وارث کو زور بخش دیا مگر وہ خون ریزی میں اسراف نہ کرے (کیونکہ) اسے مدد ملی ہوئی ہے اور اچھائی کے علاوہ کسی اور طرح یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائے اور عہد پورا کرو کیونکہ عہد کی باز پرس کی جائے

گی۔ اور جب ناپو تو ناپ پوری کرو اور سیدھی ترازو سے تولو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اس بات کے پیچھے نہ پڑو جس کی تمھیں خبر نہیں ہے کیونکہ کان آنکھ اور دل سب سے اس بارے میں بازپرس ہو گی۔ اور اترا کر زمین پر نہ چلو۔ کیونکہ نہ تو زمین کو پھاڑ سکو گے نہ اونچے ہو کر پہاڑوں تک پہنچ سکو گے یہ سب چیزیں تمہارے پروردگار کی نظر میں بہت ہی بری ہیں۔ یہ ہے وہ حکمت جو اللہ کی طرف سے (اے پیغمبر) تم پر وحی کی گئی ہے اور خدا کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ بناؤ ورنہ دوزخ میں ملامت زدہ ہو کر ڈال لے جاؤ گے۔)

یہ آیات تورات کے دس احکام سے زیادہ جامع اور بلند ہیں نیز سورۃ انعام کی اخلاقی آیات (۶۔۱۵۱۔۱۵۳) اور سورہ بقرہ کی آیت (۲۔۱۷۷) وغیرہ ملاحظہ ہوں جن میں اچھے اخلاق کی ترغیب دی گئی ہے اور برے کاموں اور ان گناہوں سے روکا گیا ہے جو جسم، مال، آبرو، عقل اور دین سب کے لیے مضر ہیں اور جن کے سب سے بڑے محرکات خواہشوں کی پیروی اور شیطانی وسوسوں کی اطاعت ہے۔ ان کے برعکس تقویٰ کی طاقت ہے۔ تقویٰ ایک جامع لفظ ہے جو نفس کو ہر قسم کی ایسی نجاستوں سے بچاتا ہے جن سے دنیا اور آخرت میں انجام خراب ہو۔ اسی لیے اس کا مذہبی خانگی اور جنگی ہر قسم کے مسائل میں ذکر آتا ہے۔

قرآن کریم کا اخلاقی دستور:

قرآن کریم عملی ہدایت کی کتاب ہے وہ کسی علم و فن کی نظری کتاب نہیں ہے وہ اپنے غور کرنے والے کو حق و خیر اور باطل و شر کے اصل اسباب کی طرف خود بخود رہنمائی کرتی ہے اور اسے تزکیہ نفس کا یہ طریقہ بتاتی ہے کہ وہ اپنے اعمال کا محاسبہ کرے تاکہ نیکی اور صداقت اپنے مخالفوں پر غالب آ جائے۔ یہ تعلیم و تربیت دو فطری باتوں پر موقوف ہے جن کے سمجھنے کے لیے ارسطو اور ابن سینا کے فلسفہ کے مطالعہ کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ خواہشات کی پیروی کے خلاف مجاہدہ نفس کیا جائے اور اپنے اندر تقویٰ کی صفت پیدا کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں خواہش کی پیروی کی بار بار مذمت کی گئی ہے اور اس سے روکا گیا ہے کیونکہ اغراض نفسانی حق و انصاف کی راہ میں ہمیشہ حائل رہتی ہیں اس کی مذمت تقریباً تیس آیات میں کی گئی ہے اور تقویٰ اور متقین کا ذکر دو سو سے زیادہ آیات میں بار بار کیا گیا ہے ان کے بعض مضامین کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ مفاد پرستی کے سلسلے میں خداوند تعالیٰ نے اپنے پیغمبر سے ذکر کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اس نے بنو اسرائیل کو کتاب، حکمت اور نبوت عطا فرمائی اور

انہیں دنیا کے تمام لوگوں پر فضیلت دی اور انہیں شریعت کی کھلی نشانیاں مرحمت فرمائیں مگر شرعی علم حاصل ہونے کے بعد وہ آپس میں اختلاف کرنے لگے۔ آگے چل کر خدا فرماتا ہے کہ اس نے آنحضرت ﷺ کو بھی اپنے حکم سے ایک شریعت دی اور سب کو اس پر عمل کرنے کا حکم دیا۔ نیز آپ ﷺ کو ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی کرنے سے منع کیا ہے جن کے پاس کوئی شریعت نہیں آئی ہے۔ وہ مشرکین مکہ میں آپ ﷺ کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ لوگ جو شرعی علم حاصل کرنے کے بعد گمراہ ہوئے۔ یہود و نصاریٰ اور وہ لوگ جن کے پاس شریعت کا کوئی علم نہیں ہے (مشرکین عرب) دونوں ظالم ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے دوست اور مددگار ہیں مگر خدا صرف پرہیزگاروں کا حامی ہے۔ یہ قرآن کریم تمام لوگوں کی بصیرت کے لیے ہے اور ایمان والے لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت کا ذریعہ ہے۔ خدا نے برے لوگوں کو ان کے برابر قرار نہیں دیا ہے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے۔ ایسے لوگ ان کے برابر نہ زندگی میں ہیں اور نہ مرنے کے بعد۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو حق پر پیدا کیا ہے تاکہ ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دیا جائے۔ مشرکین کے خیال کے مطابق لوگوں کو بیکار نہیں چھوڑا جائے گا اور نہ وہ اہل کتاب کے دعووں کے مطابق کسی قوم یا کسی فرد سے ان کے نام ونسب کی بناء پر رعایت کرے گا۔ اس سلسلے میں وہ کسی کی شفاعت اور کفارہ قبول نہیں کرے گا۔ اسی مضمون کی بعض دوسری آیات یہ ہیں۔

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ۭ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۴۵: ۲۳)

(کیا تم نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش کو اپنا خدا بنا لیا ہے اور علم کے باوجود خدا نے اسے گمراہ کر دیا ہے۔ اس کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ خدا کے بعد کون اس کو ہدایت دے گا کیا تم نصیحت قبول نہیں کرو گے؟)

اسی مضمون کی سورہ فرقان میں یہ آیات ہیں:

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ۭ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ۝ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ۭ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ۝ (۲۵: ۴۳-۴۴)

(کیا تم نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا لیا ہے کیا تم اس کے ذمہ دار ہو یا تم

یہ خیال کرتے ہو کہ ان میں سے اکثر سنتے اور سمجھتے ہیں؟ حقیقت میں وہ چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔)

چند اخلاقی ہدایات دینے کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ مومنوں کو پرہیز گاری کا ثمرہ کیا ملے گا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (الانفال۔۲۹)

(اے ایمان والو اگر تم اللہ سے ڈرو گے تو وہ تمہیں نور بصیرت عطا فرمائے گا اور تمہاری برائیاں دور کرے گا اور تمہاری بخشش کرے گا اللہ بہت بڑی مہربانی والا ہے۔)

اس آیت کی تشریح میں نے اپنی تفسیر کی جلد ۹ میں بیان کی ہے۔ اس کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے۔

فرقان کا مفہوم:

یہ آیت اس سلسلے کی ہدایات کی آخری کڑی ہے جن کا تعلق مومنوں سے ہے۔ اس کا مفہوم وسیع تر ہے اور یہ تمام ہدایات کے لیے بنیادی اصول ہے۔ اس کا ثمرہ فرقان ہے فرقان کا لفظ مبالغہ کا صیغہ ہے جس کا مادہ فرق ہے جس کے لغوی معنی دو یا اس سے زیادہ چیزوں کو الگ الگ کرنا ہے۔ یہاں فرقان سے مراد صحیح علم اور صحیح حکم ہے اس لیے اس کی تفسیر نور کے ساتھ کی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف چیزوں میں علمی طور پر فرق اور تمیز کرنے ہی سے وہ اشیاء اجمال کے دائرہ سے نکل کر تفصیل کے دائرہ میں پہنچ جاتی ہیں۔ کیونکہ صحیح علم وہ تفصیلی علم ہوتا ہے جو مختلف اجناس اور انواع و اشخاص میں تمیز کر سکے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ کلیات و جزئیات کا فرق، مفرد، مرکب کا فرق اور مرکبات میں حسی اور مفہومی اجزاء کا تناسب معلوم کرے اور ان میں سے ہر چیز کو واضح کرے اور ہر ایک کا اس طرح حق ادا کیا جائے کہ ہر چیز دوسرے سے ممتاز اور نمایاں ہو سکے۔ ان کی مثالیں پیش کرنا طوالت کا باعث ہوگا۔ (تفسیر میں ہم نے نمونے کی مثالیں پیش کی ہیں۔)

آیت کی تشریح

مذکورہ بالا آیت کی تشریح یہ ہے کہ اگر تم شرعی اور مذہبی تقاضوں کے مطابق جہاں اللہ سے ڈرنا چاہئے وہاں اللہ سے ڈرو گے اور نظام کائنات میں اس کے فطری قوانین کے زیر اثر اس سے خائف رہو گے تو وہ اس تقوے کی بدولت تمہیں علم و حکمت کا ایسا ملکہ عطا فرمائے گا جس کے ذریعے تم حق و باطل میں تمیز کر سکو گے اور نفع و نقصان کی چیزوں کا فرق محسوس کرو گے، تم روشنی اور تاریکی کو پہچان لو گے اور واضح دلائل و شبہات میں تمیز کر سکو گے۔ بعض قدیم مفسرین نے یہاں فرقان کی تشریح 'نور بصیرت' سے کی ہے جو حق و باطل کو الگ الگ کرتا ہے یہ عین اس تشریح کے مطابق ہے جو ہم نے فرقان کے معنی علم و حکمت بتا کر کی ہے۔ بعض علماء نے فرقان کا مفہوم "خدائی نصرت" کے لفظ سے ظاہر کیا ہے کیوں کہ یہ بھی حق پرست اور باطل پرست کو الگ الگ کرتا ہے۔ مومن کو عزت ملتی ہے اور کافر کو ذلت نصیب ہوتی ہے۔ بعض لوگوں نے اس کا مفہوم دنیا کی سختیوں اور آخرت کے عذاب سے نجات بتایا ہے۔ بہر حال یہ عملی فرقان ہے جو علمی فرقان کا نتیجہ ہے۔ ہر ایک نے اپنے وقت اور تلقین کرنے کے حالات کے مطابق تشریح کی ہے۔ انہوں نے اس کے لغوی مفہوم کی تحلیل نہیں کی ہے اور نہ وسیع معنی کا لحاظ کیا ہے جو ہر قسم کے تقوے کا ثمرہ بن سکے۔ ایسی چیز صرف نور علم ہو سکتا ہے جسے حکمت کہا جاتا ہے اور اس کا طالب وہاں تک صرف تقوے کی بدولت پہنچ سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کئی مقامات پر بیان کیا ہے کہ مومن اس کی ذات سے ڈرے، آگ سے بچے، شرک، سلطنتوں اور قوموں کے عام فتنوں سے پرہیز کرے۔ یہ باتیں اس آیت کے سیاق و سباق کے نصائح میں آچکی ہیں۔ نیز لڑائی میں ذلت اور شکست سے بچنے کا حکم بھی دیا گیا ہے اور عورتوں کے مظالم سے بچنے کی ہدایت بھی ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آخر کار زمین کی میراث پرہیز گاروں کے لیے ہے جیسا کہ آخرت میں جنت پرہیز گاروں کے لیے وقف ہے (اس کے علاوہ تقویٰ کا لفظ ان آیات میں بھی آیا ہے)

ا۔ وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (۶۵: ۲، ۳)

(جو اللہ سے ڈرے گا خدا اس کے لیے راستہ نکالے گا اور اسے اس جگہ سے رزق دے گا۔ جس کا اسے خیال

وگمان بھی نہیں ہوگا)

۲۔ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَّهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْرًا ۞ (۶۵: ۴)

جو اللہ سے ڈرے گا۔ تو وہ اس کے کام کو آسان کر دے گا۔

۳۔ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهِ وَيُعْظِمْ لَهُ أَجْرًا ۞ (۶۵: ۵)

۳۔ جو اللہ سے ڈرے گا خدا اس کی برائیاں دور کرے گا اور اسے بڑا اجر دے گا۔

ایسی مثالیں عام وخاص تقویٰ اور اس کے اجراء اور انجام کی بہت ہیں۔

تقویٰ کا مفہوم:

تقویٰ کا عام مفہوم یہ ہے کہ انسان ہر اس چیز سے بچے جو اس کی ذات، اس کے ہم جنس انسانوں کو خواہ وہ دور ہوں یا قریب نقصان پہنچائے اور اس کے شریفانہ اغراض ومقاصد اور ممکن کمالات کی راہ میں حائل ہو۔ اس تعریف کے تحت علماء نے یہ کہا کہ تقوے کا مطلب یہ ہے کہ تمام گناہوں کو ترک کر دیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو خدا کی اطاعت کی جائے۔ اس تشریح پر ہم اس قدر اضافہ کرتے ہیں کہ ان دنیاوی اسباب سے بھی پرہیز کیا جائے جو کمالات اور سعادت دارین کے حصول میں کائنات کے فطری قوانین کے مطابق حائل ہوں جیسے دشمنوں پر غالب آنا اور کلمہ حق کو اس سر زمین میں سر بلند کرنا جیسا کہ درحقیقت ہوا ہے اور کلمہ کفر کو سرنگوں کرنا۔ اس میں کمال اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کتاب وسنت کا وسیع علم ہو نیز اس میں کمال پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے خدائی قوانین فطرت کا اجتماعی اور انفرادی حیثیت سے علم حاصل ہو جیسا کہ خدا نے اپنی کتاب کی آیات میں اس طرف رہنمائی فرمائی ہے۔ اس بنا پر تقویٰ کا عام اور مکمل ثمرہ اس صورت میں نمودار ہو سکتا ہے جب اسے ایسا ملکہ فرقان (قوت فیصلہ) حاصل ہو جس کے نور کے ذریعے انسان علم وحکمت اور عمل کی پیش آنے والی اشیاء میں تمیز کر سکے اور وہ یہ جلد فیصلہ کر سکے کہ کس چیز کو قبول کیا جائے اور کیا چیز چھوڑ دی جائے اور کیا کام کیا جائے اور کونسا چھوڑنا ضروری ہے۔ آیت مذکورہ میں فرقانا کا لفظ نکرہ کے طور پر اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ وہ تنوع کے مفہوم کو ادا کر سکے جو تقویٰ کے مختلف اقسام کے تابع ہوتا ہے کہ جیسے سیاست وحکومت کے فتنے، حلال وحرام، انصاف اور

ظلم لہٰذا جو کوئی ان میں سے کسی معاملے میں اللہ کا خوف کھائے گا۔ تو خدا اسے اس کے مطابق نور بصیرت عطا فرمائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ خلفا اور حکام جو رسول اللہ ﷺ کے صحابی تھے اور ان کے بعد جو عرب خلفاء آئے وہ فتوحات کے زمانے میں بھی روئے زمین میں منصف ترین حاکم تھے۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر گستاف لیبان مصنف تمدن عرب وغیرہ نے یہ کہا ہے "تاریخ میں عربوں سے زیادہ کوئی انصاف پسند اور رحمدل حاکم نہیں پایا گیا"۔

مگر ان تمام خوبیوں کے باوجود وہ سیاست اور حکومت کے فتنوں سے نہیں بچ سکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں اس معاملے کا تجربہ بہت کم تھا اس لیے انہیں یہ سزا ملی کہ ان میں تفرقہ پیدا ہو گیا وہ کمزور ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ان کی سلطنت کو زوال آ گیا۔ ان کے بعد جو عجمی مسلمان حاکم ہوئے وہ تقویٰ کی کسی ضروری قسم سے واقف نہیں تھے اس وجہ سے وہ فرقان یعنی نور بصیرت سے محروم رہے۔ وہ یہی خیال کرتے رہے کہ وہ اپنی شان و شوکت کو از سر نو زندہ کر رہے ہیں حالانکہ وہ اس نور بصیرت سے ناواقف تھے اور تقوے کی اس راہ سے ہٹے ہوئے تھے جو ان کا تزکیہ کر کے انہیں دنیا کی اصلاح کے قابل بنا سکے۔ بلکہ وہ عیش و عشرت میں مشغول ہو گئے کیونکہ ان کا یہ خیال تھا کہ مغرب نے اپنی عیش پرستی اور بدکاری کے ذریعے ترقی کی ہے حالانکہ ان کی ترقی ان کے حکما اور ان کے نیک لوگوں کے کارناموں کا نتیجہ ہے جنھوں نے اپنی زندگی علم اور مفید کاموں کے لیے وقف کر دی تھی۔

وَيُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّـَٔاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ اس جملہ کا عطف پہلے جملہ پر ہے یعنی اسی فرقان (علم و حکمت) کی بدولت اور اس کے اثر سے خدا تمہاری برائیوں کی آلائشوں کو دور کر دے گا اور تم دوبارہ برائی نہیں کر سکو گے جس کا نتیجہ مہلک عادتوں کی صورتوں میں نمودار ہوتا ہے۔ خدا تمہارے عیبوں پر پردہ پوشی کر کے اور سزا نہ دے کر تمہارے گناہوں کو بخش دے گا۔ خدا بہت مہربان ہے اس کی بڑی مہربانی یہ ہے کہ اس میں اتنے بڑے بدلے (فرقان) کو اپنی دونوں مثبت اور منفی قسموں کے ساتھ تقویٰ کا بدلہ اور اس کا نتیجہ قرار دیا۔ (آیت کی تفسیر کا خلاصہ ختم ہوا۔)

اسلامی عبادات کی اہمیت:

نیک کاموں کی ہدایات میں قرآن کریم کا دستور یہ ہے کہ وہ اس کے بنیادی اصول بیان کرتا ہے اور اجمالی طور پر انہیں بار بار یاد دلاتا رہتا ہے۔ عبادات میں قرآن کریم نے نماز اور زکواۃ پر سب سے زیادہ زور دیا ہے کیونکہ نماز اعلیٰ روحانی عبادت اور اجتماعی زندگی کا نصب العین ہے اور زکوۃ سب سے بڑی مالی عبادت اور سماجی فلاح و بہبود کا ذریعہ ہے اس لیے بہت سی آیات میں بار بار ان دونوں کاموں کا حکم دیا گیا ہے اور ان کے اہم فوائد اس طرح بیان کیے گئے ہیں۔

۱۔ اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ (۲۹:۴۵)

(اے پیغمبر، کتاب میں سے جو وحی تم پر نازل کی گئی ہے وہ انہیں پڑھ کر سناؤ اور نماز کو قائم کرو، کیونکہ نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔ بلاشک و شبہ اللہ کا ذکر سب سے بڑھ کر ہے۔ اللہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔)

۲۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۝ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۝ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۝ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰي صَلَاتِهِمْ دَاۗىِٕمُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ (۷۰: ۱۹،۲۵)

(بے شک انسان کم ہمت پیدا کیا گیا ہے جب اسے تکلیف لاحق ہوتی ہے تو بہت گھبراتا ہے جب بھلائی حاصل ہوتی ہے تو بخل کرتا ہے سوائے ان نمازیوں کے جو اپنی نماز کے ہمیشہ پابند ہیں اور وہ جن کے مال میں سائل اور محروم کا مقرر حق ہوتا ہے۔)

قرآن کریم میں نماز، زکوۃ، روزہ اور حج کے ان احکام اور ارکان کا بار بار ذکر نہیں ہے، جن کا تعلق عمل سے ہے اور وہ رسول اکرم ﷺ کی پیروی سے حاصل کیے جا سکتے ہیں اس لیے قرآن کریم میں ان احکام میں سے صرف انہی کا ذکر کیا گیا ہے جن کے ذکر سے کوئی خاص (اخلاقی) فائدہ حاصل ہو سکتا تھا چنانچہ روزے کے احکام صرف دوسری سورت میں ایک مقام پر بیان کیے گئے ہیں مگر ہر نماز میں رکعتوں کی تعداد اور رکوع و سجود کی مقدار نہیں بتائی گئی ہے اور نہ ہر قسم کے مال میں زکوۃ کا واجب نصاب متعین کیا گیا ہے کیونکہ یہ سب باتیں رسول اکرم ﷺ کے بیان سے معلوم ہو سکتی ہیں اور عملی طریقہ (سنت متواترہ) سے محفوظ رہتی ہیں۔ ان تفصیلات کے ذکر سے نہ تزکیہ نفس ہوتا ہے

اور نہ ایمان تر و تازہ ہوتا ہے۔

زکوٰۃ کے بعض فوائد مقصد باب ہشتم میں قرآن کریم کی مالی اصلاحات کے سلسلے میں بیان کیے جائیں گے۔

اگر ممکن ہوا تو ہم کتاب کے دوسرے حصے میں ایک باب مقرر کریں گے جس میں اسلامی عبادات کے روحانی و سماجی اسرار اور صحت کے لحاظ سے اُس کے فوائد بیان کریں گے۔ دوسرے مذاہب کی عبادتوں کے مقابلے میں انہیں جو امتیاز اور فضیلت حاصل ہے اس کا ذکر بھی کیا جائیگا۔ اس سے یہ معلوم ہوگا کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) صرف یہی چیز پیش کرتے تو یہ ان کی نبوت کو ثابت کرنے کے لیے کافی تھی اور اسی کے ذریعے خدا دین کی تکمیل کر سکتا تھا۔

انجیل پر قرآن کریم کی فضیلت :

ہم مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن کریم کی شہادت کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کی انجیل ہدایت اور نور ہے۔ گو ہم اصل انجیل سے ناواقف ہیں تاہم اس کے ساتھ ساتھ ہمارا یہ عقیدہ بھی ہے کہ اس کی ہدایت مخصوص لوگوں کے لیے وقتی تھی وہ عالمگیر اور ہمیشہ رہنے والی تعلیمات نہ تھیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین اور وحی کی تکمیل صرف قرآن کریم کے ذریعے کی ہے اس کے فضائل زیادہ وسیع، مکمل، عالمگیر اور دائمی ہیں۔

یہاں میں انجیل کی صرف ایسی دو خوبیوں کا ذکر کرونگا جن کے بارے میں عیسائیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دونوں خوبیاں اسلامی تعلیمات سے افضل و اکمل ہیں۔

ا۔ مسیحی عدم تشدد :

مسیح علیہ السلام نے فرمایا ہے "اپنے دشمنوں سے بھی محبت کرو۔ اپنے لعنت کرنے والوں کے لے برکت کی دعا مانگو، جو تم سے عداوت رکھے اس پر احسان کرو اور جو تمہارے دائیں گال پر تھپڑ مارے اس کے سامنے اپنا بایاں گال بھی پیش کرو۔" (ملاحظہ ہو انجیل متی کی پانچویں فصل کا آخری حصہ)

یہ ہر ایک کو معلوم ہے کہ ایسے احکام کی تعمیل کرنا ذلیل اور غلام قوموں کے سوا

کسی (خوددار) انسان کے بس کا کام نہیں ہے۔ اس قسم کی تعلیم کا سب سے بڑا نتیجہ یہ نکلے گا کہ طاقتور انسان عاجز کمزوروں پر ظلم کرنے لگیں گے (اس تعلیم کا ایک مخالف مگر دلچسپ پہلو یہ ہے کہ) جو لوگ اپنے آپ کو مسیحی کہتے ہیں وہی اس تعلیم کی سب سے زیادہ مخالفت کر رہے ہیں۔

ایسے احکام، عالمگیر فطری مذہب میں شامل نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ان کی تعمیل غیر ممکن ہے اسی لیے خدا تعالیٰ فرماتا ہے لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (خداوند تعالیٰ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا) ایسے موقع پر قرآن کریم نے انصاف، رحم اور مصلحت کو آپس میں جمع کر دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ (۴۲: ۴۰-۴۳)

(برائی کا بدلہ اس جیسی برائی ہے مگر جو شخص معاف کر لے اور اصلاح کرے تو اس کا ثواب خدا کے ذمے ہے خدا ظالموں کو پسند نہیں کرتا ظلم ہونے کے بعد اگر کوئی بدلہ لے تو اس پر الزام نہیں ہے۔ الزام تو صرف ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے اور دنیا میں ناحق سرکشی اختیار کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو دردناک عذاب دیا جائے گا اور جو شخص صبر کرے اور معاف کر دے تو بے شک یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔)

ظاہر ہے بدسلوکی کے موقع پر عفو اور درگذر وہی کر سکتا ہے جو بدلہ لینے کی طاقت رکھتا ہو۔ اس طرح وہ معاف کر کے اپنی فراخدلی کا ثبوت پیش کرے گا، ایسی صورت میں ظلم اور زیادتی کرنے کے بجائے اس کی عداوت محبت میں تبدیل ہو جائے گی۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَلَا تَسْتَوِى الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِىْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِىٌّ حَمِيْمٌ ۝ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝ (۴۱: ۳۴-۳۵)

(نیکی اور بدی برابر نہیں ہر معاملے کا جواب بہترین طریقے پر دو۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارا دشمن بھی ایسا ہو جائے گا جیسے وہ گہرا دوست ہے (یہ بات انہی میں پائی جاتی ہے) جو صبر اختیار کرتے ہیں، درحقیقت یہ بات کسی بڑے نصیب والے ہی کو ملتی ہے۔)

دیکھو! قرآن کریم نے کس طرح انصاف ورحمدلی کے مراتب کمال بیان کیے ہیں اور کس خوبی کے ساتھ اس مسئلہ کو عقل اور مصلحت کے مطابق واضح کیا ہے۔ کیا افضل پیغمبر اور ہادی کی زبان سے نکلنے والا اعلیٰ اصلاحی بیان یہ ثابت نہیں کرتا ہے کہ یہی وہ خدا کی وحی ہے جس کے ذریعے دین کی تکمیل ہوئی؟ کیوں نہیں، ہم اس کی گواہی دیتے ہیں اس سے وہی انکار کر سکتا ہے جو بیوقوف اور جاہل ہو۔

۲۔ مسیحی زہد ورہبانیت:

حضرت مسیح علیہ السلام نے دنیا سے بیزاری اور اسے چھوڑنے کا حکم دے کر اور دولت مندوں کی مذمت کر کے بہت مبالغے سے کام لیا ہے یہاں تک کہ انہوں نے کہا "اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گذر جانا اس سے زیادہ آسان ہے کہ دولت مند آسمانی بادشاہت میں داخل ہو۔"

ہماری رائے ہے کہ یہ اور اس سے پہلے دونوں مسائل یہودیوں کی انتہائی زر پرستی کے خلاف ایک عارضی اصلاحی قدم تھا۔ ان کے اخلاق بہت بگڑ چکے تھے اور وہ دنیا کے مقابلے میں دین کی ذرا پروا نہیں کرتے تھے۔ ایسے موقع پر انتہا پسندی کا مقابلہ انتہا پسندی سے کیا جاتا ہے۔ اس زمانے کی رومن سلطنت بھی جس نے یہودیوں وغیرہ کے آزادی چھینی تھی ظلم وستم، بدکاری، سرکشی میں بہت آگے بڑھی ہوئی تھی۔

مگر اسلام عالم انسانیت کا پائیدار اور عالمگیر مذہب ہے اس میں وہی حکم پیش کیا جائے گا جس میں تمام لوگوں کی دینی اور دنیاوی فلاح وبہبود مد نظر ہو گی۔ اس سلسلے میں اس نے مال کے استعمال کی اس صورت میں مذمت کی ہے جب کہ فضول خرچی اور کجروی کے طور پر اس کے استعمال سے نقصان پہنچے یا ناجائز طور پر اسے کھایا جائے اور ضروری حقوق نہ ادا کیے جائیں اور غریبوں اور ضرورت مندوں کو دینے میں کنجوسی کی جائے مگر اس کے ساتھ ساتھ جائز طریقے سے مال حاصل کرنے اور خدا کی راہ میں جائز طریقے سے اس طرح خرچ کرنے کی تعریف کی گئی ہے کہ جس سے عوام الناس کو فائدہ پہنچے اور قوم وملت کو عزت واستحکام نصیب ہو اور ملک کی حریت وآزادی محفوظ رکھنے ہیں اس کی مدد شامل حال ہو۔

آپ مقصد ہشتم میں اس سے زیادہ اعلیٰ اصلاح کا بیان ملاحظہ فرمائیں گے۔
یہی وہ بنیادی اصول ہیں جن کے ذریعے خدا نے اپنے دین کی تکمیل کی اور انہیں
ب کی شکل میں حضرت محمد ﷺ پر نازل فرمایا۔ ورنہ ایسی آسمانی کتابوں اور مشہور
ء اور فلسفیوں کی تصانیف و تعلیمات کی اصلاح جنھیں کروڑوں انسان مانتے ہوں کسی امی
لیم یافتہ کے بس کی بات نہیں ہے؟ کیا ایسی صورت میں یہ بات قرین عقل ہے کہ
ن کریم خدائی وحی ہے یا محمد ﷺ کی ذاتی تصنیف ہے؟
خواہ میں ہر چیز کو بھول جاؤں مگر میں اس گفتگو کو نہیں فراموش کر سکوں گا جس
، اسلام اور مسیحیت کے فضائل کے بارے میں میرے کان سب سے پہلے آشنا ہوئے اور
یرے دل پر ہمیشہ کے لیے نقش ہوئی۔ آپ خیال کریں گے کہ شاید یہ گفتگو میں نے
ے زمانے کے اکابر علماء سے سنی ہو گی۔ نہیں وہ گفتگو میں نے طرابلس شام کے سب سے
ے عیسائی افسر کی زبانی سنی تھی اس کا نام اسکندر کا ستقلیس تھا۔ وہ روس اور جرمنی
ں سلطنتوں کا قونصل جنرل تھا۔ میں اس کے پاس طالب علمی کے زمانے میں نجی مالی
ملے کے سلسلے میں اپنے والد صاحب کی طرف سے گیا تھا۔ اس نے یہ سن رکھا تھا کہ میں
، حاضر کے تقاضوں کے مطابق آزاد خیال انسان ہوں جب ہمارے نجی معاملے کی بات
ت ختم ہو گئی تو اس نے قومی وطنی اور موجودہ ترقی کی باتوں کا دروازہ کھول دیا۔ میں نے
ں کے سامنے اپنے ملک کے مسلمانوں کی خامیوں اور ان کی پسماندگی کا حال بیان کیا
انکہ ان کا مذہب ان کی موجودہ حالات کے برعکس ترقی کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔ اسے
توقع نہ تھی کہ میں ایسی باتیں کروں گا للہذا اس نے بھی میری طرح آزادی کے ساتھ
نگو کی اور ہمارے ملک کے مذہبی اور سیاسی تعصبات کا ذکر کرتا رہا۔ اثنائے گفتگو میں اس
نے یہ الفاظ بھی کہے:
"اسلام میں پہاڑوں سے بھی زیادہ بلند اور مستحکم خوبیاں ہیں مگر تم لوگوں نے انہیں
مین میں ایسا گہرا دفن کر دیا ہے کہ وہ اب نظر نہیں آتیں۔ مگر ہمارے پاس اگر خدائی
بت جیسا کوئی معمولی لفظ بھی ہے تو ہم اسے بڑھا چڑھا کر مسیحی فضائل کے گن گاتے
رتے ہیں اور تمام دنیا میں اس کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں۔"

نیک کام کی غرض وغایت:

فلسفیوں کا ذکر آنے پر ایک شبہ کا ذکر کروں گا جو ان کے بعض مقلدین مذہب ہدایت کے مطابق نیک کام کرنے پر ظاہر کرتے ہیں۔ وہ زبان سے تو اس شبہ کا اظہار کر ہیں مگر اس کی اصل خرابی کو سمجھ نہیں سکتے۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ انسانیت کا کمال یہ کہ انسان محض نیکی کی وجہ سے نیک کام کرلے وہ کسی غرض یا طمع پر مبنی نہ ہو۔ وہ یہ خ کرتے ہیں کہ یہ بڑی کوتاہی ہے کہ نیک کام خدا کی رضا مندی یا آخرت کے ثواب موقع پر یا عذاب کے خوف سے کیا جائے۔ یہاں تک کہ میں نے ایک مقالہ نگار کا مذ پڑھا، جو اسلام کا حامی اور طرفدار مشہور تھا اس میں بھی اس نے یہی فلسفہ بگھارا تھا۔ ان لوگوں کا مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی انسان نیک کام دین کی ہدایت کے مطابق اور اپنے کیہ نفس اور روحانی ترقی کے لیے اس طرح انجام دے کہ اعلیٰ کمال کے مالک پروردگار کی رضا مندی حاصل کرے اور اس کے قریب معزز مقام پر پہنچ جائے تو اس قسم کا کام عیب اور نقص میں داخل ہوگا۔ ان کے خیال میں کامل انسان وہی ہے جو اپنی فطرت سے دور کر دوسروں کو نفع پہنچائے اور اپنا تزکیہ نفس بھی نہ کرے اور نہ خدا کی رضا مندی حاص کرے یعنی اپنے ذاتی فائدہ اور بھلائی کے لیے کوئی کام نہ کرے۔ ایسی صورت میں حماقت اور عبث کوشش ہوگی جو عقلمندوں کا شیوہ نہیں ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ ان کا مقصد یہ ہے کہ نیک کام بغیر کسی لالچ کے عام وخا لوگوں کے فائدہ کے لیے کیا جائے۔ اس کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں کہ مذہب بھی ا بات کا قائل ہے اور خدا بھی ایسی نیکی سے خوش ہوتا ہے اور اسے اس کا ثواب ملتا ہے مگر تمہاری شرط یہ ہے کہ نیک کام اس وقت صحیح سمجھا جائے گا جب کہ اس کا کرنے والا خد منکر ہو، نہ تو وہ اس کی رضا مندی کا طلبگار ہو اور نہ ثواب کا خواہاں ہو۔ وہ لوگوں کو فا پہنچائے اور خود اسے کوئی فائدہ نہ پہنچے۔ ایسی بات کھلی بیوقوفی اور حماقت ہے، حکمت ا فلسفے کے ساتھ اس کا دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ تمام ضروری اور غیر ضروری صدقات وہ نیک کام ہے ج میں ایک مومن غیروں کو اپنی ذات اور اہل وعیال پر ترجیح دیتا ہے۔ بلکہ خدا تعالیٰ مفلسی اور تنگی کی حالت میں اس قسم کے ایثار کی بہت تعریف کی ہے۔ چنانچہ قرآن کر

رسول اکرم ﷺ کے انصار صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں یہ الفاظ آئے ہیں۔

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ (۵۹:۹)

اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ انہیں کتنی تنگی ہو)

خدا نے ہر کام میں ریاکاری کی مذمت کی ہے جو دنیاوی فائدہ کا دوسرا نام ہے۔ مگر غیر مسلم عام طور پر کوئی نیک کام ریاکاری اور شہرت کے لیے کرتا ہے کیا تم اس کو نیک کام کہو گے ؟ تمہارے نزدیک نیکی اپنے دائرے سے اس وقت نکل جاتی ہے، وہ اتنی بلند ہو جائے کہ اس سے خدائے بزرگ و برتر کی قربت حاصل ہو سکے ؟ مگر اس اور کمال سے بڑھ کر کونسی چیز ہے جس کے ذریعے خدا تعالیٰ کا قرب حاصل ہو ؟

بہر حال اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ مذہب کے تینوں ارکان کا ثبوت تمام قدیم اقوام ملتا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تمام مذاہب کی بنیاد ایک ہے وہ بنیاد خدائی وحی اور بروں کی ہدایت کی بنیاد ہے۔ مگر صنم پرستی کی تعلیمات اور بدعات سے ان مذاہب میں تہ رفتہ خرابی پیدا ہوتی گئی اس لیے حضرت محمد امی رسول خدا کے پاس سے یہ قرآن کریم لے کر آئے جس نے اس خرابی کو دور کیا جس کی وجہ سے یہ مذاہب انسانی فلاح و بہبود کے قابل بن گئے تھے، ان میں ایمان کے ساتھ شرک کی آمیزش ہو گئی تھی اور خالق کو مخلوق کے مشابہ کر دیا گیا تھا اور تمام عبادات کھیل کود کی طرح رسم ورواج بن گئی تھیں ان سے نہ تزکیہ نفس ہوتا تھا نہ وہ عبادات عقل کی ترازو میں بھاری نکلتی تھیں مگر اسلام کی تمام بادات وآداب معقول ہیں ان کے ذریعے انسانی فطرت کی تکمیل ہوتی ہے۔

قرآن کریم کا دوسرا مقصد
نبوت اور پیغمبروں کے فرائض

عرب وحی ورسالت کے منکر تھے صرف چند افراد حجاز وغیرہ میں دین حنفی پر قائم تھے، ان کے علاوہ وہ عرب بھی اس کے قائل تھے جو یہودی یا عیسائی ہو گئے تھے کیونکہ وہ ان کے قریب رہتے تھے۔

مشرکین عرب وحی کے بارے میں اس وجہ سے شک وشبہ میں مبتلا تھے کہ ان کے
ذہن میں یہ تصور نہیں آسکتا تھا کہ خدا تمام انسانوں کے مقابلے میں بعض انسانوں
پیغمبری کی فضیلت سے سرفراز کر سکتا ہے۔ جب کہ ان کے خیال میں تمام انسان بشر
صفات میں برابر ہیں۔

یہودیوں کے خیالات بھی عرب مشرکوں کے قریب تھے۔ وہ بھی یہ نہیں مانتے
کہ خدا نبوت کے لیے جس بندے کو چاہتا ہے منتخب کر سکتا ہے مگر انہوں نے خدا کے
یہ ضروری قرار دیا ہے کہ وہ نبوت کو صرف اسرائیل کی قوم کے لیے مخصوص کرے
باقی انسان اس رحمت وفضل کے مستحق نہیں تھے جو خدا نے اپنی پیغمبری کی صورت
یہودیوں کو عطاء فرمائی تھی۔

اس کے علاوہ یہ لوگ انبیاء کو خدا کے مقابلے میں جھوٹ، دھوکے اور فریب
آلودہ گردانتے تھے اور کہتے تھے کہ خدا نے ان سے کشتی لڑی تھی۔ وہ ان پر گناہ کبیرہ کا
الزام لگاتے تھے جیسا کہ مقصد اوّل میں بیان کیا گیا ہے۔

یہودیوں کے علاوہ عیسائی بھی اس کے قائل ہیں کہ نبوت ان میں محدود ہے۔
انھوں نے پیغمبروں کے علاوہ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں اور دوسرے بزرگ
اور پوپ وغیرہ کو معصوم قرار دیا ہے اور وہ ان کی پرستش بھی کرتے ہیں حالانکہ ان کا
متضاد بیان بھی ہے کہ بعض مخصوص حواریوں تک نے مصیبت کے وقت حضرت
علیہ السلام کو ماننے سے انکار کر دیا تھا اور بعض حواریوں نے انہیں دشمن کے سپرد
کر دیا تھا اور ان میں سے جو ان کا سب سے بڑا سرغنہ تھا اس نے ان پر لعنت بھیج کر ا
شیطان بھی کہا تھا۔ خود حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے یہ کہہ دیا تھا۔
سب آج رات مجھ سے منکر ہو جاؤ گے۔"

یہودیوں اور عیسائیوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے مذہبی علماء، پیشواؤں اور راہبوں
پروردگار بنالیا تھا اور انہیں مذہبی قوانین، عبادت کے طریقے اور حلال وحرام مقرر کر
حق دیا تھا (دیکھو اس کی تفصیل صفحہ ۲۶۳ تفسیر المنار جلد ۱۰) حالانکہ یہ سب کچھ اللہ
کفر، اس کے انصاف اور اس کے وسیع رحم وفضل سے انکار ہے۔ اس سے نوع انسانی
فساد بھی پیدا ہوتا ہے اور ایک بہت بڑی اکثریت معدودے چند افراد کی غلام بن جاتی ہے۔

اس لیے خداوند تعالیٰ نے اپنے خاتم النبیین رسول اکرم ﷺ پر اپنی کتاب نازل فرما کر ان تمام خرابیوں کا سد باب کیا۔

ا۔ ہر قوم میں پیغمبر کی بعثت:

خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَ مِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَیْهِ الضَّلٰلَةُ (۱۶:۳۶)

(ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور شیطانی طاقتوں سے بچو ان میں سے کچھ لوگوں کو اللہ نے ہدایت بخشی اور بعض گمراہی کا شکار ہو گئے۔)

(۲) اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ (۳۵:۲۴)

((اے پیغمبر) ہم نے آپ کو بشارت دینے والا اور ڈرانے والا حق کے ساتھ بنا کر بھیجا کوئی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی ڈرانے والا نہ گذر چکا ہو۔)

خدا نے انسان کی اس طرح عزت افزائی کی کہ اس نے شرعی قوانین وضع کرنے کا حق صرف اپنے لیے مخصوص رکھا۔ نبی اور رسول اس کے صرف پیغام بر ہیں، قوموں کے حاکم نہیں ہیں۔ اور ان کی اطاعت خدا کی اطاعت کے تابع ہے۔ اس طرح خدا نے پیغمبروں کی ربوبیت کا خاتمہ کر دیا اور ان کی پرستش کے ساتھ ساتھ دوسرے اولیاء کی پرستش کو بھی باطل قرار دیا۔ اس طرح (قرآن کریم کی بدولت) انسان روحانی اور ذہنی غلامی سے آزاد ہو گیا جس میں مہذب قومیں بالخصوص بدھ مت کے ماننے والے اور عیسائی مبتلا ہو چکے تھے۔

چونکہ اس سلسلے میں بھی تمام قومیں اور ملتیں گمراہ ہو چکی تھیں اس لیے ان ہدایات کو بھی بار بار بہت سی سورتوں میں اس تصریح کے ساتھ دوہرایا گیا ہے کہ پیغمبر بھی سب انسانوں کی طرح بشر ہیں صرف اتنا فرق ہے کہ ان پر وحی نازل ہوئی ہے۔ ان کا کام صرف اس قدر ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے دین کا پیغام انسانوں تک پہنچاتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے خاتم النبیین اور دین کی تکمیل کرنے والے پیغمبر اعظم سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے۔

قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یُوْحٰۤى اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (۱۸:۱۱۰)

(اے پیغمبر کہہ دیجئے کہ میں بھی تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہوں (البتہ) مجھ پر وحی آتی ہے کہ تمہارا ایک ہی خدا ہے۔)

اسی طرح سورۃ کے وسط میں ارشاد فرمایا ہے۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ

(ہم بشارت دینے والے اور ڈرانے والے رسول بھی بھیجتے ہیں۔)

سورہ انعام میں بھی اسی مضمون کی آیت ہے(۶ : ۴۸) دیگر مقامات پر بھی اسی مضمون کی کئی آیات ہیں جن کا یہ مطلب ہے کہ خدا نے انہیں اس لیے بھیجا ہے کہ وہ قول اور عمل سے بشارت دیں اور ڈرائیں۔ انہیں کائنات کو نفع اور نقصان پہنچانے کا اختیار نہیں دیا گیا ہے اور نہ وہ خدا کے ارادے پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ اس کی تشریح ہم نے ذیل کی آیات میں بخوبی کر دی ہے۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْۗءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۷ : ۱۸۸)

(اے پیغمبر کہہ دیجئے کہ میں اپنی ذات کے لئے بھی نفع نقصان کی قدرت نہیں رکھتا ہوں بجز اس کے جو خدا چاہے۔ اگر میں غیب جانتا تو بہت سا نفع حاصل کر لیتا اور مجھے نقصان نہیں پہنچتا۔ میں اس کے سوا کچھ نہیں ہوں کہ ایمان لانے والے کو ڈرانے اور بشارت دینے والا ہوں۔)

اس کے علاوہ خود نبی کریم ﷺ نے اپنے اقوال واعمال، اخلاق اور تواضع کے ذریعے اس معاملے کو اس قدر واضح کر دیا ہے کہ ان آیات کی تاویل کے لیے کوئی اور راستہ باقی نہیں رہتا۔ اس نکتہ کو ایک مغربی عالم نے سمجھ لیا تھا اس لیے اس نے کہا: محمد (ﷺ) نے جب یہ مشاہدہ کیا کہ عیسائی اپنے نبی کو خدا بنا کر اور اس کی عبادت کر کے رسوا ہوئے تو انہوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ اپنا لقب رسول اللہ قرار دیں بلکہ آپ ﷺ نے انہیں یہ بھی حکم دیا کہ وہ کہیں اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ (میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد اس کے بندے اور رسول ہیں)

۲۔ عیسائیوں کی مذہبی تبدیلیاں :

عیسائیوں کا معاملہ عجیب ہے ان کے مذہب پر یورپ کی صنم پرستی غالب آ گئی تھی اس کی وجہ سے ان میں کمزوری اور انتشار تھا جو ایک جامع نظام اور قوت حاکم نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا، اس لیے شاہ قسطنطین نے ایسا نظام قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ اس نے ان کو دین توحید سے ہٹا لیا جس پر حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور دوسرے پیغمبر علیہم السلام عمل پیرا تھے اور اپنی بت پرست قوم کے مندروں کی طرح اس نے ان کے لیے گرجوں اور رومن مذہب کی قیادت کی بنیاد ڈالی جو یہودیوں اور سامیوں کے مخالف تھی۔ اس کے بعد یونان اور روم میں ان کے مذہبی علماء اور بشپ نے اسے عقائد، عبادات، مذہبی قوانین اور مذہبی رسوم وضع کیے جن میں سے کسی کی بنیاد تورات کے ان قوانین پر نہیں تھی جو موسوی قوانین کہلاتے ہیں۔ حالانکہ حضرت مسیح علیہ السلام نے یہ صحیح فرمایا تھا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے قوانین کو توڑنے نہیں آئے ہیں بلکہ اس کو پورا کرنے کے لیے آئے ہیں۔ مگر ان مغربی انسانوں نے ان قوانین کو توڑ کر ایسے مخالفانہ قوانین تیار کیے جن میں حضرت مسیح علیہ السلام کے زہد و تقویٰ، زرپرستی، شہوت پرستی، ریاکاری، جاہ پرستی، ظلم و سرکشی سے نفرت کا کوئی عنصر شامل نہ تھا۔ انہوں نے ہر چیز میں اپنی یہودی رعایا کی مخالفت کی۔

جب رسول کریم خاتم النبیین ﷺ معبوث ہوئے جن کی حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے پیغمبروں علیہم السلام نے بشارت دی تھی تو آپ ﷺ نے آکر فریقین یعنی یہود و نصاریٰ کے مذہبی اختلافات کو واضح کیا اس پر یہ فریقین آپ ﷺ کی اتباع کرنے لگے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آپ ﷺ نے ان کے پیغمبروں کی تجدید کی تھی مگر ان کی قوم (یہ مقبولیت دیکھ کر) آپ ﷺ سے دشمنی رکھنے لگی اور جنگ کے لیے آمادہ ہو گئی جیسا کہ پہلے اس کا حال گذر چکا ہے۔ تاہم آگے چل کر آپ ﷺ کے نور سے استفادہ کر کے انہوں نے اپنے مذہب کی اصلاح کی جس کے نتیجے میں خانہ جنگی برپا ہوئی۔ یہاں تک کہ ان مذہبی اصلاحات کی بدولت یورپ دو مساوی طاقتوں میں منقسم ہو گیا جس کی تفصیل دنیا میں مشہور ہے۔

پھر واقعات نے یہ رخ پلٹا کہ یہ اصلاحی فرقہ پروٹسٹنٹ بتدریج کیتھولک اور قدیم

عیسائی فرقوں کی مخالفت کرتا رہا۔ اس طرح دین میں آزادی کے ساتھ بحث جاری رہی۔ یہاں تک کہ اس کے کروڑوں پیرووں کا عہد قدیم اور عہد جدید کی کتابوں پر ایمان متزلزل ہوگیا۔ اس کے بعد انہوں نے بہت مناظروں اور کانفرنسوں کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا ماننے کے عقیدے سے انکار کر دیا۔

حال ہی میں یہ واقعات رونما ہوئے ہیں کہ جرمنی کے عوام نے کھلم کھلا یہ مطالبہ کیا کہ قوم کے مذہب کی بنیاد آرین نسل کے قواعد پر ہونی چاہیے اور سامی نسل کے مذاہب اور بنو اسرائیل کے پیغمبروں کے قوانین کا بالکل خاتمہ ہونا چاہیے اس پر پاپائے اعظم نے اس کی مخالفت کی۔ اس نے صاف طور پر یہ بیان کیا کہ یہ لوگ قدیم صنم پرستی کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ لہٰذا تازہ ترین واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عیسائی مذہب کو کمیونسٹ مشرقی یورپ اور روسی ایشیائی مقبوضات میں مٹا رہے ہیں اس کے علاوہ وہ تمام دوسرے مذاہب کو بھی ختم کرنے کے لیے پروپیگنڈہ کر رہے ہیں، اس کے بعد جرمن نازیوں نے وسط یورپ میں اسے ختم کرنے کی کوشش کی لہٰذا عیسائیت ایسا مذہب نہیں ہے جو ان نئے فتنوں کی آندھیوں میں ٹھیر سکے۔ ان طوفانوں کا مقابلہ صرف مذہب اسلام کر سکتا ہے۔ لہٰذا یورپ اور تمام دنیا کو الحاد اور دہریت کے انتشار سے صرف اسلام ہی بچا سکتا ہے۔

۳۔ مسئلہ شفاعت:

مسئلہ شفاعت کے بارے میں مشرکین عرب کا یہ خیال تھا کہ دنیا میں ان کے معبود خدا کے ہاں سفارش کرتے ہیں۔ اہل کتاب اس بات کے قائل تھے کہ دنیا اور آخرت دونوں میں ان کے پیغمبر اور مذہبی پیشوا سفارش کرتے ہیں، لیکن قرآن کریم نے ان خیالات کی تردید کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ شفاعت کا معاملہ بالکل خدا کے ہاتھ میں ہے اور اس کی اجازت کے بغیر کوئی اس کے سامنے سفارش کرنے کی جرائت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا ہے۔

يَعۡلَمُ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ وَلَا يَشۡفَعُوۡنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارۡتَضٰى وَهُمۡ مِّنۡ خَشۡيَتِهٖ مُشۡفِقُوۡنَ ﴿۲۸﴾ وَمَنۡ يَّقُلۡ مِنۡهُمۡ اِنِّىۡۤ اِلٰـهٌ مِّنۡ دُوۡنِهٖ فَذٰلِكَ نَجۡزِيۡهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجۡزِى الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۲۹﴾

(۲۹:۲۱)

(خدا ان کے آگے پیچھے سب کا علم رکھتا ہے وہ نہیں سفارش کریں گے مگر جس کے لیے وہ راضی ہو۔ وہ اس کے رعب سے ڈراتے ہوں گے اور جو کوئی ان میں سے یہ کہے کہ خدا کے علاوہ وہ معبود ہے تو ہم اسے جہنم کی سزا دیں گے ظالموں کو ہم اس طرح سزا دیتے ہیں۔)

اس کی تفسیر ہم سورہ بقرہ وغیرہ کے تفسیر میں بارہا بیان کر چکے ہیں اور اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ احادیث کی رو سے جو شفاعت ثابت ہے وہ بت پرستوں اور عیسائیوں کی اس شفاعت سے مختلف ہے جس کی قرآن کریم میں تردید کی گئی ہے۔ اس مسئلہ کو بیس سے زیادہ مکی اور مدنی سورتوں کی آیات میں بیان کیا گیا ہے۔

اب تم غور کر سکتے ہو کہ قرآن کریم نے اس مسئلہ کی اصل حقیقت بیان کر دی ہے حالانکہ اس معاملہ میں کروڑوں انسان گمراہ ہو چکے ہیں۔ انہوں نے خدا کے ساتھ ایسی چیزوں کو شریک کیا جو انہیں نفع اور نقصان نہیں پہنچا سکتی ہیں۔ کیا یہ ہدایت حضرت محمد ﷺ نے اہل کتاب کے عالموں سے حاصل کی تھی؟ مگر تعجب یہ ہے کہ انہوں نے آپ ﷺ کو ہدایت بخشی اور اپنی قوم کے ساتھ اس معاملے میں بخل سے کام لیا۔ اگر یہ نہیں ہے تو کیا یہ آپ ﷺ کے ذہن کی پیداوار تھی؟ تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ان اہل کتاب کے دعوے کے بموجب آپ ﷺ کا ذہن وحی الٰہی سے اعلیٰ تھا۔ نہیں ہرگز نہیں، بلکہ یہ سراسر وحی الٰہی ہے۔

۴۔ تمام پیغمبروں پر ایمان:

قرآن کریم نے پیغمبروں اور رسولوں کے مسائل کے سلسلے میں جو نمایاں اصول بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ تمام پیغمبروں پر ایمان لانا فرض ہے اور یہ فرق نہ کیا جائے کہ بعض پیغمبروں پر ایمان لایا جائے اور بعض کی رسالت سے انکار کیا جائے۔ اس طرح کی تفرقہ اندازی تمام پیغمبروں کی رسالت سے انکار کے برابر ہے۔ کیونکہ وہ سب خدا کی طرف سے بھیجے گئے تھے اور سب کا ایک ہی فریضہ ہے۔ یعنی لوگوں کو ہدایت کرنا اور خدا کا پیغام اور اس کی شریعت ان تک پہنچانا۔ چنانچہ خداوند تعالیٰ سورۂ بقرہ کے آخر میں ارشاد فرماتا ہے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (۲:۲۸۵)

(جو کچھ اس کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے، رسول اور مومنین اس پر ایمان لائے ہیں۔ ہر ایک اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا ہے (وہ کہتے ہیں) ہم اس کے رسولوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے۔)

سورۃ النساء میں واضح طور پر فرمایا ہے کہ ان رسولوں پر ایمان کے بارے میں فرق کرنا حقیقی کفر ہے اور کسی تفریق کے بغیر سب پر ایمان لانا حقیقی ایمان ہے۔ (پ ۴: ۱۵: ۵۲)

اس کی بنیاد اس ایمان پر ہے کہ خدا کا مذہب، جسے لے کر تمام پیغمبر آئے، انسانی ہدایت و اصلاح اور سعادت کے بنیادی مقاصد و اصول کے لحاظ سے ایک ہی ہے۔ البتہ زمان و مکان کے اختلاف اور قوموں کی استعداد و صلاحیت کے فرق کا لحاظ کرتے ہوئے عبادات و قوانین کی صورتیں اور شکلیں بدلتی رہیں۔ یہاں تک کہ خدا نے ایک عالمگیر رسول کو ایسے اصول دے کر مبعوث فرمایا جو ہر زمانے اور ہر مقام سے مطابقت رکھتے تھے اور بدلتے ہوئے حالات کے لحاظ سے اجتہاد کی اجازت بھی تھی۔

ایسی صورت میں بعض پیغمبروں پر ایمان لانا اور بعض سے انکار کرنا خواہش کی پیروی اور دین کی حقیقت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ اس لئے اس کا اعتبار نہیں ہوگا کیونکہ یہ سراسر کفر ہے۔

اس منصفانہ حقیقت کو تسلیم کرنے میں مسلمان منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ نہ تو بت پرست قوموں مثلاً مجوسیوں اور ہندوؤں کی یہ حیثیت ہے اور نہ اہل کتاب ہی اس قسم کے ہیں۔ کیونکہ وہ صرف اپنے باپ، دادا اور اسرائیلی پیغمبروں ہی کو مانتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ اپنے ان پیغمبروں کو بھی اپنی کتابوں میں طرح طرح کے عیوب اور خواہش سے متہم کرتے ہیں۔ (جیسا کہ صفحہ ۵۴۴ میں مذکور ہے۔)

لیکن مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ رب العالمین نے تمام قوموں میں ہدایت یافتہ اور ہدایت کرنے والے پیغمبر بھیجے ہیں۔ چنانچہ وہ تمام پیغمبروں پر اجمالاً اور قرآن کریم نے جن کا حال بیان کیا ہے، ان پر تفصیلی ایمان رکھتے ہیں۔ در حقیقت یہ اسلام ہی ہے جس نے اس عقیدے کے ذریعے نوع انسانی کو معزز بنایا اور اس طرح عالمگیر محبت اور انسانی برادری کے لئے راہ ہموار کی جسے ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ لہٰذا مسلمان ہی تمام پیغمبروں کا دنیا اور آخرت میں سچا دوست ہے اور اس کے مقابلے میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ غیر مسلم اللہ کا

دشمن ہے اور ان تمام پیغمبروں کا دشمن ہے، کیونکہ بعض پیغمبروں کو جھٹلانے سے عام منصب رسالت اور خود بھیجنے والے خدا کی تکذیب ہوتی ہے۔

یہ بھی امت محمدیہ کی امتیازی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت ہے جس کی وجہ سے یہ قوم دیگر اقوام سے ممتاز اور برتر ہے اور اس کی بدولت تمام اقوام کی قیادت وامامت کی مستحق ٹھہرتی ہے۔ اسی وجہ سے خدا فرماتا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا

(۱۴۳:۲)

(اسی طرح ہم نے تمہیں درمیانی قوم بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور رسول خدا تم پر گواہ ہیں۔)

لہٰذا یہ مسلم قوم درمیانی درجہ میں ہے اور تمام رسولوں پر ایمان لانے اور دین کے تینوں ارکان کے سلسلے میں اعتدال پسند ہے (جیسا کہ ہم نے مقصد اول میں بیان کیا ہے) دیگر فضائل اور اعمال میں بھی اس کی یہی حالت ہے۔

یہ قوم دوسرے لوگوں پر شہادت اس صورت میں دے گی کہ اسے اس بات کا ذمیدار ٹھہرایا گیا ہے کہ وہ پیغمبروں کے اس دین کامل کی، جو اس نے خاتم النبیین محمد (ﷺ) سے حاصل کیا ہے، تمام قوموں کو دعوت دے۔ یہ سلسلہ آپ کے بعد چلتا رہے گا۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ یوم آخرت میں اس کے شاہد ہوں گے جس طرح ہر رسول اپنے زمانے کی قوم کا شاہد ہوگا، جیسا کہ خداوند تعالیٰ خود فرماتا ہے:

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا (۴۱:۴)

(پھر کیسے ہوگا جب ہم ہر قوم سے ایک گواہ لیں گے اور تمہیں ان سب کا گواہ بنائیں گے۔)

قرآن کریم کی صاف عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض پیغمبر اور رسول بعض سے افضل ہیں۔ خدا نے بعض کو مخصوص فرمایا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہر پیغمبر کی ہدایت واصلاح کے کام مختلف ہیں۔ جیسا کہ خدا ارشاد فرماتا ہے:

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (۲۵۳:۲)

(یہ وہ رسول ہیں جن میں سے بعض کو بعض پر ہم نے فضیلت دی ہے۔ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا اور بعض کے درجات بلند کئے۔ ہم نے مریم کے بیٹے حضرت عیسیٰ کو کھلی نشانیاں

دیں اور روح القدس سے ان کی تائید کی۔)

اور پھر عقلی اور نقلی دلائل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ ہیں جن کے ذریعے اللہ نے اپنا دین مکمل کیا اور آپ ﷺ کو تمام دنیا کے لئے رحمت بنا کر بھیجا۔ لہٰذا آپ ﷺ ہی کی ایسی شخصیت ہے جس کا درجہ سب پیغمبروں پر بلند ہے۔ جیسا کہ ہم نے اس آیت کی تفسیر میں اجمالی طور پر بیان کیا ہے اور اس کتاب میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ اپنے پیروؤں سے فرماتے ہیں۔ "پیغمبروں کو ایک دوسرے پر فضیلت نہ دیا کرو۔" یہ اس موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا تھا جب کہ آپ ﷺ نے ایک مسلمان کی اس حرکت کو ناپسند فرمایا تھا کہ اس نے ایک یہودی کو اس بات پر طمانچہ مارا تھا کہ اس نے کہا تھا "نہیں قسم اس خدا کی جس نے موسیٰ کو تمام انسانوں پر فضیلت دی۔" اس نے آپ ﷺ کے پاس آکر شکایت کی تو آپ ﷺ اس کے مسلمان ساتھی پر بہت ناراض ہوئے اور یہ بات ارشاد فرما کر آخرت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خوبیاں بیان کیں۔ آخر میں آپ ﷺ نے فرمایا "میں یہ بھی نہیں کہتا کہ یونس علیہ السلام بن متی سے کوئی افضل ہے۔" اس روایت کو امام بخاری اور مسلم دونوں نے روایت کیا ہے۔ بخاری کی دوسری روایات میں ہے۔ "مجھے (حضرت) موسیٰ علیہ السلام پر ترجیح نہ دو۔" ایک اور روایت میں ہے۔ "پیغمبروں کو ایک دوسرے پر ترجیح نہ دو۔" ان ارشادات سے آپ ﷺ کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو پیغمبروں کی برائی سے روکا جائے اور ان کی وجہ سے وہ ایک دوسرے پر زیادتی نہ کریں اور نہ خود وہ آپ ﷺ کی ذات مبارک کے بارے میں مبالغہ سے کام لیں۔ ورنہ آپ ﷺ نے ایک موقع پر مسلمانوں کو اہل کتاب سے کوئی بات دریافت کرنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ "خدا کی قسم! اگر (حضرت) موسیٰ علیہ السلام تمہارے سامنے زندہ ہوتے تو ان کے لئے سوا اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ میری پیروی کرتے۔" (ابو یعلی حدیث جابر)۔

تمام پیغمبر ایسے ہیں جیسے کسی ملک میں کئی صوبوں کے حاکم ہوں یا مختلف کیمپوں اور مقامات پر مختلف چھاؤنیوں میں کمانڈر ہوں۔ مگر رسول کریم خاتم النبیین ﷺ کی مثال، جو عالمگیر رسالت لے کر آئے ایک ایسے جرنیل اور حاکم اعلیٰ کی ہے جس کے پاس تمام

سیاست و قیادت کی باگ ڈور ہو۔ پیغمبروں نے آپ ﷺ کی نبوت کی جو بشارت دی تھی اور خدا نے روز ازل میں ان سے آپ ﷺ پر ایمان لانے اور آپ ﷺ کی امداد و اتباع کے لئے یہ ضروری عہد و پیمان لیا تھا۔ اس کا مقصد بھی یہی تھا جیسا کہ قرآن کریم میں وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ (۳:۸۱) والی آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو تفسیر المنار۔ صفحہ ۳۴۹ ج ۳)

پیغمبروں کے معجزات اور کرامات :

ہم نے فصل دوم میں ان پیغمبروں کی نشانیوں کو بیان کیا ہے جنہیں عیسائی عجائب کے نام سے پکارتے ہیں اور ہمارے علمائے کرام معجزات کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور اسے "خوارق عادات" (غیر معمولی اشیاء) کی ایک قسم میں شمار کرتے ہیں۔ اس مقام پر ہم نے دیگر پیغمبروں کے معجزات کا خاتم النبیین ﷺ کے عقلی اور دائمی معجزہ یعنی قرآن کریم سے مقابلہ کیا تھا اور ہر ایک کے ایمانی اثرات بیان کئے تھے۔ یہاں ہم ان معجزات اور اس کے مشابہ کرامات اور دوسری خوارق عادت چیزوں کے بارے میں دوسرے نقطہ نگاہ سے وضاحت کریں گے اور بتائیں گے کہ اس سلسلے میں اسلام نے انسانی گمراہیوں کی کس حد تک اصلاح کی اور انہیں ایمان کے اعلیٰ مدارج تک پہنچایا۔ تاکہ وہ نوع انسانی کی عقلی ہدایت کے قابل بن سکیں اور قانون قدرت کا وہ وسیع علم حاصل کر سکیں جو انہیں حضرت محمد خاتم النبیین ﷺ کی نبوت کی بدولت حاصل ہو سکتا ہے۔

معجزات کی قسمیں :

خدا کی نشانیوں کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) ایسی نشانیاں جو خدا کے عالمگیر نظام فطرت کے مقررہ قوانین کے مطابق ہیں۔ ایسی نشانیاں سب سے زیادہ ہیں اور خدا کے کمال قدرت، ارادہ، علم و حکمت، وسیع فضل اور رحمت خداوندی کے سب سے زیادہ واضح دلائل پیش کرتی ہیں۔

(۲) وہ معجزات جو نظام قدرت کے مقررہ قاعدوں کے خلاف ہیں، ایسے معجزات بہت کم ہیں اور شاید اکثر لوگ انہی کو دیکھ کر یقین کرتے ہیں کہ خدا کو ان موجودہ اور آئندہ مخلوقات پر پورا اختیار حاصل ہے اور اس کی قدرت و مشیت اس موجودہ نظام

کائنات کے ماتحت نہیں ہے۔تاہم یہ قوانین فطرت اس کی حکمت اور کمال تخلیق کا مظہر ہیں، مگر کبھی کبھی وہ اپنی کسی حکمت اور مصلحت کی بناء پر خلاف معمول اور خلاف فطرت چیزیں بھی نمودار کر دیتا ہے۔اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ کائنات بھی مشینوں کی طرح ہو جاتی جو نہایت دقیق نظام کے مطابق چلتی ہے، جن کے پاس نہ کوئی علم ہے نہ ارادہ ہے اور نہ کوئی اختیار ہے جیسے کہ چھوٹی چھوٹی گھڑیاں جن کے ذریعے شب و روز کے اوقات معلوم ہوتے ہیں یا جیسے جہازوں اور کارخانوں کی بڑی بڑی مشینیں۔

مادہ پرست، منکرین خدا اور فلسفی خدائے خالق کو کائنات کی "علت فاعلہ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور اس نظام کو "میکانی نظریہ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ خلاف معمول واقعات کے لئے مختلف علل و اسباب نکالنے کی کوشش کرتے ہیں اور جس کا سبب معلوم نہ ہو سکے اسے خلاف فطرت قرار دیتے ہیں۔ بلکہ جس کا سبب انہیں نہیں معلوم ہوتا ہے اسے مشابہ اسباب کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، خواہ اس کی کوئی واضح دلیل نہ مل سکے۔ وہ کہتے ہیں اگر آج ہمیں اس کا سبب معلوم نہیں ہو سکا ہے تو کل ہمیں یا مستقبل کے لوگوں کو اس کا سبب معلوم ہو جائے گا۔ بلکہ تمام علمی نظریوں میں ان کا یہی طریقہ ہے۔کیونکہ ان لوگوں کے پاس کسی چیز کا کوئی قطعی اور یقینی علم نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے تمام مسائل "نظریات" کی حد تک محدود ہیں۔ یعنی ان میں بحث و تمحیص اور تحقیق کی گنجائش ہے۔(سائنس کے اکثر مسلمہ نظریات کی بھی آج کل کے بعض سائنس دان تردید کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ایک مشہور پروفیسر شبنجلر نے "فلسفہ قضاء و قدر کے اسرار" کے بارے میں ایک کتاب تحریر کی ہے جس میں اس نے علوم و فنون کے تمام مسلمہ نظریات و قوانین کی تردید کی ہے اور کائنات کے جملہ تغیرات کو قضاء و قدر کی طرف منسوب کیا ہے۔)

ظاہر و باطنی عالم کے اسباب:

ہم مسلمان عالم غیب اور اس کے فرشتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔فرشتے خدا کی سب سے بڑی قوم (مخلوق) ہے جو خدا کے حکم سے مادی دنیا کے نظم و نسق پر اثر انداز ہیں۔

ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ عالم غیب میں خدا کے قوانین ان قوانین سے مختلف ہیں جو مادی دنیا کے لئے مخصوص ہیں۔ تاہم انسان وہ درمیانی کڑی ہے جو دونوں عالموں کے لئے حلقۂ اتصال کا کام دیتا ہے۔ کیونکہ اس کا جسم اور اس سے متعلقہ چیزیں مادی دنیا سے وابستہ ہیں۔ مگر اس کی روح کا عالم غیب سے تعلق ہے۔ جب تک انسان اپنے مادی جسم کے ساتھ زندہ رہتا ہے اس وقت تک اس کے تمام حواس اور قویٰ مادی دنیا میں مشغول رہ کر مادی قوانین کے تابع رہتے ہیں۔ بلکہ اس کی تمام ذاتی اور جنسی ضروریات کا تعلق بھی مادی دنیا سے برقرار رہتا ہے۔ اس طرح وہ روحانی دنیا سے بے تعلق رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی روح بھی جو اس کو زندگی بخشتی ہے اس عالم غیب سے الگ رہتی ہے۔ البتہ روح کو اپنے جسم پر غلبہ اور اقتدار آخرت کی زندگی میں نصیب ہوگا۔ لیکن جن لوگوں کو خداوند تعالیٰ اس نبوت اور رسالت کے لئے منتخب کرلیتا ہے تو وہ ان میں اپنے فضل و رحمت سے یہ صلاحیت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ اس کے فرشتوں سے تعلقات پیدا کر سکیں اور ان کے ذریعے خدائی علم حاصل کریں۔ ایسے منتخب بندوں پر خدا غیب کی باتیں جس قدر چاہتا ہے ظاہر کر دیتا ہے تاکہ وہ اس کے حکم کے مطابق اس کے بندوں میں اس کی تبلیغ کریں۔ ان پیغمبروں کے علاوہ دوسرے نیک بندوں اور روحانی مجاہدہ کرنے والوں کو بھی خدا بعض روحانی خصوصیات عطا فرماتا ہے۔

غیب کی قسمیں :

غیب وہ ہے جس کا علم انسانوں سے غائب ہو، اس کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) حقیقی غیب : .... اس کا علم خدا کے سوا اور کسی کو نہیں ہو سکتا۔

(۲) اضافی غیب : .... یہ وہ علم ہے جو فطری اور حاصل کردہ صلاحیتوں کے اختلاف کی بناء پر بعض لوگوں کو حاصل ہوتا ہے اور بعض لوگوں کو نہیں حاصل ہوتا۔ حقیقی غیب جو خدا اپنے بعض پیغمبروں پر ظاہر کرتا ہے اس میں انسانی کوشش اور ارادہ کا کوئی دخل نہیں ہے بلکہ یہ نبوت کا خداداد عطیہ ہے۔ (مزید تفصیل و تحقیق کے لئے ملاحظہ ہو صفحات نمبر ۴۲۱ و ۴۵۲ و ۴۶۹ جلد ۷ تفسیر المنار۔ اس کا خلاصہ تفسیر کی جلد ۹ صفحہ نمبر ۵۱۳ میں ہے)۔

پیغمبروں کے بعد ان کے دو خاص پیرو ہیں۔ جن کی آنکھوں پر سے بعض پردے اٹھا

دیئے جاتے ہیں اور وہ اس عالم غیب کی ایک جھلک دیکھ لیتے ہیں اور غیبی انوار میں سے کسی نور کا مشاہدہ بھی کر لیتے ہیں۔ اس طرح ان کا اپنے رسولوں پر ایمان، دلائل پرست لوگوں کے ایمان سے زیادہ قوی ہو جاتا ہے۔ تاہم اس سلسلے میں حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کا قول نقل کیا ہے کہ "اگر حجابات اٹھ جائیں اس وقت بھی میرے ایمان و یقین میں کوئی اضافہ نہ ہوگا۔" غالباً ان کا مقصد یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے اسلام کے لئے ان کا سینہ اس قدر کھول دیا ہے کہ اب وہ خدا کے نور سے لبریز ہو گیا ہے کہ اب وہ خود نفس مطمئنہ کے مقام پر پہنچ گئے ہیں۔

اس کے علاوہ بعض دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں بھی صحیح طور پر یہ بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے غیبی نور کو آنکھوں سے دیکھا اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کے علاوہ جو انسان کی صورت میں عموماً نمودار ہوا کرتے تھے، انہوں نے دوسرے فرشتوں کو بھی دیکھا تھا۔

ان لوگوں کے بعد وہ افراد ہیں جو اپنی فطرت سلیمہ رکھتے ہیں یا گوناگوں ریاضات اور روحانی علاج کرتے ہیں یا انہیں کوئی ایسی بیماری لاحق ہو جاتی ہے جو روحانی طاقتوں کو جسمانی خواہشوں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ یا بعض افراد ایسے مضبوط ارادے کے ہوتے ہیں جو کمزور ارادہ والوں کو اپنے تابع کر لیتے ہیں۔ اس طرح ان کی روحانی طاقتوں کو ان کی قوت احساس سے الگ کر کے ان سے حسب منشا کام لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو مختلف اسباب کی بناء پر بعض حالات میں ایسی روحانی طاقت حاصل ہو جاتی ہے جن کی بدولت وہ ایسی چیزیں یا ایسے اشخاص کو دیکھ لیتے ہیں جو ان کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ بلکہ ان کے دل و دماغ پر بعض واقعات قبل از وقت منعکس ہو جاتے ہیں۔ اس لئے وقت سے پہلے وہ اس کی خبر کر دیتے ہیں اور ان کی پیشین گوئی صحیح نکلتی ہے۔ جیسا کہ اس زمانے میں بھی ہوتا رہتا ہے۔ (آج کل مغرب و مشرق کے نجومی سیاسی اور اہم واقعات پر جو پیشین گوئیاں کرتے ہیں ان کی وجوہات بھی یہی ہیں۔ بعض سیاسی بصیرت اور وسیع معلومات کی بناء پر کچھ باتیں کہتے ہیں اور وہ صحیح نکلتی ہیں۔ بعض قیافہ شناسی، مسمریزم اور نفسیاتی علاج سے پیشین گوئیاں کرتے ہیں۔ مگر وہ کچھ صحیح نکلتی ہیں اور کچھ غلط ثابت ہوتی ہیں۔ ایسی چیزوں کا روحانی علم غیب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔)

حقیقی اور ظاہری خلاف معمول واقعات:

ایسے واقعات جو بظاہر عام قدرتی اسباب کے خلاف پیش آتے ہیں یا جانی بوجھی عادتوں کے خلاف واقع ہوتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی ہر زمانے میں سب قوموں کی طرف سے سلسلہ وار بیان ہوتے چلے آئے ہیں۔ مگر یہ خلاف معمول واقعات دراصل خلاف معمول نہیں ہوتے۔ ان میں سے کچھ ایسے واقعات ہوئے ہیں جن کا اصل سبب لوگوں کو نہیں معلوم ہو سکا۔ بعض کا تعلق مخصوص ہنر مندی اور چابکدستی سے ہوتا ہے جو مخصوص مشق و مہارت سے حاصل ہوتی ہے۔ بعض واقعات روحانی قوتوں کے زیر اثر رونما ہوتے ہیں۔ جن میں قوی ارادے والے انسان، کمزور ارادوں کے انسانوں پر اپنا اثر ڈالتے ہیں۔ انہی دونوں صورتوں میں بعض واقعات مکاشفہ اور مسمریزم کے زیر اثر رونما ہوتے ہیں۔ بعض واقعات بیماروں کی غیر معمولی شفایابی کے ہوتے ہیں بالخصوص ان لوگوں کے جو اعصابی بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ان میں اعتقاد اور وہم کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ انہی بیماریوں میں نابینائی اور فالج کی بعض قسمیں بھی شامل ہیں۔ کیونکہ بعض لوگ آنکھوں کے اعصاب کی بیماری کی وجہ سے اپنی بینائی کھو بیٹھتے ہیں۔ حالانکہ ان کی آنکھیں تندرست اور چمکدار ہوتی ہیں یا آنکھ کی پتلی پر عارضی طور پر سفیدی چھا جاتی ہے۔ حالانکہ پتلیاں اپنی جگہ ٹھیک ہوتی ہیں۔ ان امراض میں وہ مادر زاد اندھا پن شامل نہیں ہے، جن میں آنکھیں بالکل چلی جاتی ہیں۔ جیسے وہ اندھا جسے حضرت مسیح علیہ السلام نے خدا کے حکم سے اچھا کر دیا تھا۔

اسی میں وہ شعبدہ بازی بھی شامل ہے۔ جس میں خیال کے ذریعے آنکھوں کو فریب دیا جاتا ہے۔ ان کاموں میں شعبدہ باز بہت مہارت رکھتے ہیں۔ ان میں فرعون کے جادوگروں کے کام بھی شامل ہیں۔ جن کا قرآن کریم میں ذکر آیا ہے اور جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان کے جادو کے تخیل سے ان کی رسیاں اور لاٹھیاں ایسی معلوم ہو رہی تھیں جیسا کہ سانپ چل رہے ہوں۔ ایسی شعبدہ بازی میں کانوں کو بھی فریب دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ وہ لوگ کرتے ہیں جنہیں یہ دعویٰ ہے کہ جنات ان کے تابع ہیں۔ کیونکہ وہ رات کے وقت اپنی معمولی آواز کو بدل کر بولا کرتے ہیں تاکہ لوگوں میں یہ خیال پیدا ہو کہ یہ جنّ کی آواز ہے۔ کبھی وہ دن کے وقت اپنے ہونٹوں کو حرکت دیئے بغیر پیٹ میں سے

آواز نکالتے ہیں (اور اس طرح لوگوں کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ یہ جنّات کی آواز ہے) ایسے لوگوں کی کسی بات کا یقین نہیں کرنا چاہئے۔ ان لوگوں کی دروغ گوئی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان لوگوں نے ایسے کاموں کو ادنیٰ ترین معاش کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ اگر وہ سچے ہوتے تو بڑے بڑے بادشاہ، علماء اور سائنس دان بھی ان کی صحبت سے مستفید ہونے میں فخر محسوس کرتے۔

ہم نے خلاف معمول (خوارق عادات) واقعات کی ظاہری صورتیں سورۂ اعراف کی تفسیر میں سحر پر بحث کرتے ہوئے بیان کر دی ہیں۔ (ملاحظہ ہو صفحہ ۵۴۔۶۰ جلد ۹ تفسیر المنار) اور ان مضامین میں بھی پوری تفصیل موجود ہے جو المنار کی جلد دوم اور جلد ششم میں کرامات، ان کی قسموں اور ان کے اسباب کی بحث میں پیش کی گئی ہے۔

ہر قوم کے وہ عوام جو تاریخ اقوام سے ناواقف ہیں اور انہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ اس قسم کے عجیب و غریب واقعات تمام قوموں میں ہوتے رہتے ہیں اور اہل علم ایسے لوگوں کی قلعی کھولتے رہتے ہیں۔ وہ اسی قسم کے عجیب واقعات کو اپنے ہاں دیکھ کر اس قدر دھوکا کھاتے ہیں کہ وہ ایسے دجالوں اور شعبدہ بازوں کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ انہیں موقع دیتے ہیں کہ وہ ان کا مال جس طرح چاہیں لوٹیں اور ان کی آبرو جس طرح چاہیں خراب کریں۔ بالخصوص جبکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ اولیاء اللہ کی کرامات ہیں۔ مگر جب قوموں میں تاریخ کا علم وسیع ہو جاتا ہے تو لوگ بہت کم ایسی باتوں پر یقین کرتے ہیں یا ایسے شعبدہ بازوں کے چنگل میں بہت کم پھنستے ہیں۔ تاہم آج کل بھی یورپ اور امریکہ میں یہ چیز عام ہے۔ اگرچہ یہ مشرقی ممالک اور بالخصوص دیہات اور وحشی حبشیوں کے علاقوں سے کم تر ہے۔ لیکن خدا کی حقیقی نشانیاں جنہیں ہم معجزات کہتے ہیں، اس قسم کے شعبدوں اور ہنر مندی کے کاموں سے کہیں بلند و بالا ہیں۔ ان میں کسی انسان کی ہنر مندی یا کوشش کا کوئی دخل نہیں ہے۔ چنانچہ خدا نے اپنے پیغمبروں کی تائید جن معجزات سے کی، ان میں بھی ان کی اپنی قابلیت، عمل اور تاثیر کا کوئی دخل نہ تھا۔ یہاں تک کہ ان نشانیوں میں بھی ان کا کوئی دخل نہیں تھا، جو خدا کے حکم کے مطابق ان کی اپنی ارادی حرکت سے ظہور میں آئی تھیں۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کس طرح خوفزدہ ہو گئے تھے جب ان کی اپنی لاٹھی زندہ سانپ بن گئی تھی۔ چنانچہ وہ بھاگ

گئے تھے اور ان پر خوف اس قدر غالب ہوا کہ انہوں نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ یہاں تک کہ خدا نے ان کا خوف دور کیا اور وہ واپس آ گئے۔ اس طرح کیا تم نے قرآن کریم میں نہیں پڑھا کہ خداوند تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ سے فرمایا:

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ (۸:۱۷)

(اے پیغمبر! آپ نے تیر نہیں چلایا تھا بلکہ یہ تیر خدا نے چلایا۔)

علاوہ ازیں جب قریش نے آپ ﷺ سے نشانیاں طلب کیں تو خدا نے آپ ﷺ کو یہ جواب دینے کا حکم فرمایا:

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا (۱۷: ۹۳)

(اے پیغمبر! کہہ دیجئے میرا پروردگار پاک ہے، میں کیا ہوں۔ صرف ایک پیغمبر انسان ہوں۔)

نیز یہ بھی ارشاد فرمایا:

قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِندَ اللَّهِ (۶: ۱۰۹)

(کہہ دیجئے کہ نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں۔)

معجزہ اور کرامت میں فرق:

خدا نے اپنے پیغمبروں کو معجزات کی تائید اس لئے عطا فرمائی تھی کہ وہ ان کی اپنی قوموں پر حجت بن سکیں اور جن لوگوں میں ہدایت قبول کرنے کی صلاحیت ہو، وہ معجزات کو دیکھ کر ہدایت قبول کر لیں اور جو انہیں دیکھ لینے کے بعد بھی جان بوجھ کر انکار کریں ان پر عذاب نازل ہو۔ بلکہ خدا کا عذاب اسی وقت نازل ہوتا ہے جب یہ حجت پوری ہو جاتی تھی۔ لہٰذا معجزات کا ظہور اس دینی تبلیغ کی تکمیل کے لئے ضروری تھا، جس کے لئے وہ مبعوث کئے گئے تھے۔ پیغمبروں کا یہ طریقہ تھا کہ وہ اپنی نبوت کی تصدیق کے مخصوص معجزات کے علاوہ اور کسی خلاف عادت کام کے لئے خدا سے دعا نہیں کرتے تھے مگر یہ کہ قحط سالی میں باران رحمت یا ایسی ہی کوئی ضرورت پیش آ جائے۔ حضرت محمد خاتم المرسلین ﷺ سب پیغمبروں سے زیادہ خدا کے محبوب تھے۔ مگر اس کے باوجود آپ ﷺ کے اصحاب اور اہل بیت بیماریوں اور فقر و فاقہ کے مصائب میں صبر سے کام لیتے تھے اور ان کے انسداد کے لئے شاذ و نادر ہی خدا سے دعا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک مرکی

زدہ عورت نے آپ ﷺ سے شفا کے لئے درخواست کی تو آپ ﷺ نے اسے ہدایت کی کہ مصیبت پر صبر کرنا ہی اس کے لئے بہتر ہے۔ اس نے یہ کہا کہ جب مرگی کا دورہ پڑتا ہے تو اس وقت وہ برہنہ ہو جاتی ہے۔ اس لئے دعا کی جائے کہ ایسے موقع پر وہ برہنہ نہ ہوا کرے۔ اس پر آپ ﷺ نے دعا فرمائی اور خدا نے آپ ﷺ کی دعا قبول کر لی۔

مشرکین مکہ آپ ﷺ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کائناتی معجزات جیسے معجزات کا مطالبہ کیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ انہیں خدا کے حکم کے مطابق یہ صاف جواب دیتے تھے کہ معجزات خدا کی طرف سے ہوتے ہیں، وہی ان پر قادر ہے، رسول قادر نہیں ہے بلکہ آپ ﷺ ان کے مطالبے پر تعجب کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے:

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا ﴿۹۳﴾ (۱۵: ۹۳)

(اے پیغمبر) کہہ دیجئے میرا پروردگار پاک ہے۔ میں کیا ہوں؟ صرف ایک پیغامبر انسان ہوں۔

اس طرح کا جواب اپنی قوم کے مطالبے پر گزشتہ پیغمبر بھی دیتے تھے۔

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِنْ نَحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَمُنُّ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۖ وَمَا كَانَ لَنَا أَنْ نَأْتِيَكُمْ بِسُلْطَانٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ (۱۴: ۱۱)

(ان کے رسولوں نے ان سے فرمایا: "ہم بھی تمہارے جیسے انسان ہیں، مگر خدا اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے احسان کرتا ہے۔ ہم خدا کے حکم ہی سے تمہارے سامنے ثبوت پیش کر سکتے ہیں۔

اعتراضات کے جوابات:

کرامت کی اصل بنیاد یہ ہے کہ وہ پوشیدہ رہے، کیونکہ اس کے ظاہر ہو جانے سے لوگ فتنے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اہل کرامت اپنی کرامات اور مکاشفات کو کسی مجبوری ہی سے ظاہر کرتے ہیں۔ چنانچہ علماء اور صوفیاء کرام نے اس کی تصریح کی ہے اور عوام کے مشہور خیالات کے برخلاف اس پر سب متفق ہیں۔

علامہ تاج السبکی نے "طبقات الشافعیہ" میں کرامات کے منکروں کے دلائل بیان کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔ "دلیل دوم۔ منکر کہتے ہیں کہ اگر کرامت جائز ہوتی تو اس کی معجزہ سے مشابہت ہو جاتی اور اس کے بعد معجزہ نبوت کی دلیل نہ رہتا۔ اس کا جواب یہ ہے

کہ معجزہ نبوت کے دعوے کے ساتھ پیش ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے کہ کرامت ولی کی طرف سے پیغمبر کے کمال اتباع کا نتیجہ ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں معجزہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کا اظہار اعلانیہ ہو۔ مگر کرامت ہمیشہ پوشیدہ ہوتی ہے اور شاذ و نادر یا کسی خاص ضرورت ہی سے ظاہر کی جاتی ہے۔ نیز معجزے کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ تمام خلاف عادت باتوں کے ساتھ نمودار ہو۔ مگر کرامت میں صرف ایک آدھ بات خلاف عادت ہوتی ہے۔ جیسا کہ امام قشیری کے کلام سے پتہ چلتا ہے اور یہی صحیح ہے۔"

آگے چل کر وہ منکروں کی چوتھی دلیل اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"یہ منکرین کہتے ہیں کہ اگر نیک بندوں کے ہاتھوں خلاف عادت کاموں کے اظہار کو ممکن مانا جائے تو پیغمبروں کی نبوت معجزات کے ظہور کے موقع پر ثابت نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ ممکن ہے کہ یہ معجزہ پوشیدہ طور پر کسی ولی کی طرف سے ظاہر ہوا ہو، کیونکہ تمہاری جماعت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اولیاء اللہ کرامات کا اظہار نہیں کرتے ہیں اور نہ اس کے لئے دعا کرتے ہیں، بلکہ کرامت پردوں کے پیچھے نمودار ہوتی ہے اور اس سے صرف چند لوگ ہی واقف ہوتے ہیں اور وہ ہمیشہ راز کی صورت ہی میں رہتی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی نبی ظاہر ہوا اور اس نے کسی معجزہ کا اعلان کیا تو ممکن ہے کہ ایسا معجزہ اس زمانے کے کسی ولی کی طرف سے کرامت کی صورت میں پیش ہو چکا ہو۔ اس لئے وہ خلاف عادت معجزہ نہیں ثابت ہوگا۔ ایسی صورت میں اس کی نبوت کی تصدیق کی کیا صورت ہوگی جبکہ اس نے خلاف عادت معجزہ پیش نہیں کیا؟ نیز کرامت کے بار بار ہونے سے کوئی چیز خلاف عادت باقی نہیں رہتی۔ اس لئے اگر اس کے زمانے میں کوئی نبی ظاہر ہو جائے تو اس کے معجزات پر صحیح طور پر غور نہیں ہو سکتا۔

جواب میں یہ کہا گیا ہے کہ ہمارے آئمہ کرام نے اس کی دو توجیہیں بیان کی ہیں۔ پہلی توجیہ یہ ہے کہ کرامات اس قدر بار بار اور لگاتار نہیں ہوتیں کہ ان کا بھی حسب معمول عادت میں شمار کیا جاسکے۔ وہ اس طرح شاذ و نادر نمودار ہوتی ہیں کہ وہ عادت نہیں بن سکتیں۔ اس لئے مذکورہ بالا نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ دوسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے جس پر اکثر علماء متفق ہیں کہ پوشیدہ کرامات لگاتار اور بار بار ہو سکتی ہیں۔ مگر وہ اس قدر پوشیدہ ہوتی ہیں کہ اس کی لوگوں کو خبر تک بھی نہیں ہوتی، اس لئے نہ تو ان کی شہرت

ہوتی ہے اور نہ وہ عادت بن کر خلاف عادت کرامات کے دائرہ سے خارج ہوتی ہیں۔

میری رائے یہ ہے کہ محقق صوفیائے کرام علمائے کلام واصول کے اس قول میں ہمنوا ہیں کہ کرامات لگاتار اور بار بار ظاہر نہیں ہوتی ہیں اور ان کا ظاہر کرنا ممنوع ہے بلکہ حضرت شیخ محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں کہ جو بار بار ہو، وہ کرامت نہیں ہے، کیونکہ اس طرح وہ معمولی اور عادی چیزیں بن جاتی ہیں۔ کرامت وہی ہے جو خلاف عادت ہو۔ شیخ احمد رفاعی فرماتے ہیں کہ اولیاء اللہ اپنی کرامات کو اس طرح پوشیدہ رکھتے ہیں جس طرح عورت اپنے ایام کو چھپاتی ہے۔

عقائد اسلام کے اس بنیادی اصول سے جہالت کی وجہ سے قبر پرست وغیرہ مدعیان علم یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ معجزات اور کرامات بھی معمولی صفتوں کی طرح قابل تحصیل ہیں اور انبیاء کرام اور دوسرے نیک بندے جب چاہیں اپنی زندگی میں یا مرنے کے بعد یہ معجزات و کرامات انہیں دکھا سکتے ہیں۔ چنانچہ اس وہم کی بناء پر وہ عوام کو ورغلاتے ہیں کہ وہ دور دراز مقامات سے سفر کر کے ان بزرگوں کے مزارات پر دعا اور امداد حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوں تاکہ وہ ان کے ان شدید مصائب والام کو دور کریں جو حکیموں اور ڈاکٹروں کے معمولی علاج سے دور نہیں ہو سکتے۔ یہ لوگ قبروں پر نذر و نیاز اور قربانی پیش کرتے ہیں، جس طرح مشرکین اپنے دیوتاؤں کے سامنے نذر و نیاز پیش کرتے ہیں۔

یہ لوگ حرام کی کمائی کھاتے ہیں اور عوام سے یہ کہتے ہیں کہ خدائی مذہب کا بھی یہی حکم ہے کہ یہ عقیدہ رکھیں کہ یہ بزرگ ان کی ضرورتیں پورا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ بزرگ اپنے جسموں سمیت قبر سے نکل آتے ہیں اور لوگوں کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں اور ان کے دکھ درد دور کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر ایسا ہوتا رہے تو پھر یہ خلاف عادت کرامت کیسے کہلائی جا سکتی ہے۔ کچھ لوگوں نے کسی مطبوعہ کتاب میں یہاں تک لکھا ہے کہ فلاں قطب لوگوں کو زندہ کرتا ہے اور موت دیتا ہے۔ انہیں امیر و غریب کرنے کے اختیارات رکھتا ہے۔ نیز خوش قسمتی اور بدبختی بھی اس کے ہاتھ میں ہے۔ بلکہ انہوں نے کتاب اور سنت کے بنیادی اصولوں اور عقائد کے برخلاف بہت سی باتیں کہی اور لکھی ہیں جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے طریقہ کے خلاف ہیں اور کرامت کی اصل حقیقت سے ناواقفیت کی بناء پر وہ آیات میں تاویل و تحریف کرتے رہتے ہیں۔

معجزات کے منکرین:

معجزات اور آیات الٰہی کے منکرین کی دو قسمیں ہیں۔ اول وہ ہیں جو تمام معجزات کے منکر ہیں اور کسی چیز کو نہیں مانتے۔ دوسرے وہ ہیں جو خدا کے سوا دوسروں کو اس کا شریک مانتے ہیں اور ان میں خدا کی ان مخصوص طاقتوں کا وجود تسلیم کرتے ہیں جو اس کے علاوہ دوسروں کو حاصل نہیں ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے ازراہ نوازش انہیں غیبی طاقتیں بخشی ہیں اور دنیا پر ان کا اختیار و تصرف عطا فرمایا ہے۔ یعنی خود خدا نے انہیں اپنا شریک بنالیا ہے۔ جس طرح مشرکین مکہ اپنے حج کے موقع پر یہ کہا کرتے تھے۔ "ہم لبیک کہتے ہیں اے خدا تیرا کوئی شریک نہیں ہے مگر وہ جسے تو نے خود شریک کرلیا ہے اس کا تو مالک ہے اور وہ کسی کا مالک نہیں ہے۔" یہ لوگ ان کے لئے عبادت، شرک، تخلیق وغیرہ الفاظ بولنے سے گریز کرتے ہیں مگر معانی اور مطلب وہی ہے۔ یہ لوگ خدا اور بزرگوں پر وہ جھوٹ بولتے ہیں جس کی تکذیب وتردید خدائی نازل کردہ کتاب اور اس کے رسول کی طرف سے ہورہی ہے۔ یہ لوگ اپنے مقاصد کے برخلاف آیات کی تاویل کرتے ہیں اور اسی میں تحریف کر کے اپنی جہالت کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ خدا حضرت مریم علیہا السلام کو بے حساب رزق دیا کرتا تھا۔ حالانکہ اس رزق میں خود حضرت مریم کے کسی فعل کا کوئی دخل نہیں تھا اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ رزق ان کے پاس خدا کیسے پہنچاتا تھا؟ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف خدا کی وحی کا ذکر کرتے ہیں کہ خدا نے انہیں ہدایت کی تھی کہ وہ انہیں دریا میں پھینک دیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دودھ پلائیں۔ اس کام میں بھی ان کا کوئی دخل نہ تھا اور نہ یہ ان کا ذاتی فعل تھا۔ بعض لوگ ان کی والدہ کو بھی پیغمبر مانتے ہیں۔ یہ لوگ ملکہ سبا کے تخت کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ یہ بھی خدا کا معجزہ تھا جو اس نے اپنے پیغمبر حضرت سلیمان علیہ السلام کو عطا فرمایا۔ آیت میں یہ تصریح نہیں ہے کہ وہ تخت وہاں کس طرح پہنچایا گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ حضرت جبریل علیہ السلام لائے اور بعض کا قول ہے کہ وہ دوسرا فرشتہ تھا۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان کے وزیر جو ولی تھے وہ لائے۔ بہر حال یہ غیر معقول اسرائیلی روایات ہیں۔

یہ خرافاتی انسان عوام کے لئے ان کے دین و دنیا دونوں میں اس سے کہیں زیادہ

خرابی پیدا کرتے ہیں جتنی ان لوگوں سے پیدا ہوتی ہے جو سراسر اللہ کی نشانیوں کے منکر ہیں بلکہ منکرین کے انکار و تکذیب کا باعث بھی یہی لوگ ہیں۔ کیونکہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ پیغمبر اور دوسرے بزرگ اولیاء کائنات کے قوانین فطرت کے خلاف تصرف کرسکتے ہیں بلکہ انہیں اس میں بالکل تغیر و تبدل کا اختیار بھی حاصل ہے۔ وہ اس پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا نے خود یہ عقیدہ رکھنے کا حکم دیا ہے اور اسے مذہب کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اس طرح وہ مذہب کی بنیاد ہی سے تکذیب کر رہے ہیں۔ لہٰذا پیغمبروں اور بزرگوں کے بارے میں کائنات پر تصرف کا دعویٰ کرنا بغیر علم کے خدا کی مخالفت کرنا اور اس پر جھوٹا الزام باندھنا ہے، جس کی خدا نے اجازت نہیں دی ہے بلکہ یہ کفر کی بدترین قسم ہے۔ کیونکہ اس کا نقصان متعدی ہے۔ اس میں باطل عقیدہ کے ذریعے لوگوں کو گمراہ کیا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ ناجائز عبادت اور باطل پرستی ہے۔

ان خرافات کا علاج:

جو لوگ خدا کی نشانیوں سے جہالت کی وجہ سے عبادت الٰہی میں شرک کرتے ہیں اور اپنی خرافات میں اپنے ہی جیسے جاہلوں کی تقلید کرتے ہیں، ان کا علاج یہ ہے کہ انہیں علم کلام کے نظریات سے دور رکھ کر صرف قرآن مجید کی آیات سے توحید الٰہی کی تعلیم دی جائے اور انہیں بتایا جائے کہ پیغمبروں کے فرائض کیا تھے؟ وہ پیغمبر بھی انسان تھے مگر ان کی خصوصیت یہ تھی کہ خدا نے ان پر وحی نازل فرمائی۔ تاکہ وہ اس پسندیدہ مذہب کی تعلیمات اس کے بندوں تک پہنچائیں۔ ان کا مخصوص فرض تعلیم و ہدایت ہے۔ وہ خدائی بشارت سناتے ہیں۔ خوف خدا کی تلقین کرتے ہیں اور عدل و مساوات کے ساتھ خدائی شریعت کے احکام نافذ کرتے ہیں۔ مگر خدا نے انہیں کائنات میں تصرف کرنے کے ذاتی اختیارات عطا نہیں فرمائے۔ انہیں اپنی ذات سے یہ قدرت بھی حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے قریب ترین اور عزیز ترین رشتہ داروں کو ہدایت یافتہ بنا سکیں۔ جیسے والد، لڑکا، بیوی اور دوسرے قریبی رشتہ دار۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد نے کفر کی حالت میں انتقال کیا اور خدا اور اس کے رسول کے دشمن ہو کر مرے۔

حضرت نوح علیہ السلام کا لڑکا بھی کافر فوت ہوا۔ بلکہ خدا نے حضرت نوح علیہ السلام

کو یہ اجازت بھی نہیں دی کہ اسے وہ کشتی میں سوار کر سکیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھی ڈوبنے والے کافروں کے ساتھ غرق ہو گیا۔ ابولہب خدا کے رسول اور حبیب محمد ﷺ کا چچا تھا۔ مگر آپ ﷺ کا سب سے بڑا دشمن تھا اور سب سے زیادہ آپ ﷺ کو تکلیفیں پہنچاتا تھا۔ اس لئے خدا نے اس کی مذمت اور وعید میں ایک سورت نازل فرمائی۔ جسے تمام مسلمان روز قیامت تک بطور عبادت تلاوت کرتے رہیں گے۔ ایسی سخت سورت کسی اور دشمن خدا اور دشمن رسول ﷺ کے بارے میں نازل نہیں ہوئی بلکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کاملہ ملاحظہ ہو کہ آپ ﷺ کے دوسرے چچا ابوطالب جنہوں نے آپ ﷺ کی پرورش اور کفالت کی، اور جہاں تک ان سے ہو سکا، انہوں نے آپ ﷺ کو مشرکوں کی تکالیف سے بچایا۔ وہ بھی آپ ﷺ پر ایمان نہیں لا سکے۔ حالانکہ آپ ﷺ نے ان سے یہاں تک کہا کہ وہ صرف کلمہ لا الہ الا اللہ کہیں تاکہ قیامت کے دن آپ ﷺ ان کے حق میں شہادت دے سکیں۔ مگر وہ اس سے بھی رک گئے۔ اس پر خداوند تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ (۲۸:۵۶)

(در حقیقت تم جسے چاہتے ہو اسے ہدایت نہیں دے سکتے، بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔)

اس واقعہ کی روایت امام مسلم نے کی ہے۔ اس مسئلہ کی تفصیل ہم نے آیت وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ آزَرَ (۶:۷۴) کی تفسیر میں بیان کی ہے۔ (تفسیر جلد ۷ صفحہ ۵۲۴-۵۶۵)

اسی سورۂ انعام کے خلاصہ میں پیغمبروں کے فرائض بیان کئے گئے ہیں اور جو اس موضوع میں تفصیلات کا خواہش مند ہو، وہ اس کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔ (تفسیر جلد ۸، صفحہ ۲۵۷-۵۷۸) جب پیغمبروں کو بھی کائنات میں تصرف کرنے کے اختیارات نہیں دیئے گئے ہیں تو اولیاء اکرام کو یہ اختیارات کیسے مل سکتے ہیں؟

معجزات اور شعبدہ بازی:

جو لوگ معجزات کے منکر ہیں ان پر قرآن کریم ہی کے ذریعے حجت قائم ہو سکتی ہے۔ کیونکہ یہود و نصاریٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام وغیرہ کے جن معجزات کا حال بیان کرتے ہیں، ان پر یہ لوگ یقین نہیں کرتے۔ اور ان روایات کو

صحیح تسلیم نہیں کرتے بلکہ انہیں بھی اس طرح کی افسانے خیال کرتے ہیں جس طرح کے خلاف عادت فریب انگیز افسانے ہر زمانے کے عوام، اپنے بزرگوں کے بارے میں مشہور کردیتے ہیں، جس کی بنیاد سراسر وہم و تخیل پر ہوتی ہے۔ اپنے ان خیالات کے ثبوت میں وہ کہتے ہیں کہ یہودی مورخ یوسیفوس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معاصر تھا۔ لیکن اس نے ان معجزات میں سے کسی ایک کا بھی ذکر نہیں کیا، جنہیں انجیلوں نے جو بعد میں تصنیف ہوئیں، بیان کیا ہے۔ اگر یہ روایات صحیح ثابت بھی ہوجائیں تو ایسی صورت میں یہ لوگ معجزات کی ایسی توجیہہ کرتے ہیں جیسی وہ ان ظاہری خلاف عادت کرشموں کی توجیہہ کرتے ہیں جو ہر زمانے میں دکھائی دیتے ہیں۔ اگر کوئی وجہ ان کی سمجھ میں نہ آئے تو یہ کہتے ہیں کہ ان کا بھی کوئی نہ کوئی اصل سبب ہوگا جو آگے چل کر ظاہر ہوگا یا خود کرشمہ ساز ہی اس کا اعتراف کرلے گا۔ یہ کرشمے ہندو سادھوؤں کے کرشموں کی مانند ہیں جیسے ہوا میں بلند ہونا وغیرہ (جیسا کہ ہم نے حضرت مسیح کے معجزات کے بیان میں فصل دوئم میں بیان کیا ہے)۔

ہندو سادھو کا کرشمہ:

مصر کے اخبار "الاتحاد" نے ہندوستان کے ایک مغربی سیاح کے جو حالات شائع کئے ہیں اس کا ایک واقعہ لکھا ہے جو ۱۸۷۳ء میں پیش آیا تھا۔

اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ ہندو سادھو پنجاب کے بادشاہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے محل میں حاضر ہوا اور مہاراجہ سے کہنے لگا کہ وہ اپنے بعض کرشمے اور کرامات دکھانا چاہتا ہے۔ مہاراجہ فقیروں کے کرشموں اور کرمات کا قائل نہ تھا اس نے پوچھا وہ کیا دکھانا چاہتا ہے؟ سادھو نے کہا کہ وہ چالیس دن تک دفن ہونے کے بعد بھی زندہ نکل آئے گا۔

اس کے کہنے کے مطابق مہاراجہ نے انگریز اور فرانسیسی ڈاکٹروں نیز پنجاب کے معزز امراء کو جمع کیا۔ فقیر سب کے سامنے اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس کی ہدایت کے مطابق روئی اور موم اس کی ناک اور کانوں میں بھردی گئی۔ کفن ہر طرف سے سی کر اسے پہنایا گیا۔ اس کے بعد سادھو کو ایک مضبوط لکڑی کے صندوق میں بٹھادیا گیا اور صندوق کے ڈھکنے کو آھنی کیلوں سے جڑ دیا گیا۔ اس کے بعد مہاراجہ صاحب نے خود اپنے ہاتھ سے اپنی مہر

صندوق پر لگادی۔ صندوق کو محل کے باغ کے ایک تہہ خانے کی کوٹھری میں رکھ کر دروازہ مقفل کردیا گیا اور مہاراجہ کی مہر قفل پر لگادی گئی۔ اس کے بعد مہاراجہ صاحب نے اپنے دو معتبر سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ دروازے کی نگرانی کرتے رہیں۔ ان کی امداد کے لئے ایک فوجی دستہ بھی متعین کیا گیا۔ یہ تمام کارروائی بہت سے مغربی اور پنجابی معززین اور مہاراجہ کے خدام کے سامنے عمل میں لائی گئی۔

چالیس دن کے بعد یہ سب لوگ مہاراجہ کے محل میں جمع ہوئے۔ انہوں نے دیکھا کہ مہر درست ہے۔ تہہ خانے کے سامنے گھاس پر کسی انسان کے قدموں کے نشان بھی نہیں دکھائی دیتے تھے۔ پھر تہہ خانے کی کوٹھڑی کھولی گئی۔ صندوق کی مہریں بھی بدستور ثابت تھیں۔ پھر صندوق کھولا گیا اور سادھو کو نکالا گیا۔ ایک عینی شاہد انگریز کے بیان کے مطابق اس کی حالت حسب ذیل تھی۔

"سادھو کو جب باہر نکالا گیا تو میں نے اس کے دونوں ہاتھ اور پاؤں سخت اکڑے ہوئے پائے۔ سر کندھے کے ایک طرف جھکا ہوا تھا۔ میں سمجھا کہ یہ مردہ لاش ہے جو عرصہ دراز سے بے جان ہے۔ میں نے اپنے ڈاکٹر کو حکم دیا کہ وہ اس کا طبی معائنہ کرے۔ ڈاکٹر نے جھک کر اس کے بازوؤں، کنپٹیوں اور دل کا معائنہ کیا۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ اس کی نبض کی حرکت کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن دماغ کے دائرے میں حرارت محسوس ہوتی ہے۔

"اس کے بعد سادھو کی سابقہ ہدایات کی بناء پر اس کا جسم گرم پانی سے دھویا گیا۔ اس کی وجہ سے اس کے جوڑ بتدریج نرم ہونے لگے۔ روئی اور موم کو کانوں اور ناک سے ہٹادیا گیا۔ سر پر گرم پانی کی تھیلیاں رکھی گئیں۔ اس سے مردہ لاش میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ رگ، پٹھے اور عضاء سکڑ گئے۔ پھر ان میں کپکپی پیدا ہوئی۔ پسینہ چھوٹنے لگا اور اعضاء اپنی پہلی حالت پر آگئے۔ چند منٹ کے بعد آنکھیں کھل گئیں اور ان کا قدرتی رنگ لوٹ آیا (اب سادھو زندہ ہو چکا تھا)۔ جب اس نے دیکھا کہ مہاراجہ صاحب اتے دہشت اور حیرانی میں گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں تو وہ کہنے لگا:

اے میرے آقا! کیا آپ نے میرے قول و فعل کی صداقت دیکھی؟ آدھ گھنٹے کے بعد سادھو تابوت سے باہر نکل آیا اور حاضرین سے اچھی طرح باتیں کرنے لگا اور انہیں

حیران و ششدر کرنے لگا۔"

یہ واقعہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی ہے جو ذاتی ریاضت اور مشق کی بدولت نمودار ہوئی۔ سادھو کا واقعہ (اگر سچا ہے) تو انجیل کے اس واقعہ سے زیادہ عجیب ہے جس میں لیعازر مرنے کے چار دن بعد حضرت مسیح علیہ السلام کی دعا سے زندہ ہوا تھا، جیسا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے معجزات کے سلسلے میں بیان کیا گیا ہے۔ بلکہ بعض وجوہ سے یہ واقعہ اصحاف کہف کے واقعہ سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ کیونکہ ہندوستانی سادھو کی ناک بھی بند کر دی گئی تھی اور اسے کفن میں لپیٹ کر ایک تابوت میں زمین کے نیچے رکھا گیا تھا۔ اس طرح اس سے ہوا بھی روک دی گئی تھی، جس کے بغیر عام طور پر کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔ برخلاف اس کے اصحاب کہف ایک کشادہ غار میں سو گئے تھے۔ جس کا دروازہ شمال کی طرف لطیف ہوا کے رخ پر تھا۔ پھر دھوپ بھی غار کے منہ پر صبح و شام ان سے بچتی ہوئی پڑتی تھی اور ہوا کو سونے والوں کے لئے لطیف بناتی تھی۔ اصحاب کہف کے معاملے میں عجیب ترین واقعہ یہ تھا کہ وہ عرصہ دراز تک سوتے رہے۔ یہ مدت بہت دراز تھی۔ بیضاوی وغیرہ مفسرین نے نقل کیا ہے کہ قرآن مجید میں جو مذکور ہے:

وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ (۱۸:۲۵)

(وہ اپنے غار میں تین سو سال تک رہے۔)

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی مدت کے بارے میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ چنانچہ بعد کے یہ الفاظ اس کی تائید کرتے ہیں۔

قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا (۱۸:۲۶)

(اللہ زیادہ جانتا ہے کہ کب تک وہ ٹھہرے۔)

لہٰذا اللہ تعالیٰ ہر حالت میں بہتر جانتا ہے۔ اگرچہ اس کی آیات کا راز اس کی مخلوق پر مخفی ہو مگر دونوں صورتوں میں کوئی چیز محال نہیں ہے۔ کیونکہ موجودہ زمانے میں بھی بعض لوگ مرض خواب میں مبتلا ہو کر کئی کئی مہینے سوتے رہتے ہیں۔

لیکن ہندوستانی سادھو کا واقعہ زندگی کے عام قوانین کے خلاف ہے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ واقعہ ان سادھوؤں کی اس ذاتی مشق اور ریاضت کا نتیجہ ہے جو زندگی کو اتنی طویل مدت تک باقی رکھ سکتی ہے، خواہ حالات مخالف ہوں اور دورۂ خون اور تنفس کی

سہولتیں میسر نہ ہوں تو ایسی صورت میں بھی کسی عقلمند کے لئے مناسب نہیں ہے کہ عام قدرتی اسباب کے خلاف پیش آنے والے واقعات کے انکار کو قاعدہ کلیہ قرار دے۔ کیونکہ خدا ئے عزوجل ہی نے یہ تمام قوانین بنائے ہیں اور یہ سب اس کے افعال ہیں۔ وہ اپنی قدرت سے ہر چیز پیدا کرتا ہے اور اپنی مشیت سے عالمگیر قوانین اور قدرتی اسباب مقرر کرتا ہے۔

خلاف عادت واقعات کے اکثر منکرین خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ مگر ان کے فطری قوانین کے خلاف کسی کام کے سرزد ہونے کے منکر ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں یہ اس کی حکمت کے منافی ہے۔ مگر وہ کونسا انسان ہے جو اس کی حکمتوں اور قوانین کا مکمل علم رکھتا ہو؟ البتہ عقل کا یہ تقاضا ضرور ہے کہ وہ خلاف فطرت اور عالمگیر قدرتی اسباب کے مخالف چیزوں کو اس وقت تک تسلیم نہیں کرتی جب تک اسے ایسا کوئی قطعی ثبوت نہ مل جائے، جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ اہل تحقیق مسلمانوں اور محقق مادی علماء اور ماہر نفسیات کا یہی صحیح مسلک ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں بجلی اور دیگر جدید ایجادات کے جو خواص معلوم ہوئے ہیں، ان کے بارے میں بھی اگر انکشاف کے زمانے سے پہلے کے دانشوروں اور اہل حکمت کے عہد میں یہ کہا جاتا کہ ایسی چیزیں ممکن ہیں تو وہ ایسے دعویداروں کو پاگل ٹھہراتے اور ان کی باتوں کو ہرگز نہ مانتے۔

معجزات کی قسمیں:

تمام معجزات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور قرآن کریم کے فیصلے کے مطابق ان میں پیغمبروں کے ذاتی فعل کا کوئی دخل نہیں ہے۔ تاہم اپنے مظاہر کے لحاظ سے ان کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ایک قسم وہ ہے جو فطری اور خدائی قوانین کے مطابق نہیں ہوتے۔ وہ حکومت کے مستثنیٰ قوانین کے مشابہ ہیں یا ان کی مثال ایسی ہے جیسے بادشاہ اپنے خاص اختیارات کی رو سے کسی خاص مصلحت کی بناء پر کوئی حکم خاص (آرڈیننس) جاری کرے۔ تاہم خدا کا نمونہ ان سے بہت اعلیٰ ہے۔

(۲) دوسری قسم میں وہ معجزات شامل ہیں جو اگر خدا کے مادی قوانین کے خلاف ہیں مگر خدا کے روحانی قوانین کے عین مطابق ہیں۔

موسوی معجزات:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جتنے معجزات قرآن کریم سے ثابت ہیں جیسے وہ نو معجزات جو مصر میں رونما ہوئے، وہ سب پہلی قسم کے معجزات ہیں۔ ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اپنے ذاتی ارادہ اور فعل کا کوئی دخل نہ تھا۔ اس طرح وہ معجزات جو بنی اسرائیل کے خروج مصر کے وقت اور صحرائے سینا میں سرگردانی کے وقت پیش آئے، وہ بھی سب اللہ تعالیٰ کے فعل کا نتیجہ ہیں اور ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فعل اور ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ انہوں نے خدا کے حکم سے سمندر اور پتھر پر اپنا عصا مارا تھا جو ان کا سب سے بڑا معجزہ تھا۔ پیغمبروں سے کم درجہ کے لوگ تو درکنار کسی پیغمبر کو بھی ایسے معجزات نہیں دیئے گئے تھے اور یہ معجزات ایسے نہیں تھے جو روحانی اسباب اور روحانی ریاضت کے بدولت ظہور میں آئے ہوں یا ارادوں کی طاقت یا مادی خواص اور مادی طاقتوں کی بدولت نمودار ہوئے ہیں۔

مسیحی معجزات:

مگر حضرت مسیح علیہ السلام کے معجزات جن کے ذریعے خدا نے ان کی مدد فرمائی تھی اگرچہ خلاف عادت اور فطری قوانین کے خلاف تھے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب کے سب یا ان میں سے اکثر عالم ارواح میں خدائی قوانین کے مطابق تھے۔ یہاں تک کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش بھی ان کے مطابق تھی۔ وہ اس طرح کہ وہ روح الٰہی یعنی حضرت جبریل علیہ السلام کی پھونک کے ذریعے شکم مادر میں آگئے تھے اور اسی روح کے اثر سے حضرت مریم کے رحم میں وہ کیفیت پیدا ہوگئی جو مرد کے نطفے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ محض قدرت الٰہی کا ایک کرشمہ تھا۔ ایسی صورت میں یہ عجیب بات نہیں ہے۔ اگر آپ کے معجزات بھی تمام روحانی افراد، پیغمبروں اور اولیاء اللہ کے معجزات و کرامات سے بڑھ چڑھ کر ہوں مثلاً کشف کے واقعات اور بعض بیماروں کو شفایاب کرنا وغیرہ۔ لیکن حضرت مسیح علیہ السلام کی روحانیت اور ہندوستانی سادھوؤں اور مسلمان صوفیوں کی روحانیت میں یہ فرق ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی روحانیت زیادہ طاقتور، مکمل، زیادہ پاکیزہ اور افضل تھی اور آپ کے معجزات سراسر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھے۔ جن میں

آپ کے عمل کا کوئی دخل نہ تھا بلکہ ان کا سرچشمہ یہ تھا کہ خدا نے انہیں اپنی قدرت سے پیدا کر کے ان کی پوری ذات کو اپنی نشانی قرار دیا۔ جیسا کہ خود فرماتا ہے :

وَالَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۝ (۲۱:۹۱)

(وہ خاتون (حضرت مریم) جو پاکدامن رہی، ہم نے اس میں اپنی روح میں سے پھونکا اور اسے اور اس کے بیٹے کو دنیا کے لئے نشانی بنایا۔)

دوسری جگہ بھی ارشاد ہے :

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗٓ اٰيَةً (۲۳:۵۰)

(ہم نے ابن مریم اور اس کی والدہ کو نشانی بنایا۔)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ خدا کی نشانیاں اس لئے ہوئیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام روح الٰہی کی پھونک سے شکم مادر میں آئے اور پیدا ہوئے نہ کہ انسانی مادے کی ترکیب سے۔ ان کی تخلیق میں یہ احتمال بھی نہیں ہے کہ حضرت مریم کے رحم میں نر اور مادہ کے مادے تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا سب سے بڑا روحانی معجزہ وہ ہے جو قرآن کریم نے بیان کیا ہے۔ مگر چاروں انجیلوں کے مؤلفوں نے اسے روایت نہیں کیا (کہا جاتا ہے کہ یہ معجزہ اس "انجیل طفولیت" میں مذکور تھا۔ جسے کلیسا نے بعثت محمدی سے پہلے ہی مسترد کر دیا تھا۔ اس لئے وہ انجیل دنیا سے مفقود ہو گئی) وہ معجزہ یہ ہے کہ آپ گیلی مٹی کا ایک ٹکڑا لے کر اس سے ایک پرندے کا پتلا بناتے، پھر اس میں اپنی سانس پھونکتے تھے، خدا کے حکم سے وہ پرندہ بن جاتا تھا۔ روایت ہے کہ یہ مٹی کا پرندہ کچھ دیر اڑتا تھا پھر مر کر گر پڑتا تھا۔

صحیح اور تندرست جسم والے مردے کو جو حال ہی میں مرا ہو زندہ کر دینا پرندے والے معجزے سے کم ہے، کیونکہ ایسے مردے میں اپنی روحانی لہر چھوڑنا پھر اللہ تعالیٰ کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو کر دعا کرنا، اس میں خدا کے حکم سے زندگی لوٹ آنے کا روحانی سبب ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح بجھتے ہوئے چراغ سے روشنی قریب ہوتی ہے تو وہ فوراً جل اٹھتا ہے یا جس طرح بجلی کی مثبت لہر منفی لہر سے ملتے ہی روشنی پیدا کر دیتی ہے۔ ہندو سادھوؤں کے بعض واقعات نقل کئے جاتے ہیں کہ انہوں نے مردہ میں عارضی زندگی لوٹا دی۔ اگر یہ صحیح ہیں تو یہ چیز ریاضت سے حاصل ہوتی ہے۔ خود اس زمانے کے

بعض ڈاکٹروں کے متعلق ثابت ہوا ہے کہ انہوں نے موت کے بعد ہی عمل جراحی (آپریشن) یا قلب کے علاج سے مردوں میں زندگی لوٹادی۔

اس سے کم درجے پر بعض بیماروں کواچھا کردینے کا معجزہ ہے۔ بالخصوص اعصابی بیماریاں، خواہ اس کا سبب انجیلوں کی روایات کے مطابق شیطانی چھوت چھات ہو، یا کسی پاگل سے اختلاط ہو۔ ایسی صورت میں شفا اس لئے ہوجاتی ہے کہ شیطان خبیث روح ہے جو پاک روح کی توجہ سے جو روح القدس حضرت جبریل علیہ السلام کا ایک شعلہ ہے باقی نہیں رہ سکتی۔ اس قسم کے واقعات شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ اور دوسری روحانی شخصیتوں کے ساتھ پیش آچکے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے شاگرد علامہ ابن القیم نے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے (ابن تیمیہ نے) کسی آدمی کو ایک مرگی زدہ کے پاس بھیجا۔ اس نے جن کو جو اس کے اندر تھا، مخاطب کر کے کہا "شیخ تمہیں حکم دیتے ہیں کہ تم نکل جاؤ۔" وہ بدروح نکل گئی! اور وہ آدمی فوراً تندرست ہوگیا۔ اعصابی اور دوسری بیماریاں زندگی کی کمزوری کا نتیجہ ہیں لہٰذا بیمار کا اس روح کے ساتھ ملنے ہی سے وہ بیماری دور ہوجاتی ہے۔

مکاشفات:

ان مذکورہ معجزات سے کم تر مکاشفات ہیں۔ جنہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قول کے مطابق قرآن کریم میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

وَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ (۴۹:۲)

میں تمہیں بتادوں گا کہ تم کیا کھاتے ہو اور اپنے گھروں میں کیا جمع کرتے ہو۔

دوسرے اسرائیلی پیغمبر اور دیگر روحانی شخصیتیں بالخصوص امت محمدیہ کے بزرگ حضرات نے مستقبل کی اس سے زیادہ ضروری اور اہم باتیں بتائی ہیں۔ مگر طاقت اور کمزوری کے لحاظ سے ان کے درجے مختلف رہے ہیں۔ یہ کمی بیشی، قوت وضعف، مدت کی درازی، حاضر و غائب کے ادراک، مرکبات وغیر مرکبات میں فرق مراتب کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ کوئی گزشتہ زمانے کی خبریں بتاتا ہے اور کوئی مستقبل کے واقعات سے مطلع کرتا ہے۔ سب سے اعلیٰ درجہ پیغمبروں کے لئے مخصوص ہے۔ کیونکہ نہ کوئی دوسرا آدمی ایسا پیدا ہوا اور نہ پیدا ہوگا جو کشف کے ذریعے قدیم ترین زمانے کے حالات بیان کرسکے۔ جیسا

کہ قرآن کریم نے گزشتہ نبیوں اور ان کی قوموں کے حالات بیان کئے ہیں۔ نیز یقین کے ساتھ مستقبل کی خبریں بھی بتا سکے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں یہ بتایا گیا ہے کہ چند سالوں میں رومیوں کو ایرانیوں پر فتح حاصل ہو گی یا جیسا کہ پیغمبر ﷺ نے اپنی امت کے حق میں پیشین گوئی کی تھی کہ بڑے بڑے ملک فتح کرے گی اور دوسری قومیں آپ ﷺ کی امت کی پیروی کریں گی۔ پھر ایسا زمانہ بھی آئے گا کہ یہی قومیں اس امت پر ٹوٹ پڑیں گی، جس طرح کھانے والے کھانے کے پیالوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ آپ ﷺ کے بعض صحابیوں نے بھی بتا دیا تھا کہ ان کے زمانے میں کیا ہونے والا ہے۔ جیسے کسریٰ کی سلطنت کا زوال۔ بہر حال ہم قرآن و حدیث کی غیبی خبروں کے بارے میں دوسرے حصے میں ایک خاص باب مقرر کریں گے۔ جیسا کہ ہم نے اس ایڈیشن کے مقدمے میں وعدہ کیا ہے۔

موجودہ زمانے میں مکاشفات کی ایک قسم وہ بھی ہے جسے "اذکار خوانی" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور ایک قسم وہ ہے جسے "خیالات کا منتقل کرنا" کہتے ہیں۔

اس بیان سے یہ ظاہر ہو گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جو معجزات مشہور ہیں وہ قدرت خداوندی کا کرشمہ تھے اور خدا کی روحانی طاقتوں کے کسی قانون کے ماتحت نہیں تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات اس کے برعکس تھے۔ تاہم معجزات کی پہلی قسم انسانوں کے نظر میں خدا کی قدرت و مشیت اور خود مختاری کا سب سے زبردست ثبوت ہے۔ کیونکہ یہ اسباب اور حسیات کے اس نظام سے الگ تھلگ ہے، جس پر ان لوگوں کے کاموں کا دارومدار ہے۔

مسیح اور اولیاء پرستی:

بہت سے لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پرستش کی ہے اور انہیں خدا بنا لیا ہے۔ مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرستش نہیں کی گئی۔ حالانکہ ان کے معجزات نہایت عظیم الشان تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اس بات سے ناواقف تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات عام روحانی قوانین کے مطابق پیش ہوئے تھے جس میں ان کے ساتھ دوسرے لوگ بھی شریک ہو سکتے تھے۔ بلکہ ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ انہوں نے محض اپنی روحانی طاقت کے بل بوتے پر یہ معجزات پیش کیے۔ اس طرح حضرت

مسیح علیہ السلام کی طاقت عین قدرت الٰہی بن گئی۔ کیونکہ ان کے خیال میں خداوند تعالیٰ حضرت مسیح علیہ السلام کے اندر حلول کر گیا تھا اور متحد ہو کر ایک ہو گیا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نشانیاں سراسر قدرت خداوندی کا کرشمہ تھیں۔ تاہم وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت (تورات) کی پیروی کی ہے۔ سوائے چند باتوں کے جنہیں خدا نے ان کی زبان سے منسوخ کرایا۔ جیسے بعض ایسی چیزوں کا حلال کر دینا جو یہودیوں کی سرکشی کی وجہ سے سزا کے طور پر، ان پر حرام ہو گئی تھیں۔ نیز دولت اور حد سے زیادہ خواہش پرستی کو حرام قرار دیا گیا تھا۔

اس بارے میں عیسائیوں کا معاملہ ان مسلمانوں کا سا ہے جو سختیوں اور مصائب میں اپنے بزرگوں سے دعا مانگ کر ان کی عبادت کرتے ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ بزرگ خلاف عادت اپنے غیبی تصرف کے ذریعے ان کی تکالیف کو دور کرتے ہیں اور انہیں نفع پہنچاتے ہیں۔ عالم اسباب سے الگ رہ کر ان کا یہ غیبی تصرف ان کے نزدیک کرامت کے مفہوم میں داخل ہے۔ حالانکہ اس قسم کے اختیارات صرف خداوند تعالیٰ کو حاصل ہیں۔ یہ لوگ انہیں پروردگار، خدا اور خالق نہیں کہتے۔ مگر ناموں کا اختلاف اس بارے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ الفاظ اور نام محض اصطلاحی ہیں۔

خالق و مخلوق، رب اور بندے میں فرق یہ ہے کہ خالق پروردگار، جب چاہتا ہے اپنے مقرر کردہ اسباب سے کام لیتا ہے اور جب چاہتا ہے اس کے بغیر بھی کام کر سکتا ہے۔ لیکن خدا کی مخلوق اور اُس کے بندے اپنے افعال میں سراسر قدرتی اسباب اور خدا کے عالمگیر قوانین میں جکڑے ہوئے ہیں جو تمام مخلوق کے لئے مقرر کیے گئے ہیں۔ مگر تمام انسان اپنے علم و عمل کے لحاظ سے اسی قدر مختلف ہیں جس قدر عقل و حواس کی طاقتوں اور اعضاء کے لحاظ سے ان کی صلاحیت اور استعداد میں فرق ہے۔

اب انسان اپنے ذاتی علم و عمل کے ذریعے جلب منفعت اور دفع ضرر کے لحاظ سے اس مقام تک پہنچ گیا ہے جو پہلے کسی مخلوق کو نصیب نہیں ہوا تھا۔ یہاں تک کہ پیغمبر اور دوسرے اعلیٰ انسان بھی اس مقام پر نہیں پہنچ سکے تھے۔ درحقیقت پیغمبر اس مقصد (دنیاوی ترقی) کے لئے قطعی طور پر نہیں بھیجے گئے تھے بلکہ ان کی بعثت کا اصل مقصد یہ

تھا کہ انسانوں کو معرفت و عبادت الٰہی کی راہ دکھائیں اور ان کے اخلاق کی اصلاح کریں۔ لہٰذا پیغمبروں سے دنیاوی مفاد نہیں طلب کرنا چاہیئے۔ نہ ان کی زندگی میں اور نہ ان کی وفات کے بعد، بلکہ یہ مفاد ان وسائل و اسباب کے ذریعے حاصل کرنا چاہیئے جن کے ذریعے وہ حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ اسباب کے بغیر خدا کے سوا اور کسی کو کوئی راہ اختیار حاصل نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ظالموں نے بعض پیغمبروں اور اولیاء کو قتل کیا اور انہیں طرح طرح کی تکالیف پہنچائیں۔ مگر یہ پیغمبر اور اولیاء اللہ بھی خود اپنے آپ کو ان تکالیف سے نہ بچاسکے۔ اسی وجہ سے قرآن کریم میں بار بار اس بات کی تردید کی گئی ہے کہ جن چیزوں یا آدمیوں کی انسانوں نے پرستش اختیار کر رکھی ہے وہ نہ تو خود نفع پہنچا سکتے ہیں۔ نہ انہیں یہ اختیار حاصل ہے کہ خدا سے، ان کی سفارش اور سفارشات کر سکیں۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هَٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللَّهِ

(١٠ : ١٨)

(وہ خدا کو چھوڑ کر ایسے لوگوں کی پرستش کرتے ہیں جو انہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ نفع۔ وہ کہتے ہیں یہ خدا کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔)

اس کے ہم معنی اور بہت سی آیات ہیں۔ پھر خدا نے اپنے آخری رسول ﷺ کو بھی حکم دیا کہ دوسرے پیغمبروں کی طرح خود بھی لوگوں کو اس حقیقت سے آگاہ کردیں۔ چنانچہ فرمایا۔

قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (٧ : ١٨٨)

(کہہ دیجئے (اے پیغمبر) میں اپنی ذات کے لئے نہ کسی نفع کی طاقت رکھتا ہوں نہ نقصان کی سوائے اس کے جو خدا چاہے۔ اگر میں غیب کو جانتا تو اپنے لئے بہت سی بھلائی حاصل کرلیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی۔ میں اس کے سوا کچھ نہیں ہوں کہ ڈرانے والا ہوں اور ایمان لانے والوں کو بشارت دینے والا ہوں۔)

نیز یہ بھی ارشاد فرمایا:

قُلْ إِنِّي لَا أَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا رَشَدًا (٧٢ : ٢١)

(کہہ دیجئے کہ میں تمہارے لئے نہ کسی نقصان کی طاقت رکھتا ہوں نہ کسی ہدایت کی۔)

اس مسئلہ کو ہم بار بار تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔ یہاں ہم اس موضوع کا مندرجہ ذیل مسائل کی صورت میں خلاصہ بیان کرتے ہیں۔

(۱) خداوند تعالیٰ نے ہر چیز کو پورے کمال کے ساتھ پیدا کیا اور اسے ایسے نظام و قوانین سے مربوط کیا ہے جس میں نہ کمی بیشی ہو سکتی ہے نہ خلل پڑ سکتا ہے۔ اس کے قوانین مقرر ہیں جن کے ذریعے اسباب، مسبباب سے وابستہ ہیں۔ اس کی تمام ادنیٰ اور اعلیٰ مخلوق اس کے اسماء حسنہ اور اعلیٰ صفات کی مظہر ہیں۔ اس لئے حجۃ الاسلام امام غزالی نے کہا ہے کہ جو کچھ پیدا ہو چکا ہے اس سے بہتر پیدا ہونا ناممکن ہے۔ لہٰذا کائنات کا یہ باقاعدہ نظام فطری جو عقل و حواس اور قرآنی تعلیمات سے ثابت ہے زمین اور آسمانوں کے پیدا کرنے والے کی وحدانیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (پ۱۷:۲۲)

(اگر آسمان اور زمین میں خدا کے سوا دوسرے دیوتا ہوتے تو آسمان اور زمین میں خرابی ہو جاتی۔)

(۲) آفرینش میں نئی نئی تخلیقات اور نظام حرکت و سکون نیز تحلیل و ترکیب کے قوانین کا مکمل علم خدائے عزوجل کے علاوہ اور کسی کو نہیں ہے۔ اس بارے میں انسانوں کا جس قدر غور و فکر، عملی تجربہ اور استعمال بڑھتا جاتا ہے، اسی قدر انہیں اس کے ایسے اسرار و عجائب اور منافع کا علم ہو رہا ہے جو ان کے خیال و گمان میں بھی نہیں تھے۔ ہم بچشم خود مشاہدہ کر رہے ہیں کہ تجارتی اور جنگی جہاز فضاء میں اڑ رہے ہیں، ممکن ہے وہ منطقۂ ہوا سے اوپر بھی نکل جائیں۔ بحری کشتیاں اور جہاز سمندروں کے بھنور میں غوطہ لگا رہے ہیں۔ مختلف ممالک میں بیٹھے ہوئے ہم ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہیں۔ جیسے قرآن کریم نے بتایا ہے کہ جنت کے رہنے والے دوزخ کے رہنے والوں سے باتیں کریں گے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ مشرق والے اہل مغرب کی اور جنوب والے شمال والوں کی گفتگو، ان کی تقریریں اور گانے، ان لوگوں سے پہلے جو اس شہر اور مقام کے، جہاں سے گفتگو شروع ہوئی ہے، باشندے ہیں، سن سکتے ہیں۔ معاملہ اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ براعظم یورپ میں کوئی آدمی بجلی کا ایک بٹن

دبا دیتا ہے تو فوراً دوسرے براعظم میں بڑی بڑی مشینیں چلنی شروع ہو جاتی ہیں۔ حالانکہ دونوں علاقوں کے درمیان بڑے بڑے ریگستان، بیابان، سر بفلک پہاڑ اور وسیع سمندر حائل ہیں۔ جو لوگ خدا کے ان فطری قوانین سے ناواقف ہیں، وہ لوگ جلب منفعت اور دفع ضرر کے اسباب کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ کیونکہ جہالت نے ان پر قدرتی اسباب کے راستے بند کر دیئے ہیں۔ اس لئے وہ مشہور یا گمنام بزرگوں کے مزارات کی پناہ حاصل کرتے ہیں تاکہ وہ ان کی مرادیں پوری کریں اور ان کے بیماروں کو شفا دیں اور ان کے دشمنوں کے خلاف ان کی مدد کریں بلکہ ان کے ان دوستوں سے بھی انتقام لیں، جنہوں نے ان کے ساتھ بغاوت اور سرکشی اختیار کر رکھی ہے۔ جیسے بیوی، شوہر، رشتہ دار، پڑوسی اور ہم وطن۔ مگر ان کی حالت یہ ہے کہ ان کے مذہب اور وطن کے اجنبی دشمن ان پر حکومت کر رہے ہیں۔ انہوں نے ان کی قوم کو ذلیل بنا رکھا ہے اور ان کی دولت چھین لی ہے۔ مگر ان اولیاء اللہ سے یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ مسلمانوں کے نقصانات اور ذلت کو دور کر سکیں۔

(۳) اصل طریقہ یہ ہے کہ دنیا میں جو واقعہ پیش آئے اسے خدا کے فطری قوانین اور قدرتی اسباب کے نظام کے مطابق ہونا چاہئے۔ خدائی وحی نے ہمیں بتایا ہے کہ خدا کے نظام میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ اس لئے اس قدرتی اور فطری نظام کے خلاف رونما ہونے والے واقعہ کی خبر بنیادی طور پر جھوٹی ہوگی۔ اس خبر کو یا تو راوی نے خود گھڑا ہے یا اس بارے میں دھوکا اور غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ لیکن اگر واقعی کوئی ایسا واقعہ رونما ہوا ہے تو ضرور اس میں کوئی پوشیدہ راز ہوگا۔ جس سے راوی ناواقف ہوگا۔ جیسا کہ علمائے اصول نے خبر کی بحث میں تحقیق کر کے فیصلہ کیا ہے۔

(۴) خدا کے وہ معجزات جو خدا کے حکیمانہ قوانین کے خلاف نمودار ہوتے ہیں ان کا علم قطعی دلائل کے سوا اور کسی طرح ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ خدا نے اپنی حکمت کاملہ سے بعض پیغمبروں کو معجزات عطا فرمائے تاکہ مخالفوں پر حجت قائم ہو اور انہیں ڈرایا جا سکے۔ مگر اس قسم کے معجزات کا سلسلہ حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے بعد ختم ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ پر نبوت و رسالت کا خاتمہ ہے اور خدا نے آپ ﷺ پر جو وحی نازل فرمائی وہ ایک مستقل اور عالمگیر اسلامی معجزہ ہے جو اس

وقت تک تمام انسانوں کی ہدایت کا ذریعہ بنا رہے گا جب تک انسان اس دنیا میں باقی رہیں گے۔ اسی وجہ سے یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (۲۱:۱۰۷)

(ہم نے تمہیں تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا۔)

کیونکہ خداوند تعالیٰ بخوبی جانتا ہے کہ انسانوں کو اس وحی کے بعد اور کسی وحی کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ بلکہ قرآن کریم کے علاوہ اسے خدائی وحی ثابت کرنے کے لئے کسی اور معجزہ کی ضرورت نہ ہوگی۔ کیونکہ قرآن کریم خود اپنے لئے ایک زندہ اور دائمی معجزہ ہے۔ چنانچہ اس کتاب میں قرآن کریم کے خدائی وحی ہونے پر پوری تفصیلات کے ساتھ عقلی دلائل موجود ہیں۔ جن میں سے اکثر ہم بیان کر رہے ہیں اور مزید وضاحت بھی آگے چل کر کریں گے۔

باب، بہاء اللہ اور مرزا غلام احمد قادیانی نے گزشتہ دو صدیوں میں نبوت کے دعوے کئے۔ مگر مسلیمہ کذاب سے بھی بدتر باتیں پیش کرسکے۔ ہم اس کتاب کے دوسرے حصے میں انسانی شیطانی وحی کے کچھ نمونے پیش کریں گے جو عقلمندوں کے لئے عبرت کا باعث ہوں گے۔

(۵) ختم نبوت سے معجزات کا خاتمہ :

اگر قرآن کریم اور محمد ﷺ کے بعد بھی انسانوں کو نشانیوں کی ضرورت ہوئی۔ جیسا کہ کرامات کے شیدائی اور نئے نئے مذہب اور فرقوں کے موجد دعویٰ کرتے ہیں تو ختم نبوت کی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ مگر بعض روحانی صوفیائے کرام اس معاملہ میں اس حد تک بڑھ گئے ہیں کہ انہیں ختم نبوت کے معاملے میں شک و شبہ پیدا ہو گیا۔ پہلے انہوں نے یا تو اس سے انکار کیا یا اس کی تاویل کرنے لگے کیونکہ وہ ایک خاص قسم کی نبوت کے دعویدار بھی بن گئے تھے۔ بعض نے ایک خاص قسم کی نبوت کے لئے نیا نام بھی گھڑا جیسے ظلی نبوت کہنے لگے۔ چنانچہ اس فتنے میں بابی اور بہائی فرقہ کے لوگ مبتلا ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہ باب اور بہا کی پرستش بھی کرنے لگے، کیونکہ ان دونوں نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ غلام احمد قادیانی بھی اس فتنے میں مبتلا ہوا۔ اس نے پیغمبر اور مسیح دونوں کا اپنے لئے

اور اپنے خلفاء کے لئے دعویٰ کیا۔ یہ فتنہ اس قدر بڑھا کہ معمولی لوگوں نے اسے ذریعہ معاش بنالیا (ایک ملحد ابن سجین لعنت اللہ علیہ کا یہ قول ہے کہ آمنہ کے بیٹے (حضرت محمد ﷺ) نے لانبی بعدی کہہ کر وسیع راستے میں رکاوٹ ڈال دی)۔

ہمارے استاد شیخ محمد عبدہ نے اپنے رسالہ "توحید" میں بیان کیا ہے کہ جس طرح انسانی افراد بچپن سے جوانی اور پھر ادھیڑ عمر تک پہنچتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی عقل پختہ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح قوموں نے بھی عقل و ادراک میں بتدریج ترقی کی ہے اور اسی ترقی کے ساتھ ساتھ ان کے مذہبی قوانین بھی ترقی کرتے چلے گئے ہیں۔ اب انسانی عقل نے اس حد تک ترقی کرلی تھی کہ وہ اس اعلیٰ عقلی ہدایت (قرآن کریم) کو سمجھنے لگی تھی۔ حالانکہ پہلی قوموں کو وحی کا یقین دلانے کے لئے اس کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ ایسی نشانیاں ظاہر کی جاتیں جو ان کے ہوش و حواس کو مدہوش کردیں اور کائنات کے معجزوں کے ذریعے ان کی عقل کو حیران کر دیا جائے۔ (مگر قرآن کے زمانے میں قوموں کی بڑی تعداد میں عقلی اور روحانی صلاحیت پیدا ہو چکی تھی)۔

رسالت کی ضرورت بیان کرتے ہوئے استاد موصوف نے یہ واضح کیا ہے کہ انسانی عقل کی سربلندی اور اس کائنات کی طاقتوں پر اس کا زبردست اقتدار جو اس کی تابع ہے۔ انسان کو اس بات سے روکتا ہے کہ وہ کائنات کی کسی چیز کے آگے سر جھکائے وہ اسی کے آگے سر جھکاتا ہے، جس کی حقیقت سمجھنے سے اس کی عقل عاجز ہوتی ہے۔ اس وقت اسے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ چیز ضرور اس اعلیٰ غیبی طاقت کا کرشمہ ہے جو تمام کائنات کے نظام کا باعث ہے اور اس کے لئے قدرتی اسباب مہیا کرتی ہے۔ لہٰذا یہ خداوند تعالیٰ کی بڑی ہی رحمت تھی کہ وہ انسان کے پاس اس کے کمزور ترین سمت سے آیا۔ وہ رخ اس کی اطاعت اور عاجزی کا رخ تھا۔ لہٰذا اس نے انسانی افراد ہی میں سے رہبر اور ہدایت کرنے والے انتخاب کئے اور انہیں ایسی خصوصیتیں عطا فرمائیں جن میں ان کا کوئی شریک نہیں تھا۔ پھر انسانوں کو نبوت کا مکمل قائل کرنے کے لئے ان پیغمبروں کو ایسے حیرت انگیز معجزات دیئے جو دلوں کو قابو میں کر لیتے اور عقلوں پر چھا جاتے تھے۔ ان کے سامنے سرکش جھک گئے۔ ہٹ دھرم اپنی ضد سے باز آئے اور جب ان سے عقل کا تصادم ہوا تو اس کے ہوش ٹھکانے آگئے۔ جاہلوں کی آنکھیں انہیں دیکھ کر خیرہ ہو گئیں۔ اور ان کی گمراہی دور ہو گئی۔

آگے چل کر استاد موصوف حضرت محمد ﷺ کی رسالت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ ایسے پیغمبر تھے جس نے گزشتہ پیغمبروں کی تصدیق کی۔ مگر آپ ﷺ نے اپنی پیغمبری کا یقین دلانے کے لئے نہ تو لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کیا اور نہ ان کے ہوش و حواس کو حیرت میں ڈالا۔ اور نہ انہیں مدہوش کیا بلکہ ہر طاقت سے اس عمل کا مطالبہ کیا جس کے لئے وہ مخصوص ہے۔ آپ ﷺ نے خصوصیت کے ساتھ عقل کو مخاطب کیا اور حق و باطل کے فیصلے کے لئے اس کے معیار کو تسلیم کیا۔ اس کے بعد قوت گویائی، زور بلاغت، معقول دلائل کو حجت اور صداقت کی نشانی قرار دیا۔ یہ وہ صداقت ہے جس کے بارے میں یہ فرمایا گیا ہے:

لَّا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِۦ ۖ تَنزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ﴿٤٢﴾ (۴۱: ۴۲)

(جھوٹ نہ تو اس کے سامنے اور نہ پیچھے سے نمودار ہو سکتا ہے۔ یہ حکمت والے پسندیدہ خدا کی وحی ہے۔)

(۶) معجزہ کا قرآن سے ثبوت:

موجودہ زمانے میں قرآن کریم کے علاوہ اور کوئی ایسا ثبوت موجود نہیں ہے جس کے ذریعے پیغمبروں کے معجزات اس طرح ثابت کئے جا سکیں کہ اہل عقل اس کی تردید نہ کر سکیں۔ اسلام سے پہلے مذاہب کی کتابوں میں جتنے معجزات بیان کئے گئے ہیں یہاں تک کہ یہود و نصاریٰ کی کتابوں میں بھی جو لکھا گیا ہے اور ان کی تواریخ میں جو بیان کیا گیا ہے ان کا خود ان کے علماء انکار کرتے ہیں، کیونکہ اول تو وہ خبر متواتر نہیں ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان معجزات کا خلاف عادت ہونا بھی مشتبہ ہے اور ان پر پیغمبروں کی نبوت کا دارومدار نہیں ہو سکتا۔

ان لوگوں کے دلائل یہ ہیں کہ خبر متواتر سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے اور خبر متواتر کی تعریف یہ ہے کہ کسی خبر کو اتنی بڑی جماعت بیان کرے کہ جھوٹ پر ان سب کا متفق ہونا مشکل معلوم ہو اور جس بات کی یہ لوگ خبر دیں اسے انہوں نے اپنے حواس کے ذریعے معلوم کیا ہو اور ہر زمانے اور ہر نسل کی ایک ایسی بڑی تعداد مسلسل اور لگاتار اس کی روایت کرتی چلی آئے۔ ان سب کی صداقت چند باتوں سے معلوم کی جا سکتی ہے۔ جن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ خبر کا مضمون ایسا ہو جس پر ان کی جانبداری کا شبہ نہ ہو اور وہ

اس میں ایک دوسرے کی تقلید نہ کرتے ہوں۔ اسی تواتر کے صحیح ہونے کی نشانی یہ ہے کہ اس کے ذریعے یقینی علم حاصل ہو۔ جس سے دل کو اطمینان ہو جائے اور اعتقاد و ضمیر اسے مسترد نہ کر سکے۔ ان کے خیال میں یہ تمام باتیں گزشتہ پیغمبروں کے معجزات پر صادق نہیں آتی ہیں، بلکہ بعض مغربی علماء کا یہ خیال ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا قصہ بناوٹی اور خیالی ہے، حقیقت اور واقعہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ ایسے قصے تاریخ میں بہت پائے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں حضرت مسیح علیہ السلام کے معجزات پر جو شبہات ظاہر کئے گئے ہیں، ان کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ دوسری بات پر ان کا شبہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا خلاف عادت معجزات سے ان کی نبوت نہیں ثابت ہو سکتی۔ جیسا کہ ہم نے فصل دوم کے آخر میں معجزات کے بیان میں ذکر کیا ہے۔

بہر حال قرآن کریم کا معجزہ قیامت تک باقی رہے گا۔ ہر وہ شخص جس نے اسلامی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے یہ جانتا ہے کہ قرآن کریم پر خبر متواتر کی تعریف پوری پوری صادق آتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے لے کر آج تک مسلمانوں کی تمام نسلیں اور قومیں ہر زمانے میں اسے پڑھتی اور بیان کرتی چلی آئی ہیں۔ اس حقیقت کو سب جانتے ہیں، مگر مغرب کے بہت سے افراد جو بات سمجھ نہیں سکے ہیں، وہ قرآن کریم کے اعجاز بیانی کے ایسے دلائل ہیں جن کی بدولت اسے خدا کی وحی ثابت کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ہم نے ان کے شبہات کی تشریح کر کے اس کتاب میں ان کی تردید بھی کر دی ہے۔ جب یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ گئی ہے کہ قرآن کریم وحی الٰہی ہے تو ایسی حالت میں قرآن کریم کے مذکورہ معجزات پر ایمان لانا بھی ضروری ہو گیا۔ خواہ اس سے پیغمبروں کی تائید و ثبوت حاصل ہوتا ہو یا نہیں اور جیسا کہ ہر مومن پر یہ فرض ہے کہ وہ ان پر ایمان لائے، اسی طرح اس پر یہ بھی فرض ہے کہ وہ ختم نبوت کے بعد پیغمبروں کے معجزات کے بند ہونے پر بھی یقین رکھے۔

کسی مسلمان کے لئے یہ یقین کرنا ضروری نہیں ہے کہ محمد خاتم النبیین ﷺ کے بعد کوئی خلاف عادت کائناتی کرامت واقع ہوئی ہے۔ اسی طرح دوسرے بڑے بڑے علماء اور حکماء کی طرح یہ بات تسلیم کرنے سے اس کے دین کو نقصان نہیں پہنچ سکتا کہ تمام قوموں میں خلاف عادت اور خلاف معمول واقعات کے جو دعوے کئے جاتے ہیں ان

میں سے اکثر جھوٹے ہیں۔ البتہ کچھ واقعات علمی مہارت یا نفسیاتی تاثیر اور ساحرانہ شعبدہ بازی کا نتیجہ ہیں۔ ان میں سے بہت کم واقعات ایسے ہیں جو اعلیٰ انسانوں کے روحانی فیض کا نتیجہ ہو سکتے ہیں۔ ان کی شناخت یہ ہو گی کہ ایسے واقعات صحیح علم پر مبنی ہوں، مذہبی اصول اور عقل کے مطابق ہوں یا وہ کوئی جائز اور مفید کام ہوں اور اس کا کرنے والا مومن، عاقل اور تندرست ہو۔ ان سب باتوں کے برخلاف صوفیہ حضرات جو واقعات عوام کے مذہب اور صحت کے برخلاف بیان کرتے ہیں، وہ اگر صحیح بھی ہوں تو وہ خبیث روحوں کی تاثیر کا نتیجہ ہیں۔ جیسے نظر بد، مسمریزم وغیرہ۔

(۷) صریح قرآنی آیات سے پیغمبروں کے جو معجزات ثابت ہیں، ان کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ ایسی آیات کی، جن کی عبارت بالکل صاف اور واضح ہے، عربی زبان کے مفہوم کے خلاف زبردستی اس طرح تاویل کرنا جن سے کسی اسلامی اصول کی تردید ہوتی ہو، اسلام سے روگردانی ہے۔ مگر جن آیات کا ظاہری مفہوم غیر یقینی ہے، انہیں ان کے ظاہری الفاظ کے مطابق ہی سمجھنا چاہئے۔ بشرطیکہ کوئی اس جیسی یا اس سے زبردست عبارت یا دلیل اس کی مخالفت میں نہ ہو۔ ایسی صورت میں ان دونوں متضاد باتوں میں مشہور دلائل کے مطابق ترجیح دی جائے گی۔ اس مناسب طریقہ کو چھوڑنا بدعت کے مترادف ہو گا۔

تقدیر اور خدائی قوانین پر ایمان:

ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت و ارادہ، اختیار اور حکمت سے ہر چیز کا خالق ہے۔ جیسا کہ اس نے سورۂ الم السجدہ میں فرمایا۔ "اس نے ہر چیز کو اچھی طرح پیدا کیا۔" نیز سورۂ النمل میں بھی فرمایا:

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ (۲۷:۸۸)

(یہ خدا کی کاریگری ہے۔ جس نے ہر چیز کو کمال کے ساتھ بنایا۔)

اس کی پیدائش میں نہ کوئی فرق ہے اور نہ خرابی، جیسا کہ اس نے سورہ الملک میں فرمایا ہے۔ اس نے ہر چیز کو خاص نظام اور تناسب سے پیدا کیا ہے۔ یونہی بے سوچے سمجھے اور اٹکل پچو نہیں پیدا کیا۔ جیسا کہ اس نے سورۃ القمر میں فرمایا ہے:

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ ﴿٤٩﴾ (۵۴:۴۹)

(ہم نے ہر چیز کو اندازہ کے ساتھ پیدا کیا۔)

نیز سورہ فرقان میں فرمایا:

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا ﴿٢﴾ (۲۵:۲)

(اس نے ہر چیز کو پیدا کر کے اس کا اچھی طرح اندازہ مقرر کیا۔)

سورہ حجر میں ارشاد ہے:

أَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَوْزُونٍ ﴿١٩﴾ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ ﴿٢٠﴾ وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَعْلُومٍ ﴿٢١﴾ (۱۵:۱۹:۲۱)

(یہاں ہم نے ہر موزوں چیز اگائی اور ہم نے اس میں تمہارے لئے ذریعہ معاش مقرر کئے اور تم اس کو رزق دینے والے نہیں ہو۔ ہر چیز کے ہمارے پاس خزانے موجود ہیں۔ ہم اسے مقررہ اندازے کے مطابق ہی اتارتے ہیں۔)

ہمارا ایمان ہے کہ تکوین و آفرینش میں اور نظام اجتماع میں جس کی طرف خدا نے انسان کی رہنمائی کی ہے، خدا کے طریقے اور قوانین باقاعدہ مقرر ہیں۔ ان میں اسباب اپنے مسببات سے وابستہ ہیں اور کسی آدمی کی خاطر ان میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا بلکہ خدائی قوانین، عالم مادیات اور روحانیت میں یکساں نافذ ہیں۔ ان کا ذکر "اجتماعی سنتوں" کے نام سے سورۂ مائدہ، انفال، الحجر، کہف، احزاب، فاطر، مومن اور فتح میں آیا ہے۔

ان واضح آیات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قدر و تقدیر سے مراد مخلوق کا وہ عالمگیر نظام ہے جس میں خالق کے مقرر کردہ فطری قوانین کے مطابق ایسے اسباب کے اندازے سے اشیاء کا وجود ہوتا ہے۔ اس کا مطلب وہ نہیں ہے جو عام لوگوں میں مشہور ہے کہ مقدر اسے کہتے ہیں جس میں کوئی سبب نہ ہو یا جسے خدا مقررہ نظام اور فطری قوانین کے خلاف نافذ کرے اور کبھی اس کا اطلاق ان واقعات پر کیا جاتا ہے جن کا سبب معلوم نہ ہو اور ان کا سوائے خدا کے جو ان کا خالق اور مسبب الاسباب ہے اور کسی کو علم نہیں ہوتا۔

ہمارا ایمان ہے کہ تخلیق کائنات میں اللہ تعالیٰ کی کھلی نشانیاں ہیں اور ان نشانیوں میں ان کی کھلی یا چھپی ہوئی حکمتیں ہیں۔ ہمیں اس نے جو عقل اور شریعت عطا فرمائی ہے، دونوں کا یہ تقاضا ہے کہ ہم مذکورہ بالا نظام تقدیر اور قوانین تدبیر کے خلاف کسی بات

کے وقوع کو اس وقت تک نہ قبول کریں، جب تک کوئی ایسی قطعی دلیل نہ موجود ہو۔ جس کے ثبوت و تحقیق میں عقل کے ساتھ حواس بھی شریک ہوں۔ نیز یہ بھی ضروری ہے کہ ایسے واقعہ میں خدا کی کوئی حکمت ضرور مضمر ہوگی۔ ورنہ کوئی ایسا واقعہ بے فائدہ کسی خلل کی وجہ سے نمودار نہیں ہوسکتا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ خدا کی وہ حکمت ہم سے پوشیدہ ہو جس طرح ہمیں مخلوقات کی بہت سی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ تاہم جو ہمیں نہیں معلوم ہے، اسے معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ تاکہ ہمارا علم بڑھے اور جہاں تک ممکن ہو، ہم کمال حاصل کریں۔ مگر اپنی ناواقفیت اور جہالت کو کفر و انکار کا ثبوت نہ بنالیں۔ چنانچہ ہر زمانے میں جو سب سے بڑے عالم گذرے ہیں، وہ بھی یہ اقرار کرتے ہیں کہ اس کائنات کا، جس قدر انہیں علم ہے، وہ اس سے بہت کم ہے جو انہیں نہیں معلوم ہے اور یہ ناممکن ہے کہ انسان کائنات کا پورا علم حاصل کرسکے۔

موجودہ زمانے کے مادی علماء کا اپنے اس عجز پر اتفاق ہے۔ حالانکہ وہ مادہ اور اس کی سائنس کا وسیع علم رکھتے ہیں اور انہوں نے بہت سی صنعتی اشیاء ایجاد کر کے کائنات کو مسخر کرلیا ہے۔ ایسی حالت میں عالم ارواح و غیب کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ان میں تو وہی پہلے جیسی حالت ہے اور وہ خداوند تعالیٰ کے اس قول کے مصداق ہیں۔

وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ ۖ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَآ أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٨٥﴾

(۸۵:۱۷)

(وہ روح کے بارے میں تم سے سوال کرتے ہیں، کہہ دو کہ روح میرے خدا کے حکم سے ہے، تمہیں اس کا علم بہت تھوڑا دیا گیا ہے۔)

ہمارا یہ بھی ایمان ہے کہ خداوند تعالیٰ نے انسانوں کی طرف پیغمبر بھیجے، جنہوں نے خدائی نشانیوں کے ذریعے ان کی ہدایت کی تاکہ وہ حواس اور ذہن کے ابتدائی تصور کے تنگ دائرے سے نکل کر عالم غیب کے وسیع دائرے تک پہنچ سکیں۔ اگر وہ ہدایت کا کام انجام دیتے، تو انسان لاکھوں برس تک ان تمام چیزوں کا انکار کرتے رہتے، جنہیں وہ اپنے مادی حواس سے نہیں معلوم کرسکتے تھے اور جن چیزوں سے وہ ناواقف تھے، انہیں اپنی معلوم اشیاء ہی پر قیاس کرتے رہتے کیونکہ انسان جس چیز کا انکار کرتا ہے اس کے وجود کو محال سمجھتا ہے۔ پھر وہ اس کی تحقیق نہیں کرتا۔

معجزات سے سائنس کا وجود:

تاریخ سے ہمیں معلوم ہوا کہ اللہ پر، پیغمبروں کی نشانیوں پر، روز آخرت پر اور اعمال کے حساب اور سزا اور جزا پر ایمان ہی نے انسانی عقل کو آمادہ کیا کہ وہ کائنات کے اسرار کو معلوم کرے۔ اسی تحقیق کا نتیجہ ہے کہ انسان نے علوم و فنون اور صنعتوں میں مختلف نسلوں اور زمانوں میں اس قدر ترقی کی۔ اس ترقی میں غیب پر ایمان نہ رکھنے والوں کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ کیونکہ غیب کے مذکورہ بالا تینوں ارکان پر ایمان ہی نے انسان پر ان علوم واعمال کے دروازے کھول دیئے ہیں جنہیں منکرین غیب ہی کی طرح عقلی طور پر ہم ممکن سمجھتے ہیں۔ اب تک جتنی ترقیاں ہو چکی ہیں ان کے بعد غیب کی کوئی خبر بھی عقل سے بعید نہیں رہی۔

معجزات کے فوائد:

ان تفصیلات اور ان سے پہلے کی باتوں سے یہ معلوم ہو گیا کہ پیغمبروں کے معجزات سے انسان کو تین فوائد حاصل ہوئے جو حکمت الٰہی کے پیش نظر تھے۔

(۱) یہ معجزات اس بات کا محسوس ثبوت ہیں کہ خداوند تعالیٰ اپنے تمام کاموں میں بااختیار ہے بلکہ کائنات کا تمام نظام اس کے ماتحت ہے۔ نظام کائنات اس پر حاکم نہیں ہے اور نہ وہ خدا کے ارادہ اور قدرت کو پابند کر سکتا ہے۔

(۲) یہ معجزات ثابت کرتے ہیں کہ اس کے پیغمبر اس کی وحی کے مطابق صحیح خبر دیتے ہیں اور یہ وحی ان کے دشمن کافروں کے لئے سخت تنبیہ ہے، کیونکہ اگر یہ معجزات ایسے ہوتے جنہیں دوسرے انسان بھی اپنی قابلیت اور صلاحیت کی وجہ سے پیش کر سکتے تو یہ معجزات پیغمبروں کی صداقت کا ثبوت نہیں بن سکتے تھے۔

(۳) ان معجزات کو دیکھ کر انسانی عقل کو یہ معلوم ہو گیا کہ ممکنات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور معقولات کا دائرہ بہت تنگ ہے۔ لہٰذا اگر کوئی چیز معمولی اسباب اور مشہور فطری قوانین کے مطابق نہ ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ محال ہے اور عقل اس کے وقوع کا یقین نہیں کر سکتی۔ ایسے موقع پر ایسی خبر سنانے والے کی تکذیب نہیں کرنی چاہئے جبکہ اس کی سچائی کا ثبوت موجود ہو بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ کہنا چاہئے کہ ایسی

خبر کو ثابت نہیں سمجھا جاسکتا جب تک صحیح دلیل سے اس کا ثبوت نہ مل جائے۔ موجودہ زمانے کے سائنس دانوں کا بھی یہی اصول ہے۔ مگران کی علمی تکمیل میں یہ کمی رہ گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس معجزے کو سمجھ نہ سکے۔ جس کا سبب نظام کائنات اور اس کے مقررہ اسباب میں موجود نہیں ہے۔ پیغمبروں کے معجزات کے منکر مادہ پرست علماء کو ایسا معجزہ مادی دنیا میں نہیں ملے گا۔ صرف قرآن کریم ہی میں انہیں ایسا معجزہ نظر آئے گا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مادی دنیا میں جو کچھ ہے وہ اس کے ماتحت ہے جسے ان کی اصطلاح میں اسباب اور قوانین فطرت کہا جاتا ہے اور قرآن کریم کی زبان میں انہیں سنت الٰہی اور تقدیر کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ (جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا ہے۔) اسی وجہ سے یہ دیکھا گیا ہے کہ وہ روز اول میں "موجود اول" کے بارے میں مادی تخیلات کے ساتھ تحقیق کرتے ہیں۔ قدیم فلسفی اسے عقلی دلائل سے معلوم کرتے تھے۔ حالانکہ وہ موجود اول صرف خداوند واجب الوجود ہے۔ جس کے ذریعے اس کے علاوہ تمام کائنات کی تخلیق ہوئی۔ انہیں یہ نہیں معلوم کہ سب سی پہلی چیز جو اس نے پیدا کی اسے اس نے محض اپنی قدرت اور ارادے سے پیدا کیا۔ یعنی ہمارے نزدیک وہ کلمہ "کُنْ" سے پیدا ہوئی۔ خدا نے کہا "کُنْ فَیَکُوْن" (ہوجا اور وہ ہوگئی)۔ یہ تمام غیبی باتوں کا سرچشمہ یا "غیب الغیوب" ہے۔ تاہم ان مغربی علماء میں سے بعض کا یہ خیال ہے کہ خدا کی حقیقت کو معلوم کرنا بہت مشکل ہے۔ تاہم بعض حقیقت کی تلاش میں ہیں اور اس بارے میں پرامید ہیں۔

سائنس دانوں کی سرکشی:

لیکن اب یہ معاملہ الٹا ہوگیا ہے۔ اکثر افراد نے یہ علوم (سائنس) سیکھے ہیں۔ جن کی بدولت پیغمبروں کے معجزے اور ان کے ایمان بالغیب کی تعلیمات آسانی سے سمجھ میں آنے لگی ہے۔ مگر اب یہی علوم ان چیزوں سے انکار کا سبب بن گئے ہیں۔ حالانکہ اسی ایمانی جذبے نے انہیں ان علوم تک پہنچایا۔ لیکن اس سائنس کی رو سے اب ان کا انکار کیا جارہا ہے۔ یہ انکارِ غیب ہے، امکان کا انکار نہیں ہے بلکہ اس کے وقوع سے انکار ہے۔ انہیں اس بات سے انکار ہے کہ خدا نے ایسے عجائبات دکھائے ہوں جیسے عجائبات وہ اب دکھانا چاہتے

ہیں۔ حالانکہ انہیں چاہئے تھا کہ وہ اپنی اس قابلیت کو خدائی معجزات کا ثبوت اور ان کی صداقت کی دلیل سمجھتے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱: ۵۳)

(عنقریب انہیں ہم اپنی نشانیاں آفاق عالم میں اور خود ان کی ذات میں بھی دکھائیں گے۔ یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ (قرآن کریم) حق ہے۔)

لیکن خدا جب انہیں اپنی کوئی روحانی نشانی خود ان کے اپنے اندر یا کائناتی نشانی آفاق میں دکھاتا ہے تو وہ اسے قانون قدرت قرار دیتے ہیں یا معلوم پر نامعلوم کو قیاس کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ اس نشانی کو محض قدرت الٰہی کا کرشمہ نہیں تسلیم کرتے اور بدستور شک و شبہ میں پڑے رہتے ہیں۔ ان کی حالت ایسی ہے جیسے کفار مکہ کی تھی جب انہوں نے محمد ﷺ سے مطالبہ کیا کہ وہ ان پر فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجے۔ اس پر خدا نے فرمایا تھا:

وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِم مَّا يَلْبِسُونَ ۝ (۹:۶)

(اگر ہم اپنے رسول کو فرشتہ بناتے تو فرشتے کو بھی آدمی کی صورت میں بناتے۔ اس طرح یہ لوگ بدستور شک و شبہ میں پڑے رہتے۔)

یہ صورت اس لئے پیش آئی کہ آدمی فرشتے کو نہیں دیکھ سکتے تھے اور نہ اس سے تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ جب تک وہ انہی کی طرح آدمی کی شکل میں نہ موجود ہو۔ مگر انہیں یہ ناپسند ہے کہ رسول ان جیسے بشر ہوں۔ لہٰذا خدا فرشتہ کو بھی پیغمبر بنا کر انسان کی شکل میں نازل فرماتا تو اس حالت میں بھی انہیں وہی شک پیدا ہو جاتا جس میں وہ انسانی پیغمبر کی وجہ سے مبتلا ہیں۔

یہی حالت آج کل کے لوگوں کی ہے۔ موجودہ زمانے میں مکاشفہ کے ذریعے اور تاثیر مادہ کی صورت میں متعدد روحانی نشانیاں ظاہر ہوئی ہیں۔ مگر انہوں نے انہیں اپنی جانی پہچانی مادی چیزوں کے مشابہ قرار دیا۔ بلکہ وہ ان مکاشفات کو "افکار خوانی" اور انتقال افکار کی اعلیٰ قسم قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ اس قسم کی چیز ہے جیسے بجلی کے ذریعے ایک مقام سے دوسری جگہ گفتگو کی جائے۔ ایسی باتیں وہ اس لئے کرتے ہیں تاکہ انہیں یہ نہ ماننا پڑے کہ یہ خالق کی پیدا کردہ غیبی نشانیاں ہیں جن کا ان کے علم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بہرحال وہ مادی اسباب میں ترقی کرتے گئے، یہاں تک کہ انہوں نے مثبت و منفی بجلی

کی ظاہری ترکیب دے کر ایسی چیز تیار کی ہے جسے وہ الیکٹران و پروٹان کے نام سے موسوم کرتے ہیں جو عالم غیب کی سطح کے قریب ہے، ان کا خیال ہے کہ یہ موجودہ دنیا کی ہر چیز کی اصل بنیاد ہے، حالانکہ بجلی نہ تو خالص مادہ ہے اور نہ خالص قوت ہے بلکہ وہ ایسی چیز ہے جو کسی نہ کسی طرح ان کے علم میں آگئی۔ بہر حال وہ بھی سرکش لوگ ہیں جو کسی چیز پر عبادت کی حیثیت سے اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک انہیں ایسا معجزہ نہ دکھایا جائے جو ان کی عقل و علم سے بالاتر ہو۔

علمی ترقی سے انسانیت کو خطرہ:

چونکہ یہ سائنس دان خدا کی ایسی نشانیوں پر ایمان نہیں رکھتے، اس لئے انسانیت کو عصر حاضر کی ان ترقیوں کا یہ ثمرہ ملا ہے کہ اس کی بدبختیوں میں اضافہ ہوگیا ہے۔ چنانچہ اب موجودہ تمدن کو روز بروز یہ خطرہ لاحق ہوگیا ہے کہ کہیں انہی صنعتی اور علمی ترقی کے ہاتھوں وہ تباہ و برباد نہ ہو جائے۔ اب تمام اصلاح پسند رہنما، فلسفی اور سیاستدان حیران ہیں کہ کس طرح اس خطرے کو دور کیا جائے۔ حالانکہ یہ خطرہ اس وقت تک دور نہیں ہو سکتا جب تک علم اور مذہب کو ایک ساتھ جمع نہیں کیا جائے گا۔ یہی وہ چیز ہے جسے لے کر محمد خاتم النبیین ﷺ تشریف لائے اور اسی مقصد کے لئے خدا کی کتاب میں اس کی نشانیوں کو ثابت کیا گیا تھا۔ کیونکہ انسان صرف اس چیز کے آگے جھکتا ہے جو اس کی قوت سے بالاتر ہوتی ہے۔ اسی وقت وہ تسلیم کرتا ہے کہ یہ چیز اس خدا کی غیبی طاقت کا کرشمہ ہے جو اس کی طاقت سے بالاتر ہے۔ اس قسم کے دلائل اور نشانیاں کائنات کے علوم (سائنس) نہیں پیش کر سکتے۔ جیسا کہ ابھی ہم نے ان کی سرکشی کا حال بیان کیا ہے۔ لہٰذا ان کا مکمل ظہور قرآن کریم ہی میں ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کا کھلا چیلنج ہم اِس کتاب کے خاتمے میں پیش کریں گے۔

قرآن کریم کا مقصد سوم

انسانیت کی تکمیل

انسان پر وہ دور گذر چکا ہے جب مذہب کے بارے میں اس کا علم صرف اسی قدر تھا کہ وہ ایسی تعلیمات کا نام ہے جو عقل کے دائرے سے بالکل خارج ہیں۔ انسان کو ان تعلیمات کا پابند صرف اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی فطرت کو کچلا جائے، اس کو تکلیفوں میں مبتلا کیا جائے اور اس کی عقل و بصیرت کو مغلوب کیا جائے تاکہ وہ اپنے ان مذہبی پیشواؤں کی فرمانبرداری کریں جو انہیں ان تعلیمات کی تلقین کرتے ہیں۔ اگر وہ ان کے اقتدار کو تسلیم کرلیں گے تو کامیاب ہوں گے اور اگر وہ پوشیدہ یا اعلانیہ ان کی مخالفت کریں گے تو تباہ و برباد ہوجائیں گے۔ مگر اصل حقیقت یہ تھی کہ وہ اس قسم کی اطاعت و فرمانبرداری کی بدولت خسارہ میں رہے اور ان کے دانشور اور فلسفی رہنماء نہ تو انہیں ہلاکت کے گڑھے سے نکال سکے نہ انہیں شرک، ظلم و استبداد کی تاریکیوں سے نکال کر توحید، حریت، عدل اور آزادی کی روشنی میں لاسکے۔

ایسی حالت میں خداوند تعالیٰ نے حضرت محمد خاتم النبیین ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ آپ ﷺ نے انسانوں کے سامنے آیات الٰہی تلاوت کیں۔ انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دی اور انہیں اس کھلم کھلا گمراہی سے پاک و صاف کیا جس میں وہ مبتلا تھے۔ آپ ﷺ ہی انہیں تاریکی سے نکال کر روشنی میں لائے اور انہیں ذہن نشین کرایا کہ اسلام عقل و فطرت، فکر و علم، حکمت، برہان و حجت، ضمیر و وجدان، استقلال اور آزادی کا مذہب ہے۔ اس لئے کسی مخلوق خدا کو کسی انسان کی روح، عقل اور ضمیر پر تسلط اور اقتدار حاصل نہیں ہے بلکہ پیغمبر بھی صرف ہدایت و تبلیغ کے لئے آئے ہیں۔ وہ صرف خدائی بشارت دیتے اور قہر الٰہی سے انسانوں کو ڈراتے ہیں جیسا کہ اس سے پہلے مقصد میں بیان کیا جاچکا ہے۔

اب ہم اسلام کی ان خصوصیات کا قرآن کریم کے مختصر حوالوں کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔

(۱) اسلام دین فطرت ہے:

خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا‌ ؕ فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا‌ ؕ لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ‌ ؕ ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ ۙ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۙ (۳۰:۳۰)

(پھر تم مذہب پر ایک طرف ہو کر قائم ہو جاؤ، اللہ کی فطرت پر جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا۔ اللہ کی پیدائش میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہ سیدھا اور صحیح مذہب ہے۔ مگر بہت سے لوگ نہیں جانتے ہیں۔)

حنیف، حنف سے صفت کا صیغہ ہے۔ اس کا مفہوم ہے کجروی چھوڑ کر سیدھا ہونا۔ گمراہی کو چھوڑ کر ہدایت کی طرف آنا اور باطل چھوڑ کر حق کی طرف آنا۔ اس کا متضاد لفظ زیغ ہے جس کے معنی حق چھوڑ کر باطل کی طرف مائل ہونا۔

خدا کی فطرت جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، وہ انسانی جبلت ہے۔ جس میں دونوں قسم کی زندگیاں شامل ہیں۔ یعنی جسمانی حیوانی زندگی اور روحانی فرشتوں جیسی زندگی۔ اس میں مادی دنیا اور عالم غیب دونوں کو پہچاننے کی صلاحیت ہے۔ انسانی جبلت میں عام مذہب شناسی کے جذبات بھی ہیں۔ یعنی ضمیر محسوس کرتا ہے کہ اس کائنات اور قدرتی اسباب سے بالاتر جن کے ذریعے دنیا کی ہر چیز کا نظام قائم ہے، ایک غیبی طاقتور ہستی ہے جس نے آسمانوں، زمین اور ان دونوں کے درمیان ہر چیز کو پیدا کیا ہے، وہی نفع و نقصان کا سرچشمہ ہے، جن سے فطری عبادت گذاری کا شعور اور غیبی معرفت کی طلب پیدا ہوتی ہے۔

فطری عبادت:

فطری عبادت یہ ہے کہ جب انسان اپنے کسی ضروری مفاد کو اپنی قابلیت اور زور و بازو کے ذریعے حاصل کرنے سے عاجز ہو جاتا ہے یا کسی نقصان اور خطرہ کو اپنی طاقت اور قوت سے دور نہیں کر سکتا اس وقت عجز کی حالت میں اس کا ضمیر غیبی خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ یہاں انسان سے مراد نوع انسانی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی کام کسی دوسرے فرد انسانی کی مدد سے سرانجام پائے تو غیر کی یہ مدد بھی اس کی اپنی مدد اور قابلیت کا نتیجہ سمجھی جائے گی۔ اس لئے اپنے جیسے لوگوں سے مدد مانگنا عبادت کی تعریف میں شامل نہیں ہوگا۔ لہٰذا ایک فقیر کا اپنے مانگنے کے وسائل کے ذریعے کسی دولت مند کی تعظیم کرنا اور کمزور کا طاقتور سے اپنے دشمن کے خلاف امداد طلب کرنا، رعایا کا بادشاہ یا حاکم کی امید و

بیم کی وجہ سے اطاعت کرنا کسی قوم وملت کی اصطلاح میں عبادت نہیں سمجھا جائے گا۔ بلکہ فطری عبادت کی روح اور مغز یہ ہے کہ انسان کسی مافوق الفطرت، زبردست عالم بالا کی غیبی طاقت کو پکارے اور اس سے دعا مانگے وہ غیبی طاقت عالم اسباب کی جانی پہچانی چیزوں سے بلند تر ہے۔ اس لئے خصوصیت کے ساتھ عاجزی اور تکلیفوں کے موقع پر اسے ہی پکار اجاتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: الدعاء ھو العبادۃ (اسے حضرت نعمان بن بشیر سے امام احمد بن حنبل، ابن ابی شیبہ، امام بخاری نے الادب المفرد میں اور سنن اربعہ کے مؤلفوں وغیرہ نے روایت کیا۔ یعنی دعا ہی عبادت ہے۔ اس میں تخصیص وحصر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ عبادت کا سب سے بڑا رکن معنوی ہے۔ کیونکہ دعا اس کی روح ہے۔ جیسا کہ اس کی تشریح اس روایت میں کی گئی ہے۔ الدعاء مخ العبادۃ (حضرت انس سے ترمذی کی روایت) اس صاحب اقتدار غیبی بادشاہ کی تعظیم وقربت کے لئے، زبان اور عمل سے جو کوئی کام کیا جائے وہ اس کی عبادت ہوگی۔

یہ انسان کے طبعی اور دین فطرت کی صحیح وضاحت ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے جیسا کہ بعض ہم عصر انشاء پرداز لکھتے ہیں کہ مذکورہ بالا آیت کریمہ میں دین فطرت سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنی طبیعت کے تقاضوں کے مطابق اپنے احساسات، افکار اور ضمیر کی پیروی کرے اور کسی دوسرے سے کوئی چیز حاصل نہ کرے۔ اس قسم کی تشریح ایسی جہالت ہے جس کی تائید عقل اور مذہب کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ ایسی بدنظمی کا تصور ہے جس کے ہوتے ہوئے کوئی کام درست نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ انسان اپنی جہالت اور غلط فہمی کی وجہ سے اپنی فطرت، طبیعت اور ضمیر کے خلاف کام کرتا ہی رہتا ہے، بلکہ اس کے اس فطری احساس نے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، اس میں صنم پرستانہ عقائد پیدا کئے وہ ایسی ہر تاثیر والی چیز کی عبادت کرنے لگا جس کا اسے کوئی سبب نہیں معلوم ہو سکا۔ کیونکہ وہ یہ سمجھنے لگا تھا کہ یہی غیبی طاقت والی ہستی ہے اور یہی نفع نقصان کی مالک ہے۔ ایسی جہالت اور غلط فہمی کی بدولت یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کی فطرت کی وحی الٰہی سے تکمیل کی جائے۔

اسی ضرورت کی بناء پر صاحب شریعت مذہب کی بنیاد قائم ہوئی اور خدا نے اپنے پیغمبروں پر وحی نازل فرمائی تاکہ اس کے بندے اپنی غلط فہمیوں اور مذہبی احساسات کے عملی اختلافات کی بدولت گمراہ نہ ہو جائیں اور حقیقت میں ایسا ہی ہوا۔ چونکہ ایک انسان

ایسے شرعی اور تعلیمی مذہب کو اس وقت تک یقین کے ساتھ قبول نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کے پیغمبروں کو اس غیبی ہستی کی طرف سے جو تمام دنیا کا مختار کل ہے اور جس کے تابع تمام قدرتی اسباب و قوانین ہیں، مگر وہ کسی کے تابع نہیں ہے، اپنی نبوت کی تصدیق کرانے کے لئے معجزات اور نشانیاں نہ ملیں۔ خواہ وہ نشانیاں براہ راست ہوں یا بالواسطہ جیسا کہ ہم اس کی مختصر تشریح کر چکے ہیں۔ (ملاحظہ ہوں اصل کتاب کے صفحات ۸۶، ۸۷، ۹۵-۹۶) اس کی تفصیل تفسیر المنار اور رسالہ المنار میں بعنوان "اسلام دین فطرت ہے" میں بیان کی گئی ہے۔ بہر حال یہ اسلام اس لئے آیا ہے کہ علم و حکمت میں انسانی ترقی کی صلاحیت مکمل ہو اور انسان کو خدا کی معرفت حاصل ہو تاکہ آخرت میں اسے سعادت حاصل ہو سکے۔ بہر صورت اسلام کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے فطرت کا تصادم ہوتا ہو۔

خداوند تعالیٰ نے تمام قوموں کے پاس پیغمبر اس لئے بھیجے کہ خدائی مذہب ان سب خرابیوں کو دور کرے جو ان کی جہالت اور بت پرستی کی بدولت ان کی فطرت میں پیدا ہو گئی تھیں، پھر ایک دوسرے کی تقلید سے ان خرابیوں میں اضافہ ہوا، بلکہ ان قوموں کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ جب رسولوں کو آئے ہوئے کافی عرصہ گزر جاتا تھا تو وہ راہ راست سے بھٹک جاتی تھیں۔ آخرکار خدا نے دین کی تکمیل کی، جیسا کہ قرآن کریم کے مقصد اول و دوم میں اس کی تشریح بیان کی جا چکی ہے۔ (فطری مذہب کے سلسلے میں امام بخاری اور مسلم دونوں نے یہ روایت کی ہے)۔

"ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے مگر ان کے والدین اسے یہودی بنا لیتے ہیں یا عیسائی اور مجوسی بنا لیتے ہیں۔"

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس کے والدین اس کی فطری صلاحیت کو تکمیل دینے کے بجائے اسے بگڑا ہوا منسوخ دین سکھا کر اسے گمراہ کر دیتے ہیں۔

دین کی تکمیل کے بعد خدا نے اپنے بندوں پر یہ احسان کیا کہ وہ اس قرآن کریم کو تحریف و تبدیل، فراموشی اور کمی بیشی سے بچانے کا ذمہ دار ہو گیا ہے۔ جیسا کہ خود فرماتا ہے:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۝ (۱۵:۹)

ہم نے یہ ذکر (قرآن کریم) نازل فرمایا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

نیز اس نے حضرت محمد خاتم النبیین ﷺ کی امت کو اس بات سے محفوظ رکھا کہ سب کے سب گمراہ ہو جائیں، جیسا کہ پہلی قومیں گمراہ ہو گئی تھیں۔ اگرچہ رسول اللہ ﷺ نے خدائی اطلاع کے مطابق مسلمانوں کو ان کے مستقبل سے مطلع کر دیا تھا کہ وہ پہلی قوموں، یہود و نصاریٰ کے طریقوں کی پیروی کریں گے۔ (جیسا کہ پچھلے اوراق میں بیان ہو چکا ہے) تاہم اس کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ان میں سے کچھ لوگ صداقت پر باقی رہیں گے تاکہ وہ مخلوق کو خدا کا پیغام پہنچا سکیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"میری امت میں سے ایک جماعت باقی رہے گی جب تک کہ خدا کا حکم آئے وہ غالب رہے گی" (اسے حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مغیرہ بن شعبہ سے روایت کیا ہے) انہی ذرائع سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے یہ الفاظ ہیں۔ "میری امت کا ایک گروہ خدا کے حکم پر قائم رہے گا جو کوئی ان سے غداری کرے یا مخالفت کرے اس سے ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ یہاں تک کہ جب خدا کا حکم آئے گا تو وہ لوگوں پر غالب ہوں گے۔"

امام مسلم، ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ثوبان کے واسطے سے اس طرح روایت بیان کی ہے۔ "میری امت کا ایک گروہ صداقت پر قائم رہے گا جو انہیں چھوڑ کر چلا جائے۔ اس سے ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ یہاں تک کہ جب خدا کا حکم آئے گا تو وہ روز قیامت تک ایسی حالت میں ہوں گے (ہم نے اس تیسرے ایڈیشن میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ثوبان رضی اللہ عنہ کی روایت کا اس لئے اضافہ کیا ہے کہ یہ روایات حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی احادیث سے زیادہ صحیح اور واضح ہیں)۔

امام مسلم نے حضرت جابر بن سمرہ کے واسطہ سے مرفوع حدیث اس طرح روایت کی ہے "یہ مذہب (اسلام) ہمیشہ باقی رہے گا اور مسلمانوں کی ایک جماعت اس (کی حفاظت) کے لئے جنگ کرتی رہے گی۔ یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔" مختلف ضعیف واسطوں سے متعدد راویوں نے بھی اس حدیث کو بیان کیا ہے جن سے ایک دوسرے کو تقویت پہنچتی ہے۔

اِنَّ هٰذِهِ الْاُمَّةَ لَا تَجْتَمِعُ عَلَى الضَّلٰلَةِ

یہ (مسلمان) قوم کسی گمراہی پر متفق نہیں ہوگی۔

(۲) اسلام عقلی مذہب ہے:

کتاب مقدس کی (تورات کی) پوری لغت پڑھ جاؤ اس میں کہیں "عقل" یا اس کا ہم معنی لفظ نہیں پاؤ گے۔ حالانکہ عقل ہی انسان کی وہ قدرتی طاقت ہے جس کی بدولت خدا نے نوع انسانی کو تمام زندہ مخلوق پر فضیلت بخشی ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ لفظ کا مادہ عہدہ نامہ قدیم وجدید (توراۃ وانجیل) میں مذکور نہیں ہے۔ بلکہ ہماری مراد یہ ہے کہ اس میں مذہب کے سمجھنے اور اس کے لئے دلائل لانے کے لئے عقل کو بنیاد نہیں بنایا گیا ہے اور نہ اس کو قابل اعتبار سمجھا گیا بلکہ دین الٰہی کا خطاب بھی عقل سے نہیں ہے اور نہ اسے عقل پر قائم کیا گیا ہے۔ اس طرح ان میں غور و فکر کا ذکر بھی نہیں ہے۔ حالانکہ یہ عقل کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

قرآن کریم میں عقل کا ذکر بصورت اسماء و افعال تقریباً پچاس مرتبہ ہوا ہے۔ عقلمندوں کا ذکر بھی تیس چالیس سورتوں میں آیا ہے۔

قرآن کریم میں عقل کے فعل کا تذکرہ وہیں کیا گیا ہے جہاں خدا کی نشانیاں بیان کی گئی ہیں اور فرمایا گیا ہے کہ خدا کی ان نشانیوں کے مخاطب، ان کے سمجھنے والے اور ان سے ہدایت پانے والے عقل مند انسان ہیں۔ ان نشانیوں میں بھی زیادہ تر وہ نشانیاں مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کے علم، مشیت، حکمت اور رحمت کا مظہر ہیں۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا ہے:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

(۲: ۱۶۴)

(بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آنے میں اور سمندر میں کشتیوں کے چلنے میں جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے اور آسمانوں سے خدا کے پانی برسانے میں جس سے وہ زمین کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کر دیتا ہے اور اس زمین پر جہاں اس نے ہر قسم کے جاندار پھیلا رکھے

ہیں اور ہوا چلانے میں اور آسمان و زمین کے درمیان بادلوں کو قابو میں رکھنے میں عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں۔)

اس کے بعد کثرت کے لحاظ سے وہ آیات ہیں جن کا کتاب الٰہی کی قانونی اور اخلاقی ہدایات سے تعلق ہے۔ جیسا کہ سورہ انعام کے آخر میں جامع ہدایات کی تفصیل کے بعد یہ فرمایا۔

ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۶:۱۵۱)

(یہ ہے وہ جس کی خدا نے تمہیں ہدایت کی ہے تاکہ تم عقل سے سمجھو۔)

قرآن کریم میں "اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ" کا لفظ دس مرتبہ سے زیادہ مستعمل ہوا ہے۔ جیسا کہ خدا نے اپنے رسول ﷺ کو یہ حکم دے کر کہ وہ اپنی قوم کو بتا دیں کہ یہ قرآن کریم خدا کی طرف سے ہے، آپ کی طرف سے نہیں ہے یہ فرمایا ہے:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰:۱۶)

(میں تم میں اس سے پہلے بھی ایک عمر تک رہ چکا ہوں۔ کیا تم اس پر غور نہیں کرتے ہو۔)

بلکہ قرآن کریم میں عقل کو استعمال میں نہ کرنے کو آخرت کے عذاب کا ایک سبب قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ سورہ ملک میں اہل دوزخ کے بارے میں یہ فرمایا ہے:

وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (۶۷:۱۰)

(اور انہوں نے کہا کہ اگر ہم سنتے یا عقل رکھتے تو ہم دوزخ والوں میں سے نہ ہوتے۔)

اس کے بعد سورۃ اعراف کی یہ آیت ہے:

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ

(۷:۱۷۹)

ہم نے دوزخ کے لئے بہت سے جنات اور انسان پھیلا رکھے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دل رکھتے ہیں۔ مگر ان سے نہیں سمجھتے۔ آنکھیں رکھتے ہیں۔ مگر ان سے نہیں دیکھتے۔ کان رکھتے ہیں مگر ان سے نہیں سنتے۔ یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔ یہی لوگ غافل ہیں۔

سورۂ حج میں فرمایا:

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ (۲۲:۴۶)

(کیاانہوں نے زمین کی سیر نہیں کی ہے کہ اس وقت ان کے دل ہوتے، جن سے وہ سمجھتے۔)

اس طرح دعوت نظر و فکر دینے والی آیات قرآن کریم میں بہت زیادہ ہیں جو کوئی ان آیات پر غور کرے گا تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ اس مذہب کے ماننے والے اہل نظر اور صاحب عقل و فکر ہیں۔ چوپایوں کی طرح زندگی بسر کرنے والے غافلوں کا اس مذہب میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ ظاہری رسوم کی تقلید کریں۔ جن سے نہ تزکیۂ نفس ہوتا ہے نہ عقل کو بصیرت ملتی ہے اور نہ خدا کے جلال و جمال کی وہ معرفت حاصل ہوتی ہے جس سے وہ درجہ کمال تک پہنچ سکیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا (۳۴:۴۶)

(کہو (اے پیغمبر) میں تمہیں ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ تم دو دو اور ایک ایک اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ پھر غور و فکر سے کام لو۔)

نیز دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے:

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۗ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ (۳۰:۸)

(کیا انہوں نے اپنے آپ یہ غور نہیں کیا کہ خدا نے آسمانوں کو اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، درست طریقے پر مقررہ مدت میں پیدا کیا ہے۔)

عقلمندوں کے بارے میں یہ ارشاد ہے، فرمایا:

وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳:۱۹۱)

(آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے بارے میں غور و خوض کرتے رہتے ہیں۔)

ایک اور مقام پر یہ بتانے کے بعد کہ رسول خدا کو نہ علم غیب ہے، نہ زمین کے خزانوں میں تصرف کا حق ہے بلکہ رسول کا کام صرف یہ ہے کہ وہ وحی کی پیروی کرے۔ یہ فرمایا ہے:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۭ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۶:۵۰)

(اے پیغمبر! پوچھو کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہیں۔ پھر تم کیوں غور نہیں کرتے؟)

کسی مغربی فلسفی کا یہ قول ہے جس کی صداقت سے کوئی عقلمند اختلاف نہیں کر سکتا کہ انسانی ترقی کی بنیاد غور و فکر پر ہے اور جو کوئی جس قدر غور کرے گا اسی قدر وہ اعلیٰ

رتبہ حاصل کر سکے گا۔

یہ واقعہ ہے کہ مذہبی تقلید و رسوم نے انسانی عقل و فکر کی آزادی سلب کر رکھی تھی۔ یہاں تک کہ اسلام آیا اور اس نے اپنی کتاب کے ذریعے یہ رکاوٹ دور کی اور مذہبی تقلید و رسوم کی غلامی سے انسانیت کو آزاد کرایا۔ چنانچہ اس قسم کی آزاد خیالی مغربی قوموں نے مسلمانوں ہی سے سیکھی۔ پھر مسلمان پیچھے کی طرف لوٹ گئے اور اپنے آپ کو آزاد خیالی سے محروم کر لیا۔ صرف معدودے چند افراد ہی آزاد خیال باقی رہ گئے ہیں۔ اب مسلمان انہی لوگوں کی تقلید کرنے لگے ہیں جنہوں نے ان کے آباؤاجداد سے علم حاصل کیا تھا۔ حالانکہ خود مغربی علماء نے ہمارے اسلاف کی پیش روی اور علمی قیادت کا اعتراف کیا ہے اور ان کارناموں کو تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ ہمارے استاد (مفتی محمد عبدہ) نے اپنی کتاب "اسلام والنصرانیہ" میں ان کے بعض اقوال نقل کیے ہیں۔

(۳) علم و حکمت کا دین:

علم کے لفظ کا ذکر اسم معرفہ اور نکرہ دونوں صورتوں میں قرآن کریم کی آیات میں بہت سے مقامات پر آیا ہے جس کی تعداد ایک سو کے قریب ہے۔ اسی طرح علم کے مشتق الفاظ کا ذکر بھی سینکڑوں جگہ آیا ہے۔ علم سے مراد دین و دنیا کے سب علوم ہیں۔ مطلق علم کے بارے میں سورۂ اسراء کی ہدایات کے سلسلے میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ۝

(۳۶:۱۷)

(اس بات کے پیچھے نہ چلو جس کا تمہیں کوئی علم نہیں ہے۔ درحقیقت کان، آنکھوں اور دل ہر ایک سے بازپرس ہو گی۔)

یعنی جس چیز کا علم آنکھوں کے مشاہدہ یا سنی سنائی روایات اور قطعی دلائل سے نہ ثابت ہو، اس کی پیروی نہ کرو۔ کیونکہ خداوند تعالیٰ نے علم کے یہ تین وسائل عطاء فرمائے ہیں۔ اس لئے وہ تم میں سے ان کے بارے میں دریافت کرے گا (کہ تم نے ان سے کیوں صحیح کام نہیں لیا؟)

امام راغب نے اپنی تفسیر میں اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ قیافہ اور گمان سے

کوئی فیصلہ نہ کرو۔ امام بیضاوی کی تفسیر کا خلاصہ یہ ہے کہ تقلیدی طور پر یا یونہی اٹکل سے کسی ایسی بات کی پیروی نہ کرو۔ جس کا تمہیں علم نہیں ہے۔

منقول اور تاریخی علم کے بارے میں یہ فرمایا ہے:

اِیْتُوْنِیْ بِکِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَاۤ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ (۴ : ۴۶)

(میرے پاس لاؤ اس سے پہلے کی کتاب یا کوئی پرانا علم، اگر تم سچے ہو۔)

انسانوں کے مادی علوم کے متعلق خداوند تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (پ ۲۱ : ۴)

(لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے وہ دنیاوی زندگی کا ظاہری علم رکھتے ہیں۔)

روح کے علم کے بارے میں یہ ارشاد ہے:

وَیَسْـَٔلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَاۤ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا ۝

(۱۷ : ۸۵)

((اے پیغمبر) یہ لوگ آپ سے روح کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ روح میرے پروردگار کے حکم سے ہے اور تمہیں کم علم دیا گیا ہے۔)

خداوند تعالیٰ ان دونوں آیات میں انسان کے دنیاوی علم کی بھی کمزوری اور کمی کو بیان کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ماہر علماء بھی یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ان کا ان چیزوں کے بارے میں کوئی وسیع علم نہیں ہے اور ان کا علم صرف ان کی ظاہری معلومات تک محدود ہے۔ چنانچہ بعض مغربی علماء نے یہ صاف طور پر کہا ہے کہ جوں جوں ان کا علم بڑھتا جاتا ہے، اسی قدر انہیں گزشتہ علم کی تحقیق کی ضرورت اور مزید علم حاصل کرنے کی خواہش بڑھتی جاتی ہے۔ جیسا کہ امام شافعی نے ان دو شعروں میں کیا ہے:

(۱) جس قدر زمانہ مجھے ادب سکھاتا ہے اسی قدر میں اپنی عقل کی کوتاہی کو محسوس کرتا ہوں۔

(۲) جس قدر میرے علم میں اضافہ ہوتا ہے، اسی قدر زیادہ مجھے اپنی جہالت کا علم ہوتا ہے۔

عقلی علم کے بارے میں خدا نے یہ ارشاد فرمایا:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًی وَّلَا کِتٰبٍ مُّنِیْرٍ ۝ (۲۲ : ۸)

(اور ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ کے معاملے میں علم و ہدایت اور واضح کتاب کے بغیر بحث کرتے ہیں۔)

بظاہر اس آیت میں "علم" سے مراد نظری علم ہے۔ کیونکہ "ھدیً" اور کتاب منیر کے مقابلے میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو دینی ہدایت اور وحی ہے۔

علم طبیعات کے بارے میں یہ آیات ہیں:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ (۳۰:۲۲)

(اور اللہ کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش ہے اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف ہے۔ اس میں اہل علم کے لئے نشانیاں ہیں۔)

عالمین سے یہاں مراد سائنس دان علماء ہیں۔ اسی طرح کچھ آیات میں بارش کے پانی سے رنگارنگ پھل پیدا کرنے اور پہاڑوں میں رنگارنگ کے راستوں اور طرح طرح کے انسانوں اور چوپاؤں کا ذکر کرنے کے بعد یہ ارشاد فرمایا گیا ہے:

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (۳۵:۲۸)

(درحقیقت اللہ تعالیٰ سے اس کے اہل علم بندے ہی ڈرتے ہیں۔)

یہاں علماء سے وہ سائنس دان علماء مراد ہیں جو اسرار کائنات، اس کے تغیرات، مختلف اجناس وانواع اور خدا کی نشانیوں اور حکمتوں کو سمجھتے ہیں۔ اسی میں تقریباً تمام علوم وفنون شامل ہیں۔ یہی مفہوم دوسری سورتوں کی آیات میں بھی آیا ہے۔

قرآن کریم نے علم کا درجہ اس قدر اعلیٰ قرار دیا ہے کہ اس سے اعلیٰ کوئی درجہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ارشاد ہے:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۳:۱۸)

(اللہ نے شہادت دی کہ اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں اور فرشتوں اور اہل علم نے بھی شہادت دی۔ اللہ انصاف پر قائم ہے اس زبردست حکمت والے کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔)

خدا نے اس آیت کریمہ میں پہلے درجے میں اپنا مرتبہ رکھا، دوسرے درجے میں فرشتوں کا ذکر ہے اور اہل علم کا تیسرا درجہ ہے۔ اس میں پیغمبر، حکماء اور ان سے نیچے تمام اہل علم داخل ہیں۔ جیسا کہ فرمایا:

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (۵۸:۱۱)

(اللہ تم میں سے ان لوگوں کے درجات بلند کرے گا جو ایمان لائے ہیں اور جنہیں علم ملا ہے۔)

اس نے اپنے معزز ترین اور سب سے زیادہ عالم رسول خدا کو حکم دیا کہ یہ دعا مانگا کریں۔

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (۲۰:۱۱۴)

(اے پیغمبر! کہو کہ پروردگار مجھے زیادہ علم دے۔)

علم کی تعریف اور اس کی ترغیب کی آیات کی تائید ان آیات سے ہوتی ہے جو وہم و گمان کے اتباع کی مذمت میں ہیں۔ جیسے:

اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا (۲۸:۵۳)

(ان میں سے اکثر خیال و گمان ہی کی پیروی کرتے ہیں۔ حالانکہ خیال و گمان، صداقت کے مقابلے میں بالکل سود مند نہیں ہے۔)

وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا

(۲۸:۵۳)

(اور انہیں اس کا کوئی علم نہیں مگر خیال اور گمان کا اتباع ہے۔ حالانکہ خیال و گمان صداقت کے مقابلے میں بالکل سود مند نہیں ہے۔)

عیسائیوں کے اس قول کے جواب میں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو سولی دی گئی ہے، یہ ارشاد ہے:

وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ (۲۸:۵۳)

(انہیں اس کا کوئی علم نہیں ہے، سوائے اس کے کہ یہ خیال و گمان کی پیروی ہے۔)

علم برہانی اور دلائل کو قرآن کریم نے اس قدر اہمیت دی ہے کہ خدا نے شرک کی مخالفت کو بھی اس کے حکم کے ساتھ مقید کر دیا ہے جو سب سے بڑا گناہ اور کفر کا انتہائی درجہ ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۷:۲۳)

(اے پیغمبر کہہ دیجئے کہ میرے پروردگار نے بدکاریاں حرام کر دی ہیں۔ خواہ وہ کھلی ہوں یا پوشیدہ اور گناہ اور ناحق سرکشی بھی حرام کر دی ہے اور یہ کہ اللہ کے ساتھ کسی ایسے کو شریک کرو جس کی کوئی دلیل

اس نے تم پر نہیں اتاری ہے اور یہ کہ تم اللہ کے بارے میں ایسی بات کہو جس کا تمہیں علم نہیں ہے۔)

کافر والدین کے ساتھ حسن سلوک کے بارے میں یہ فرمایا ہے:

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا (۸:۲۹)

(اور ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے۔ اگر وہ تمہیں اس پر مجبور کریں کہ میرے ساتھ شرک کرو جس کا انہیں علم نہیں ہے تو ان کی اطاعت نہ کرو۔)

مذہب کے ذریعے صاف طور پر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ خدا سے شرک کو علم اور عقلی دلائل کے ذریعے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ شرک کی تردید ایک کھلی حقیقت ہے۔ بہر حال اسی مسئلہ کی تفصیل دلیل و حجت کی اہمیت اور تقلید کی مذمت کے سلسلے میں آگے چل کر بیان ہوگا۔

حکمت و بصیرت:

حکمت و بصیرت کی اہمیت کے بارے میں ارشاد ہے:

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ (۲:۲۶۹)

(جسے چاہتا ہے، حکمت عطا فرماتا ہے اور جسے حکمت ملتی ہے اسے بہت سی بھلائی مل جاتی ہے۔ عقل والے ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔)

خاتم النبیین محمد ﷺ کی بعثت کی غرض وغایت اس طرح بیان کی گئی ہے۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ (۶۲:۲)

(اللہ ہی جانتا ہے جس نے ناخواندہ (عربوں) میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیات تلاوت کرتا ہے۔ انہیں پاک کرتا ہے اور کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔ اگرچہ وہ پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔)

سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران میں بھی اسی کے ہم معنی دو آیات اور موجود ہیں، چنانچہ خداوند تعالیٰ اپنے رسول پر احسان جتاتے ہوئے فرماتا ہے:

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ
وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (۴ : ۱۱۳)

(اس نے تم پر کتاب و حکمت نازل فرمائی اور تمہیں علم دیا ہے جو تم نہیں جانتے تھے اور تم پر خدا کا فضل بہت بڑا ہے۔)

آگے چل کر فرمایا:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ (۱۶ : ۱۲۵)

(اپنے پروردگار کی راہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ۔)

بنیادی فضائل اور بڑی بڑی برائیوں کو منع کرتے ہوئے اور ان کے اسباب و علل اور انجام کا تذکرہ کرنے کے بعد یہ ارشاد فرمایا گیا:

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ (۱۷ : ۱۲۹)

(یہ وہ حکمت ہے جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر وحی کی صورت میں نازل کی گئی ہے۔)

رسول اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا:

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِىْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ (۳۳ : ۳۴)

(اور یاد کرو ان کو جو تمہارے گھروں میں خدائی آیات اور حکمت کی باتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔)

خدا نے اپنے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو حکمت عطا فرمائی تھی۔ لیکن ان کے بعد ان کی قوموں نے تقلید اختیار کر کے اور مذہبی قیادت قائم کر کے اسے بالکل ضائع کر دیا ہے بلکہ پولس نے تو صاف اور واضح حکم کے ذریعے حکمت کو عیسائیت کے مذہب سے بالکل منسوخ کر دیا، بہرحال خداوند تعالیٰ یہودیوں کے بارے میں فرماتا ہے:

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ
وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا (۴ : ۵۴)

(کیا وہ اس وجہ سے لوگوں پر حسد کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ مہربانی کی (اس سے پہلے) ہم ابراہیم کی اولاد کو کتاب و حکمت دے چکے ہیں اور انہیں بڑی بادشاہت بھی عطا کی تھی۔)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی اپنی بندوں پر سب سے بڑی نعمت "کتاب" ہے، اس کے بعد حکمت اور اس کے بعد ملک و حکمرانی ہے۔

خدا نے اپنے پیغمبر حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں فرمایا ہے۔

وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ (۲:۲۵۱)

(خدا نے اسے علم وحکمت دی اور وہ علم دیا جو وہ چاہتا ہے۔)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے۔

وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ (۵:۱۱۰)

(اور یاد کرو جب میں نے تمہیں کتاب وحکمت توراہ اور انجیل سکھائی تھی۔)

دوسرے مقام پر فرمایا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ (۳۱:۱۲)

(اور ہم نے لقمان کو حکمت دی)

اس کے بعد حکمت کے نمونہ کے طور پر ان کی ہدایات کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے اپنے بیٹے کو نیکی اختیار کرنے اور برائی سے بچنے کے سلسلے میں ان کے نفع و نقصان کی وضاحت کے ساتھ بیان کی تھیں۔

ان آیات کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حکمت مخصوص علم ہے، وہ ایسا علم ہے جس سے اشیاء کے حقائق اور ان کے نفع نقصان کا پورا علم حاصل ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے حکمت ایک عملی فلسفہ ہے۔ جیسے علم النفس، علم الاخلاق، علم اسراء، کائنات یا سائنس اور علم الاجتماع ہے چنانچہ سورہ اسراء میں جو مذکورہ بالا ہدایات بیان کی گئی ہیں اس کے آخر میں یہی ارشاد فرمایا گیا ہے "یہ وہ حکمت ہے جو خدا نے تم پر وحی کی صورت میں نازل فرمائی۔"

قرآن کریم میں فقہ کا لفظ بھی بکثرت مستعمل ہے اس سے مراد حقائق کی وہ گہری بصیرت ہے جس کی بدولت ایک عالم باعمل اور اعلیٰ درجہ کا مہذب انسان بن جاتا ہے ملاحظہ ہو سورہ انعام (۶:۲۵،۶۵،۲۸) سورہ اعراف (۷:۱۷۸) سورۃ انفال (۸:۶۵) سورہ توبہ (۹،۸۲،۸۸،۱۲۳) ان چاروں سورتوں میں جو فقہ کی تعریف بیان کی گئی ہے وہ کافی ہے۔ یہ بھی حکمت میں شامل ہے۔ اس سے مراد طہارت بیع واجارہ وغیرہ کے ظاہری احکام و مسائل کا علم نہیں ہے کیونکہ فقہ کی موجودہ اصطلاح قرآنی اصطلاح نہیں ہے بلکہ موجودہ فقہ میں بعض قرآن کریم کے مخالف چیزیں بھی ہیں جسے علم حیل جس کے ذریعے قرآنی حکمت سے بچنے کے طریقے سکھائے جاتے ہیں۔

۴۔ دلائل اور برہان کا مذہب :

خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

۱۔ يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا

(اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل آئی ہے اور ہم نے تمہاری طرف کھلا نور نازل کیا ہے۔)

۲۔ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ

(جو کوئی خدا کے سوا دوسرے معبود کو پکارے جس کی وہ اپنے پروردگار کے پاس کوئی دلیل نہیں رکھتا ہے تو اس کا حساب اس کے پروردگار ہی کے پاس ہے در حقیقت کافر فلاح نہیں پائیں گے۔)

مذکورہ آیت میں شرک کی وعید کو اس حقیقت سے مقید کیا گیا ہے کہ مشرک کے پاس اپنے شرک کو ثابت کرنے کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے لیکن اس علم کے باوجود محض دلیل و برہان کی اہمیت واضح کرنے کے لیے یہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔ قیامت کے دن خداوند تعالیٰ قوموں کو ان کے پیغمبروں اور ان کے جانشینوں کے ساتھ اٹھائے گا جو ان کے خلاف شہادت دیں گے اور ان کی موجودگی میں ان کافروں سے مطالبہ کیا جائے گا کہ انہوں نے اپنے پیغمبروں کی جو مخالفت کی تھی اس کی حمایت میں وہ ثبوت پیش کریں جیسا کہ ذیل میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا فَقُلْنَا هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوْٓا اَنَّ الْحَقَّ لِلّٰهِ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۲۸:۷۵)

(اور ہم ہر قوم سے ایک گواہ نکالیں گے پھر ان سے کہیں گے کہ اپنا ثبوت لاؤ۔ اس وقت انہیں معلوم ہو گا کہ صداقت خدا ہی کے پاس ہے اور ان کی تمام افترا پردازی جاتی رہے گی۔)

سورہ انبیاء میں آسمان و زمین کا تذکرہ کرنے کے بعد شرک کی تردید میں عقلی دلیل پیش کی گئی ہے۔

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (۲۱:۲۲)

(اگر آسمان و زمین میں خدا کے سوا کوئی معبود ہوتے تو ان دونوں میں خرابی برپا ہوتی۔)

اس کے بعد مشرکوں سے عاجز کرنے والا یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ انہوں نے خدا کے سوا کئی معبود بنا رکھے ہیں انہیں دلیل سے ثابت کریں۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

أَمِ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ آلِهَةً ۖ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ ۖ (۲۱: ۲۴)

(کیا خدا کو چھوڑ کر انہوں نے اپنے معبود بنا لیے ہیں (اے پیغمبر) کہہ دیجئے اپنی دلیل لاؤ۔)

اسی طرح سورہ نمل میں ارشاد ہے۔

أَمَّنْ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَمَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۗ أَإِلَٰهٌ مَعَ اللَّهِ ۚ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۶۴﴾ (۲۷: ۶۴)

(کون پیدائش کا آغاز کرتا ہے پھر اسے کون لوٹاتا ہے کون آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے کیا خدا کے سوا اور کوئی معبود ہے کہہ دیجئے ا کہ اپنی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو؟)

اپنی قوم کے مقابلے میں حضرت ابراہیم کے دلائل کا تذکرہ کرتے ہوئے اور شرک کی تردید میں ان کے علمی دلائل پیش کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَكَيْفَ أَخَافُ مَا أَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُونَ أَنَّكُمْ أَشْرَكْتُمْ بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا ۚ فَأَيُّ الْفَرِيقَيْنِ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ ۖ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۸۱﴾ (۶: ۸۱)

(میں کیونکر اس چیز سے ڈر سکتا ہوں جسے تم شریک بناتے ہو مگر تم خود اس بات سے نہیں ڈرتے ہو کہ تم خدا کے ساتھ شریک بنا چکے ہو جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں نازل فرمائی اگر تمھیں کچھ علم ہے تو بتاؤ کہ ہم دونوں میں سے کونسا فریق امن کا زیادہ حقدار ہے۔)

اس کے بعد کی ایک آیت میں یہ ارشاد ہے۔

وَتِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ عَلَىٰ قَوْمِهِ ۚ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَنْ نَشَاءُ ۗ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿۸۳﴾ (۶: ۸۳)

(یہ ہمارا ثبوت ہے جو ہم نے (حضرت) ابراہیم کو ان کی قوم کے مقابلے میں عطا فرمایا تھا ہم جس کے چاہتے ہیں درجے بلند کر دیتے ہیں در حقیقت تمہارا پروردگار علم و حکمت والا ہے۔)

یہاں درجات سے مراد علمی حجت اور عقلی دلائل کے درجات ہیں اس وجہ سے حکمت کے لفظ کو علم پر مقدم لایا گیا ہے۔ برہان کو کئی مقامات پر سلطان (قوت و اقتدار) کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے۔

الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ ۖ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ الَّذِينَ آمَنُوا ۚ (۴۰: ۳۵)

(یہ لوگ اللہ کی نشانیوں کے بارے میں مستحکم دلیل کے بغیر جھگڑتے ہیں یہ بات اللہ اور مومنوں کے

نزدیک بہت بڑی ہے۔)

اسی سورت میں اسی طرح کی دوسری آیت یہ ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِ اللّٰهِ بِغَیْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ اِنْ فِیْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِیْهِ (۵۶:۴۰)

(بے شک جو لوگ اللہ کی آیات کے بارے میں کسی مستحکم دلیل کے بغیر جھگڑتے ہیں ان کے سینے میں تکبر ہی ہے وہ اس دلیل تک نہیں پہنچ سکتے۔)

سلطان کا لفظ دوسری کئی سورتوں میں اس طرح مستعمل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو فرعون کی طرف اپنی نشانیوں اور سلطان مبین (کھلے دلائل) کے ساتھ مبعوث فرمایا تھا۔

۵۔ قلب و ضمیر کا دین:

قیومی نے اپنی کتاب "المصباح" میں لکھا ہے کہ انسان کی ضمیر اس کا قلب و باطن ہے اس کی جمع ضمائر ہے اور کبھی عقل پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ ہم اس لفظ کے معانی اور اس کے استعمال کے طریقے سورۃ اعراف کی آیت کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں۔ (دیکھو صفحہ ۴۱۹ تفسیر جلد ۹)

قرآن کریم میں قلب کا ذکر ایک سو سے زائد آیات میں آیا ہے چنانچہ سورہ قاف میں فرمایا ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ (۳۷:۵۰)

(در حقیقت اس میں اس کے لیے نصیحت ہے جو دلیل رکھتا ہو یا متوجہ ہو کر کان لگائے۔)

سورۃ شعراء میں فرمایا ہے۔

یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ (۸۹:۲۶)

(اس دن نہ مال کام آئے گا نہ اولاد سوائے اس کے جو خدا کے پاس قلب سلیم کے ساتھ پہنچے۔)

حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی تعریف میں ارشاد ہے۔

اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ (۸۴:۲۶)

(جب وہ اپنے پروردگار کے پاس قلب سلیم کے ساتھ آئے۔)

اور انہی ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول نقل کیا ہے۔

وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ (۲:۲۶۰)

(لیکن اس لیے کہ میرے دل کو اطمینان ہو۔)

مومنین کی تعریف میں یہ ارشاد ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (۱۳:۲۸)

(یہ وہ لوگ ہیں) جو ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کے ذکر سے مطمئن ہیں۔ بے شک ذکر الٰہی ہی سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے۔

حضرت عیسیٰ کے پیرووں کی صفات میں یہ فرمایا۔

وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ۭ وَرَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا (۵۷:۲۷)

(اور ہم نے ان کے پیرووں کے دلوں میں رحم اور شفقت کے جذبات پیدا کیے اور رہبانیت کو انہوں نے خود ایجاد کیا تھا۔)

مومنوں کے دلوں کی یہ صفت بیان کی ہے کہ ان میں خشوع و خضوع ہوتا ہے اور ان کے دل میں برائیوں کا شائبہ تک نہیں ہوتا مگر کافروں اور منافقوں کے دلوں میں گندگی، بیماری، سنگدلی اور کجروی ہوتی ہے۔ صداقت اور بھلائی کی فطری استعداد کی محرومی کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ان پر مہریں لگا دی گئی ہیں۔ لہٰذا ان میں کوئی نئی چیز داخل نہیں ہو سکتی یا وہ ایک ایسے کان کی مانند ہے جس پر چاروں طرف سے زنگ اور نجاست لگی ہو۔ اس لئے اس میں جلا اور چمک نہیں آ سکتی۔

چونکہ اسلام عقل و دلائل اور ضمیر کی آزادی کا مذہب ہے اس لیے اس نے عیسائیوں اور دوسرے لوگوں کے اس طرز عمل کی سختی کے ساتھ تردید کی ہے کہ مذہب کے معاملے میں زبردستی کی جائے اور مخالفین کو ستایا جائے اور ان کے ساتھ فتنہ پردازی جائے۔ اس بارے میں بکثرت آیات وارد ہیں جنھیں ہم نے اپنے مناسب مقام پر بیان کر دیا ہے اس مذہبی آزادی کی ایک دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم نے تقلید کی مذمت کی ہے اور اہل تقلید کو گمراہ بتایا ہے۔

۶۔ تقلید اور قدامت پرستی کا جمود:

علم و فضل، آزادی عقل و فکر و ضمیر کی تعریف میں اور دلائل کا مطالبہ کرنے میں

ایمانی اور علمی معاملات میں خیال و گمان کی پیروی کی مذمت میں جو آیات نازل ہوئی ہیں ان سب سے تقلید کی مذمت ثابت ہوتی ہے۔ بلکہ خود تقلید اور اہل تقلید کی مذمت میں بہت سی آیات موجود ہیں۔ جیسے :

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ (۲:۱۷۰)

(اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا نے جو (ہدایت) نازل کی ہے اسے مانو، تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم اسی (راہ) کی اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا، کیا جب کہ ان کے باپ دادا کچھ بھی سمجھ بوجھ نہ رکھتے ہوں؟ (اس وقت بھی وہ ان کی اتباع کریں گے۔)

اور یہ بھی ارشاد ہے :

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۚ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ (۵:۱۰۴)

(اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور رسول کی طرف آؤ تو کہتے ہیں ہمارے لئے وہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے بزرگوں کو پایا۔ اگرچہ ان کے بزرگ نہ کچھ جانتے ہوں اور نہ ہدایت پر ہوں۔)

قرآن کریم نے اہل تقلید کی مذمت دو پہلوؤں سے کی ہے۔ پہلا رخ یہ ہے کہ آباؤاجداد کی روش پر چلنے سے ان پر جمود طاری ہو گیا ہے اور علمی و عملی ترقی کے بجائے اسی کو کافی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ زندہ اور ہوشمند انسان کی شان نہیں ہے۔ کیونکہ زندگی نشوونما اور تخلیق چاہتی ہے اور عقل تجدید و اضافہ کا مطالبہ کرتی ہے۔

ان آیات کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے آباؤاجداد کی اندھی تقلید کر کے اپنے آپ کو انسانی خصوصیت سے محروم کر لیا ہے جس کی امتیازی شان یہ ہے کہ وہ حق و باطل، نیکی بدی اور اچھائی برائی کی، علم و عقل اور عملی ہدایت کی رو سے تمیز کر سکے۔ اسی نقطہ نگاہ کی تائید قرآن کریم کی اس آیت سے ہوتی ہے۔

وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۖ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ (۷:۲۸)

(جب وہ بدکاری کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ایسا کرتے ہی پایا اور خدا نے ہمیں یہی حکم دیا ہے۔ کہہ دیجئے کہ خدا بدکاری کا حکم نہیں دیتا کیا تم خدا کے خلاف وہ بات کہتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں۔)

عرب فرشتوں کی پرستش کرتے تھے۔ ان کے بارے میں فرمایا:

وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ۭ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۤ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝۲۰ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ۝۲۱ بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓي اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓي اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝۲۲ (۴۳ : ۲۰ : ۲۳)

(اور انہوں نے کہا کہ اگر خدائے رحمٰن چاہتا تو ہم ان فرشتوں کی پرستش نہ کرتے۔ ان کو اس بات کا کوئی علم نہیں ہے۔ یہ لوگ محض اٹکل سے کہتے ہیں۔ کیا ہم نے انہیں اس سے پہلے کوئی کتاب دی ہے جس پر یہ جمے ہوئے ہیں؟ نہیں، بلکہ وہ کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک راہ پر پایا اور ہم انہی کے نقش قدم پر چلنے والے ہیں۔ اس طرح ہم نے تم سے پہلے جب کوئی پیغمبر کسی آبادی میں بھیجا تو وہاں کے خوشحال لوگوں نے یہی کیا۔ ہم نے اپنے آباؤاجداد کو ایک راستے پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقش قدم کی پیروی کرنے والے ہیں۔)

اسی طرح کی آیات سورۂ انبیاء، شعراء اور صافات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی قوم کے قصہ میں بھی مذکور ہیں۔

ان تمام تفصیلات کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قرآن ہی نے تمام سابقہ مذاہب کے ماننے والوں کو دعوت دی کہ مذہبی علم و ہدایت حاصل کرنے کے لئے اپنے ضمیر کے ساتھ ساتھ اپنی عقل کو بھی استعمال کریں اور اپنے آباؤاجداد کے طریقے کو کافی نہ سمجھیں، کیونکہ اسی قسم کا جمود انسانی فطرت اور اس کی ممتاز خصوصیات یعنی عقل و فکر اور ضمیر کے خلاف بغاوت سمجھا جائے گا۔ بہر حال اسی قسم کے علم و ہدایت کی بدولت اسلام نے تمام مذاہب کے مقابلے میں ممتاز مرتبہ حاصل کر لیا تھا اور اسی کشش کی وجہ سے تمام قوموں کے ہوشمند انسان جوق در جوق اسی مذہب میں داخل ہونے لگے تھے۔ مگر معدودے چند افراد کو چھوڑ کر مسلمان اپنے سر کے بل گر پڑے اور انہی اہل کتاب وغیرہ کی تقلیدی روش اختیار کرنے لگے جن سے انہیں منع کیا گیا تھا اور اس کا ہرگز حکم نہیں دیا تھا۔ یعنی وہ بھی اپنے آباؤاجداد اور بعض ایسے مشائخ کی تقلید کرنے لگے جو بعض اماموں اور علماء کی طرف منسوب ہیں۔ اس طرح انہوں نے ان خدائی دلائل کو خود باطل قرار دیا جو تمام قوموں پر ثابت ہو چکے تھے، بلکہ ان کی اس روش سے خود ان کے مذہب کے خلاف ایک ثبوت قائم ہو گیا۔ اب وہ کیسے اسلام کی دعوت پیش کر سکتے ہیں۔ جبکہ ان کا سب سے بڑا

زندہ ثبوت خود قرآن کریم ہے اور خود مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ وہ قرآن کریم کی ہدایت سے محروم ہیں بلکہ اب ان مسلمانوں کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ ظاہری اور رسمی علم کے مدعی ان لوگوں کی سختی کے ساتھ مخالفت کرتے ہیں جو مسلمانوں کو کتاب اللہ، رسول اللہ کی ہدایت اور سلف صالحین کی سیرت کی طرف انہیں دعوت دے۔ چنانچہ ہم بھی انہی لوگوں کے ہاتھوں سختیاں جھیل رہے ہیں اور جہل و جمود کی راہ سے آنے والے تمسخر، طعنہ زنی اور بد کلامی کا شکار بنے ہوئے ہیں۔ ہمیں طنزاً "مجتہد" کہا جاتا ہے۔ یہ وہ لقب ہے جو جہالت کی وجہ سے صرف بعض قدیم علماء کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔

اگر ہم میں ایسے علماء کی کثرت ہوتی جو اسلام کو اس کے حقیقی علمی اور عقلی خط و خال میں پیش کر سکتے تو آزاد خیال اہل علم و فکر اس مذہب میں جوق در جوق داخل ہوتے۔ یہاں تک کہ یہ مذہب ساری دنیا میں پھیل جاتا، کیونکہ مغربی ممالک اور ان کے مقلد ممالک کے مدارس میں موجودہ تعلیم کی بنیاد آزاد خیالی اور عقلی دلائل پر ہے۔ لہٰذا ان تعلیم یافتہ افراد کی اکثریت سب مذاہب کو تقلیدی سمجھتی ہے اور انہیں قوموں کے اخلاقی اور اجتماعی نظام کا ایک حصہ سمجھتی ہے۔ اس لئے وہ اپنے تقلیدی مذہب کی پیروی کر کے اپنے نظام کو برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ لہٰذا ہمارے لئے یہ مشکل ہو گیا ہے کہ ہم ان کے دین کے مقابلے میں اسلام کی امتیازی خصوصیات کو کیسے ثابت کریں۔ کیونکہ ہمارے ہاں ایسے لوگوں کی کمی ہے جو اسلام کو اسی صورت میں پیش کریں جو قرآن کے مطابق ہو اور جس کی تشریح سنت نبوی، خلفاء راشدین اور بزرگان سلف کی سیرت سے لی گئی ہو۔

تاہم اہل مغرب یقینی علم کے بغیر عیسائیت کے موجودہ نظام میں زیادہ دیر تک شامل نہیں رہ سکتے۔ ان کے عقائد متزلزل ہو رہے ہیں اور بہت سی مذہبی اور علمی انجمنیں حضرت مسیح علیہ السلام کی الوہیت اور کلیسا کی اکثر رسومات سے انکار کر رہی ہیں جیسا کہ اس کی تفصیل اصل کتاب کے صفحہ نمبر ۱۷۴ میں گذر چکی ہے۔

بری تقلید کے نتائج:

بعض اہل تقلید کا خیال ہے کہ کتاب وسنت سے ہدایت حاصل کرنے اور ان کے سمجھنے میں مسلمانوں کو آزاد خیالی کی دعوت دینے میں مجلہ المنار بہت مشہور ہے لہٰذا ان

کے خیال میں نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بعض جاہلوں کو شریعت میں اجتہاد کا دعویٰ، ائمہ کی تقلید سے گریز اور ان پر اور ان کے پیروؤں پر اعتراض کرنے کی جرات ہو گئی ہے اس طرح یہ نئی بدعت نمودار ہوئی ہے اور تقلید کے بجائے شریعت میں بد نظمی اور بے راہ روی آگئی ہے۔

یہ شبہ سراسر وہم پر مبنی اور بے بنیاد ہے اور مذہب کے ساتھ ساتھ تاریخ سے ناواقفیت کا نتیجہ بھی ہے کیونکہ بدعت والحاد کے مذہب بہت پرانے ہیں خود زمانہ رسالت میں اور بڑے بڑے ائمہ کے زمانے میں اس کی بنیاد قائم ہو گئی تھی۔ اس وقت مذہب کو سب سے زیادہ بگاڑنے والا وہ فتنہ تھا جس کے ذریعے معصوم اماموں کے اتباع کی دعوت دی گئی تھی، ان معصوم ائمہ سے کسی دلیل کا مطالبہ نہیں کیا جاتا ہے حالانکہ اہل السنت والجماعۃ کے آئمہ پیغمبر معصوم حضرت محمد ﷺ کے بعد مذہب کے معاملے میں کسی کی اتباع کو ضروری قرار دینے کو حرام سمجھتے تھے۔ کیونکہ محمد ﷺ کے بعد کوئی انسان معصوم نہیں ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جن اماموں نے اسی قسم کی تقلید کو حرام قرار دیا تھا انہی کے پیروؤں نے ان لوگوں کا مسلک اختیار کیا جو اپنے اماموں کو معصوم قرار دیتے ہیں یہاں تک کہ وہ باطنی ملحدوں کی روش بھی اختیار کرنے لگے ہیں کیونکہ یہ لوگ اپنے اماموں کے اقوال کے مقابلے میں بلکہ ان کی طرف منسوب مدعیان علم کے مقابلے میں بھی کتاب وسنت کے صریح اقوال مسترد کر دیتے ہیں حالانکہ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ ان کے ائمہ معصوم نہیں ہیں۔

حقیقت میں بدعات کا رواج تقلید کے بازار ہی میں ہو سکتا ہے جہاں لوگ ہر کس وناکس کی اتباع کرتے ہیں۔ آزاد خیال اور معقولیت کے بازار میں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ تقلید ہی کے دروازے سے مسلمانوں میں اکثر خرافات داخل ہوئی ہیں کیوں کہ صوفیت کا بھیس بدلنے والے اکثر دجالین مجتہد ائمہ کی طرف منسوب ہیں حالانکہ وہ ان کے اماموں کے اتباع کے دعوے میں بھی جھوٹے ہیں بلکہ ہم لوگ جو صحیح علم اور کتاب وسنت سے ہدایت حاصل کرنے کی دعوت دیتے ہیں ان سے زیادہ آئمہ کرام کی پیروی کے حقدار ہیں۔ کتاب وسنت کی ہدایت سے ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ ان میں سے ہر ایک امام مالک اور امام شافعی کی طرح مجتہد ہے کیونکہ یہ علم کا اعلیٰ درجہ ہے اور جیسا کہ

خداوند تعالیٰ فرماتا ہے۔ علم کے مختلف درجے ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان (چاروں) مذاہب کی تدوین سے پیشتر بزرگان سلف میں بھی عوام و خواص موجود تھے اور ہر ایک بقدر استعداد ہدایات یاب ہوتا تھا۔

"المنار" کے مدیر نے تمام ملحدوں، بہائیوں، قادیانیوں، قبر پرستوں اور موجودہ زمانے کے تمام اہل بدعت کی تردید کے لیے اپنے آپ کو وقف کر رکھا ہے۔ وہ نہ تو کسی خاص فرقہ کی طرف منسوب ہے اور نہ کسی خاص فرقہ کی دعوت دیتا ہے اسی طرح وہ امت کے اجماع کا نہ مخالف ہے اور نہ وہ ائمہ مجتہدین کے درمیان کسی قسم کی تفریق کرتا ہے اور یہ اس پر خدا کا بہت بڑا احسان ہے۔

۷۔ مذہبی آزادی:

جبر و تشدد کے بجائے مذہبی آزادی اور مذہبی قیادت کی مخالفت اسلام کی ممتاز خصوصیت ہے جو اسلام کی ان مجموعی خصوصیات کا نتیجہ ہے جو ہم نے بیان کیں اور جن کی بدولت اسلام دین فطرت قرار دیا جاتا ہے۔ مذہبی معاملہ میں زبردستی کی مخالفت اس آیت کریمہ میں ہے جو آپ پر مکہ معظمہ میں نازل ہوئی تھی۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ﴿۹۹﴾ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَیَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَی الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا تُغْنِی الْاٰیٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ (۱۰: ۹۹۔۱۰۱)

(اگر خدا چاہتا تو زمین پر رہنے والے تمام لوگ ایمان لے آتے کیا تم لوگوں کو مجبور کرو گے کہ وہ (زبردستی) ایمان لے آئیں کوئی بھی حکم الٰہی کے بغیر ایمان نہیں لا سکتا۔ وہ ان لوگوں کو نجاست سے آلودہ کر دے گا جو عقل سے کام نہیں لیتے (اے پیغمبر) کہہ دیجئے دیکھو آسمانوں اور زمین میں کیا ہے؟ (مگر) نشانیاں اور تنبیہات ان لوگوں کے لیے مفید نہیں ہیں۔ جو ایمان نہیں رکھتے۔)

ان آیات میں خداوند تعالیٰ نے اپنے رسول کو یہ تعلیم دی ہے کہ اس کے قانون قدرت کا تقاضا یہی ہے کہ دین کے سمجھنے میں انسانوں کی عقلیں اور خیالات مختلف ہوں۔ نیز دین کو ثابت کرنے والی نشانیوں کے سلسلے میں ان کے نقطہ نگاہ میں فرق ہو، چنانچہ بعض لوگ ایمان لاتے ہیں اور بعض کفر اختیار کرتے ہیں۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ کی یہ

خواہش کہ سب انسان ایمان لے آئیں مشیت الٰہی کے خلاف ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ ایمان کی صلاحیت انسانوں میں کم و بیش ہو اور اس صلاحیت کا دار و مدار اس پر ہے کہ وہ اپنی عقلوں اور نگاہوں کو خدا کی نشانیوں پر غور کرنے کے لیے صرف کریں اور مذہبی ہدایت اور کفر کی گمراہی میں تمیز کر سکیں (ملاحظہ ہو ان مذکورہ بالا آیات کی تشریح تفسیر المنار کی گیارہویں جلد سورہ یونس کی آخری آیات کی تفسیر۔)

اس کے بعد جب یہودی قبیلہ بنو نضیر حجاز سے جلاوطن ہونے لگا اور صحابہ نے چاہا کہ قبیلہ سے ان لوگوں کو نکال لیں جو یہودی بن چکے تھے اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى (۲:۲۵۶)

(دین کے معاملے میں زبردستی نہیں ہے، ہدایت گمراہی سے الگ ہو چکی ہے جس نے شیطان سے انکار کیا اور اللہ پر ایمان لے آیا تو اس نے مضبوط حلقہ تھام لیا۔)

اس پر آپ نے صحابہ کو حکم دیا کہ وہ اپنے رشتے داروں کو اختیار دیں چنانچہ جس نے یہودیت پسند کی وہ یہودیوں کے ساتھ جلاوطن ہو گیا اسے مسلمان ہونے پر مجبور نہیں کیا گیا مگر جس نے اسلام کو پسند کیا وہ مسلمانوں کے ساتھ رہنے لگا جیسا کہ ہم نے اس آیت کی تفسیر میں تفسیر المنار کے تیسرے حصے میں بیان کیا ہے۔

اسلام میں جنگ (جہاد) کے حکم اور اسے جائز قرار دینے کا پہلا سبب یہی تھا کہ کفار مکّہ نے مسلمانوں کو مذہبی معاملے میں تکلیفیں دیں اور انہیں مجبور کرنا چاہا کہ وہ مذہب اسلام کو چھوڑ دیں۔ اس کی مکمل تفصیل ہم اس کے مقصد ہشتم میں بیان کریں گے۔

عیسائیوں کی طرح مذہبی حکومت اور دینی قیادت اسلام میں جائز نہیں ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کریم میں بھی واضح آیات ہیں اور صحیح احادیث بھی موجود ہیں بلکہ سیرت نبوی اور خلفاء راشدین کے عملی نمونہ سے اس کی صاف مخالفت معلوم ہوتی ہے اس لیے ہم نے پیغمبروں کے فرائض کے سلسلے میں اس کی مکمل وضاحت کر دی ہے۔ یہاں صرف ہم یہ آیت تحریر کرتے ہیں جو خدا نے رسول اکرم کو مخاطب فرما کر نازل کی تھی۔

فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ۝ (۸۸:۲۱-۲۲)

(اے پیغمبر) تم لوگوں کو سمجھاؤ تمہارا کام یہی سمجھانا ہے تم ان پر حاکم نہیں ہو۔

قرآن کریم کا مقصد چہارم
سیاسی اور سماجی اصلاح کے ذرائع

انسانیت کی سماجی سیاسی اور وطنی اصلاح کی تکمیل آٹھ قسم کے اتحادوں سے ہوتی ہے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

ا۔ وحدت ملی ۲۔ نوع انسانی کا اتحاد ۳۔ مذہبی وحدت ۴۔ انصاف اور قانونی مساوات کی وحدت ۵۔ مساویانہ عبادت اور روحانی اخوت کی وحدت ۶۔ بین الاقوامی سیاسی وحدت ۷۔ عالمگیر قانون کی وحدت ۸۔ لسانی وحدت۔

اسلام اس وقت آیا جب انسانیت مختلف قومیتوں میں بٹی ہوئی تھی۔ وہ رنگ و نسب، زبان، مذہب، تہذیب وثقافت، قبائل وحکومت وسیاست کی پابندیوں میں جکڑی ہوئی تھی اور ہر قوم ایک دوسرے کی دشمن تھی۔ ان اختلافات کی بدولت وہ لوگ اپنے مخالفوں سے برسرپیکار رہنے لگے۔ آخرکار اسلام نے ایک نعرہ لگا کر انسانوں کو عالمگیر اتحاد انسانی کی دعوت دی اور اس اتحاد کو ان کے لیے نہ صرف لازمی کر دیا گیا بلکہ انہیں اختلافات اور نااتفاقی سے روکا اور اسے حرام قرار دیا لہٰذا اگر ان تفرقہ پردازوں کی مضرتوں کو تاریخی حوالوں سے بیان کیا جائے اور اسلامی اتحاد کے سلسلے میں کتاب وسنت کے اصولوں کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا جائے تو اس کے لیے ایک ضخیم تصنیف کی ضرورت ہوگی لہٰذا ہم اس باب میں وحی محمدی کو ثابت کرنے کے لیے ایک ایسا جامع اصول پیش کریں گے جس کے ذریعے انسانی اصلاح اسی طرح ہو سکتی ہے کہ تمام انسان ایک قوم، ایک مذہب، ایک شریعت اور ایک حکومت قائم کر کے اور ایک زبان ہو کر ایسی متحد قوم بن جائیں جس طرح ان کی نسل اور ان کا رب ایک ہے۔ پہلے ہم یہ جامع اصول پیش کریں گے اس کے بعد ہم تفصیلی اصول اور حوالے بیان کریں گے۔

عالمگیر اتحاد انسانی کا جامع اصول:

خدا تعالیٰ نے سورہ انبیاء میں بعض قصوں کا خلاصہ بیان کرنے کے بعد مسلم قوم کو

خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ ۝ (۲۱: ۹۲)

(یہ تمہاری امت ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا پروردگار ہوں اس لیے میری ہی عبادت کرو۔)

پھر سورہ مومنون میں خدا نے تمام پیغمبروں کو اسی قومی وحدت کے سلسلے میں خطاب کیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ۝ وَإِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ ۝ (۲۳: ۵۱، ۵۲)

(اے پیغمبر) پاک چیزیں کھاؤ اور نیک کام کرو میں تمہارے اعمال سے بخوبی واقف ہوں یہ تمہاری قوم ایک ہی قوم ہے اور میں تمہارا پروردگار ہوں۔ پس مجھ سے ڈرو۔)

ہر پیغمبر کی امت اس کی اپنی قوم ہوا کرتی تھی مگر خاتم النبین رسول اکرم ﷺ کی امت دنیا کے تمام انسان ہیں اسی لیے خدا نے سب انسانوں کے لیے لازمی قرار دیا ہے کہ وہ اس کے سب پیغمبروں پر ایمان لائیں اور ان میں تفریق نہ کریں لہٰذا خاتم النبیین ﷺ پر ایمان لانا در حقیقت سب سے پہلے پیغمبر اور درمیان کے تمام پیغمبروں پر ایمان لانے کے مترادف ہوگا۔ پیغمبروں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک ہی سلطنت میں مختلف بادشاہ یا گورنر ہوں اور آخری پیغمبروں کی شریعتوں کے ذریعے پہلے پیغمبروں کی شریعتوں کی منسوخی ایسی ہے جیسے وقتاً فوقتاً سلطنت کے قوانین میں ترمیم ہوتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ دین کامل ہوگیا (جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ ص ۱۵۱۔ ۱۵۲)۔

دوسرا اصول:

تمام انسانوں کی قوموں اور قبیلوں میں مساوات کے ذریعے انسانی وحدت کا عام اصول اس آیت سے ثابت ہوا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (۴۹: ۱۳)

(اے لوگو! ہم نے تمہیں نر و مادہ سے پیدا کیا اور تمہیں قوموں اور قبیلوں کی صورت میں کر دیا ہے تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو ورنہ حقیقت میں خدا کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ شریف وہ ہے جو سب

سے زیادہ پرہیز گار ہے۔)

رسول اللہ ﷺ نے اس عالمگیر اتحاد کی تبلیغ حجۃ الوداع کے موقع پر فرمائی آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرما کر جو تقریر فرمائی اس کا خلاصہ یہ ہے۔

"عرب کو عجمی پر گورے کو کالے پر یا اس کے برعکس تقویٰ کے بغیر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ یہ عداء بن خالد کی حدیث ہے جو طبرانی کی المعجم الکبیر میں مذکور ہے۔ اس انسانی اتحاد میں میل جول کے ذریعے محبت بڑھانا اور اختلاف وعداوت دور کرنا بھی شامل ہے (رنگ ونسب کے اختلاف کے ذریعے تفرقہ پردازی کرنے کی مذمت میں قرآن کریم کی یہ آیت ہے۔)

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَ يَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (۲۸:۴)

(درحقیقت فرعون زمین میں سربلند ہو گیا تھا اس نے اہل زمین کو گروہوں میں بانٹ دیا تھا اور ایک جماعت کو کمزور قرار دے کر ان کے فرزندوں کو ذبح کرتا تھا اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتا تھا بے شک وہ مفسدوں میں سے تھا۔)

تیسرا اصول:

خدا نے مذہبی اتحاد اس طرح پیدا کیا کہ سب انسان ایک ہی رسول کی پیروی کریں جو وہی دین فطرت کے اصول لے کر آیا ہے جسے تمام پیغمبروں نے پیش کیا تھا تاہم اس کی شریعت ایسے احکام کے ذریعے مکمل کر دی گئی ہے جو تمام انسانوں کے لیے یکساں مفید ہیں۔ اس اصول کا عام ثبوت یہ آیت کریمہ ہے۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (۷:۱۵۸)

((اے پیغمبر) کہہ دیجئے اے لوگو! میں تم سب کے لیے خدا کا رسول ہوں۔)

چونکہ اسلام فطرت، آزاد خیال اور صحیح ضمیر کا دین ہے اس لیے اس نے مذہب کے بارے میں لوگوں کو اختیار دے دیا ہے اور یہ کہا ہے۔

لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (۲:۲۵۶)

(دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ ہدایت گمراہی سے الگ ہو چکی ہے۔)

چوتھا اصول:

قانونی وحدت اسی طرح قائم کی گئی ہے کہ احکام اسلام کو ماننے والے تمام انسانوں میں مساوات رکھی گئی ہے خواہ وہ قوانین شہری اور دیوانی کے ہوں یا تعزیرات اور فوجداری کے ہوں۔ مومن کافر، نیک وبد، بادشاہ اور رعایا امیر وغریب، طاقتور اور کمزور، عدل وانصاف میں سب برابر ہیں۔ اس کی بعض مثالیں ہم تشریعی اصلاح کے باب میں مقصد ششم میں بیان کریں گے۔

پانچواں اصول:

مذہبی اور روحانی وحدت اس طرح قائم کی گئی ہے کہ مسلمانوں میں مذہبی اور روحانی اخوت اور عبادت میں مساوات قائم ہے۔ اسی طرح اجتماعات میں بھی یہ مساوات برقرار ہے جیسے نماز، حج کی رسومات اور روزہ۔ چنانچہ نماز کی صفوں میں اور حج کے طواف اور دوسری رسموں میں مسلمانوں کے بادشاہ، امراء، علماء غریبوں اور عام آدمیوں سے کھلم کھلا میل جول رکھتے ہیں مگر نہ مغربی قومیں جو عیسائیت سے تعلق رکھتی ہیں اور نہ ان کے مذہبی رہنما اس قسم کی مساوات کو پسند کرتے ہیں جس پر ابتداء ہی سے اسلام میں عمل چلا آرہا ہے اور سب لوگ اس سے واقف ہیں جیسا کہ خدا فرماتا ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (۴۹ : ۱۰)

(تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔)

بلکہ اس نے برسرپیکار مشرکوں کے بارے میں بھی یہ فرمایا ہے۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ (پ ۱۰ : ۱۱)

(اگر وہ توبہ کرلیں نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔)

چھٹا اصول:

بین الاقوامی سیاسی اتحاد اس طرح قائم کیا گیا ہے کہ اسلامی حکومت کے ماتحت تمام ممالک عام حقوق میں مساوی ہیں جیسا کہ اندرونی حفاظت اور دفاع ہے سوائے اس کے کہ جزیرۃ العرب اور بالخصوص حجاز میں غیر مسلم نہیں رہ سکیں گے کیونکہ یہ مقامات مسلمانوں

کے لیے مخصوص ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حرمین اور ان کے اطراف کے علاقے عبادت خانوں اور مساجد کا حکم رکھتے ہیں۔ اسلام نے تمام قوموں کے عبادت خانون کے بارے میں یہی فیصلہ کیا ہے کہ وہ اسی قوم کے قبضے میں رہیں گے جس نے انہیں قائم کیا ہے لہٰذا ان کی حرمت باقی رہے گی، دوسروں کے لیے اس میں داخلہ اصل مالکوں کی اجازت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس معاملہ میں مسلم اور غیر مسلم سب برابر ہیں۔

ساتواں اصول:

عدالتی وحدت اور اس کی خود مختاری اور انصاف پسند شریعت کے سامنے لوگوں کا مساوی ہونا اسلام ہی نے ضروری قرار دیا ہے البتہ اس سے شخصی اور مذہبی احکام مستثنیٰ ہیں کیونکہ اس بارے میں اسلام عقیدہ اور ضمیر کی آزادی کا احترام کرتا ہے اور یہ اس کا بنیادی اصول ہے اس لیے اسلام اجازت دیتا ہے کہ غیر مسلم شادی بیاہ کے معاملات کا تصفیہ اپنے مذہبی علماء سے کرائیں۔ اس قسم کی مساوات کی نظیر کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی کیونکہ اس طرح اسلام نے حکومت اور قانون سازی میں (غیر مسلموں کو) شریک کر لیا ہے۔ لیکن اگر وہ ہم سے فیصلہ کرانا چاہیں گے تو ہم اپنی اس انصاف پسند شریعت کی رو سے ان کا فیصلہ کریں گے جس نے ان کی شریعتوں کو منسوخ کر دیا ہے اس بارے میں اصل ثبوت یہ آیت کریمہ ہے۔

فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْــًٔا وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ (۵: ۴۲)

(اگر وہ (غیر مسلم) تمہارے پاس آئیں ان کے جھگڑے کا فیصلہ کر دو یا اعراض کرو۔ اگر تم ان سے اعراض کرو گے تو وہ تمہیں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ اگر تم فیصلہ کرو تم انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔)

اس کی چند آیات کے بعد ارشاد فرمایا:

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ (۵: ۴۸)

(ان کے درمیان خدا کی نازل کردہ (شریعت) کے مطابق فیصلہ کرو اور حق کو چھوڑ کر ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔)

آٹھواں اصول:

لسانی وحدت ہے، کیونکہ اس وقت تک انسانوں میں اتحاد اور اخوت کا امکان نہیں ہو سکتا اور مختلف قومیں ایک قوم نہیں بن سکتیں جب تک ان کی زبان ایک نہ ہو۔ انسانوں کی مصلحت پر غور کرنے والے حکماء کی یہ خواہش رہی ہے کہ سب انسانوں کی زبان ایک مشترکہ زبان ہو، تاکہ وہ متعارف ہونے کے ساتھ ساتھ تعلیم، آداب، علوم و فنون اور دنیاوی معاملات میں تعاون کر سکیں۔ اسلام نے ان کی یہ آرزو پوری کر دی ہے۔ اس نے مذہب، شریعت اور حکومت کی زبان کو اپنے تمام مسلمانوں اور اس کی شریعت کو ماننے والوں کی زبان بنا دیا ہے۔ تاکہ مسلمان اپنے اعتقاد اور اپنے ضمیر کے تقاضوں سے مجبور ہو کر کتاب و سنت کو سمجھنے، عبادت کرنے اور اخوت اسلامی کے رشتے میں منسلک ہونے کے لئے اس زبان کو سیکھیں۔ کیونکہ کتاب و سنت ہی پر ان کی دینی اور دنیاوی قیادت اور سعادت مندی کا دارومدار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں جابجا یہ بات دہرائی گئی ہے کہ یہ عربی کتاب ہے اور اس کے احکام عربی زبان میں ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تاکید کی گئی ہے کہ وہ عربی قرآن کو سمجھیں۔ اس پر غور و خوض کریں اور اس سے نصیحت حاصل کریں۔ غیر مسلم بھی مجبور ہوں گے کہ وہ بھی وہی زبان سیکھیں جس کی حکومت کے ماتحت وہ زندگی بسر کر رہے ہیں اور اس سے دنیاوی مفاد بھی حاصل کر رہے ہیں۔ چنانچہ انسانی دستور کے مطابق عربی فتوحات میں یہی حال ہوا۔

میں نے المنار اور تفسیر المنار میں بیان کیا ہے کہ اسلام میں عربی زبان کا سیکھنا ضروری ہے۔ اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ جیسا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ میں تحریر فرمایا ہے۔ اسی پر رسول اکرم ﷺ کے زمانے میں اور ان کے بعد خلفاء راشدین اور بنوامیہ و بنوعباس کے دور میں عمل رہا۔ یہاں تک کہ جب عجمیوں کی کثرت ہو گئی تو علم کم ہو گیا اور جہالت غالب ہو گئی۔ اسی وقت مسلمان صرف عبادات و اذکار ہی میں اس مذہبی زبان (عربی) کو استعمال کرنے لگے۔ (دیکھو تفسیر المنار، ج ۹ صفحہ ۳۱۰)

قومی اور لسانی وحدت سے متعلق احادیث:

رسول اکرم ﷺ ہر قسم کی ایسی تفرقہ اندازی کو ناپسند فرماتے تھے جو ان کے اتحاد

اور ان کی قومی وحدت کے منافی ہو اور اس سے ایک جسم کے مانند متحد قوم بننے میں خلل آئے جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

"مسلمانو کی مثال باہمی محبت، رحم اور الفت میں ایسی ہی ہے جیسے ایک زندہ جسم ہو۔ اگر اس کے ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو پورا جسم بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔" (امام احمد اور امام مسلم نے لقمان بن بشیر کی روایت سے یہ حدیث بیان کی ہے)۔

آپ ﷺ اس بات کو ناپسند فرماتے تھے جس سے جنسی، نسبی یا زبان کی تفریق پیدا ہو۔ پہلی بات مشہور ہے۔ اس سے متعلق ایک واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابوذر جو شروع زمانے کے پرہیزگار مشہور صحابی تھے۔ کسی بات پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ سے ناراض ہوئے۔ دونوں بدکلامی کرنے لگے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا "اے سیاہ ماں کے بیٹے۔" اس کی شکایت حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے رسول اکرم رضی اللہ عنہ سے کی۔ آپ ﷺ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: "کیا تم نے اس کی والدہ کا عیب لگایا ہے۔ تم ایسے انسان ہو جس میں جاہلیت کی خوبو پائی جاتی ہے۔" اس حدیث کو امام بخاری نے کئی مقامات پر روایت کیا ہے اور امام مسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے نام کے بغیر اسکا ذکر کیا ہے کتاب الادب میں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی زبانی یہ الفاظ تحریر کیے ہیں۔

"میرے اور ایک آدمی کے درمیان کچھ تکرار ہو گئی۔ اس کی والدہ عجمی تھی۔ اس لئے میں نے اسے اس کی ماں کا عیب لگایا۔ لہٰذا اس نے جاکر رسول اکرم ﷺ کے سامنے اس کا ذکر کر دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا "کیا تم نے فلاں کے ساتھ بدکلامی کی۔" میں نے کہا۔ "ہاں۔" آپ ﷺ نے فرمایا۔ "کیا تم نے اسے اس کی ماں کا عیب لگایا؟" میں نے کہا۔ "ہاں۔" آپ ﷺ نے فرمایا "تم ایسے شخص ہو جس میں "جاہلیت" کی خوبو ہے۔" میں نے عرض کیا۔ "کیا اس بڑھاپے کے زمانے میں بھی؟" آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں، یہ سب تمہارے بھائی ہیں۔" غلاموں سے حسن سلوک کے بیان میں مزید تفصیل آگے آئے گی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اس کے بعد سچے دل سے توبہ کی۔ یہاں تک کہ انہوں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ ان

کے چہرے کو روند ڈالے۔

دوسری بات پہلی بات کے ساتھ مشترک ہے۔ اس کے بارے میں حافظ ابن عساکر نے امام مالک اور زہری کے واسطہ سے ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن سے یہ حدیث روایت کی ہے۔

قیس بن مطاطیہ ایک مجلس میں پہنچا، جس میں سلمان فارسی، صہیب رومی اور بلال حبشی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ کہنے لگا۔ "اوس و خزرج نے اس شخص کی حمایت کی، مگر یہ سب کون ہیں؟" (اس منافق کی مراد رسول اکرم ﷺ کی ذات بابرکات تھی۔ اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اوس و خزرج کے قبیلوں نے عرب ہونے کی وجہ سے رسول اکرم ﷺ کی حمایت کی۔ مگر یہ فارسی، رومی اور حبشی آپ کی تائید کر رہے ہیں۔)

یہ بات سن کر حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے اس منافق کا گریبان پکڑ لیا اور نبی کریم ﷺ کے پاس لا کر اس کی بات دہرائی۔ آپ ﷺ غضبناک ہو کر اٹھے اور چادر گھسیٹتے ہوئے مسجد میں تشریف لائے۔ پھر اعلان کیا گیا کہ نماز باجماعت ہوگی۔ اس کے بعد آپ نے یہ خطبہ دیا۔

"اے لوگو! پروردگار ایک ہے۔ باپ بھی ایک ہے، دین بھی ایک ہے، عربیت نہ تمہارا باپ ہے نہ ماں۔ بلکہ وہ ایک زبان ہے جو عربی بولتا ہے وہ عرب ہے۔" اس کے بعد حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر عرض کرنے لگے۔

"آپ اس منافق کے بارے میں کیا حکم دیتے ہیں؟"

فرمایا "اسے دوزخ کے لئے چھوڑ دو۔" چنانچہ قیس مرتد ہو کر قتل کیا گیا۔

اگر مسلمان اسی محمدی تربیت پر قائم رہتے تو کیا اس میں قومیت اور زبان کے اختلاف کی وجہ سے وہ تمام نااتفاقیاں اور جنگیں برپا ہو سکتی تھیں؟ جو حقیقت میں رونما ہوئیں اور ان کی بدولت ان میں عام کمزوری پیدا ہوئی۔ اگر مسلمانوں نے اس اسلامی اخوت کی حفاظت کی ہوتی تو کیا گزشتہ زمانوں میں عربوں کے خلاف "شعوبیت" کی مجوسی تحریک پیدا ہو سکتی تھی؟ اور اس کے بعد ترکی میں تعصب کی موجودہ تحریک رونما ہو سکتی تھی؟ ہرگز نہیں۔ اگر مسلمان اسلامی اخوت کی حفاظت کرتے تو اخوت کی یہ تحریک چاروں طرف پھیل جاتی اور اس کے ذریعے دنیا کی تمام قوموں کی اصلاح ہوتی۔

بعض کوتاہ بین اور کوتاہ نظر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مختلف قوموں میں لسانی اتحاد پیدا کرنا انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ اس کے جواب میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مذہبی اتحاد بہت زیادہ خلاف فطرت انسانی ہے۔ بشرطیکہ انسان سے مراد تمام انسانی افراد ہوں۔ چنانچہ حکماء لگاتار کوشش کرتے چلے آئے ہیں کہ سب انسانوں کی ایک مشترکہ زبان ہو جائے۔ حالانکہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ بعض زبانیں اپنے اہل زبان کی ترقی کی وجہ سے علوم و فنون میں اس قدر ترقی کر چکی ہیں کہ انہیں بولنے والی قومیں ہرگز کسی دوسری زبان کو استعمال نہیں کر سکتیں۔ تاہم ان دانشمندوں نے قوموں کو کسی ایک ہی مذہب پر جمع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ قرآن کریم جس نے اپنی شریعت اور اپنی زبان کے ساتھ ساتھ سب انسانوں کے لئے ایک ہی دین ضروری قرار دیا ہے وہ بھی ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ انسانی تخلیق کے سلسلے میں حکمت خداوندی یہ نہیں ہے کہ سب آدمی ایک ہی قوم بن جائیں اور ایک ہی مذہب کو تسلیم کرلیں۔ جیسا کہ وہ ارشاد فرماتا ہے:

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿١١٨﴾

اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ (۱۱: ۱۱۸، ۱۱۹)

(اگر تیرا پروردگار چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی قوم بنا دیتا۔ مگر وہ لوگ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے۔ سوائے اس پر جس پر تمہارا پروردگار رحم فرمائے۔ اس نے انہیں اس لئے پیدا کیا ہے۔)

اس رحمت کی طرف خدا نے انسانوں کو اس لئے بلایا ہے کہ ان کی وہ بدبختی کم ہو جائے جو باہمی اختلاف سے پیدا ہوتی ہے۔ یہی وہ اختلافات ہیں جنہوں نے دنیا کی سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور ترقی یافتہ قوموں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ دنیا بھر سے حاصل کی ہوئی دولت کو ان جنگوں کی تیاریوں میں صرف کریں جو ان کے تہذیب و تمدن کو تباہ و برباد کرنے کے درپے ہے۔

اگرچہ انسانی طبیعت کا یہ تقاضا ہے کہ تمام انسان کسی ایک زبان، کسی ایک مذہب اور کسی ایک اصول پر متفق نہ ہوں۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سب لوگوں کو نیکی اور صداقت کی دعوت نہ دی جائے بلکہ لامحالہ دعوت دینے کی صورت میں بہترین افراد صحیح بات کو مانیں گے اور جیسا کہ قاعدہ ہے، حق، باطل پر ضرور غالب آئے گا۔

بعض علماء اس مشکل میں پھنس گئے ہیں کہ ان اسلامی اصولوں کو نافذ کرنے کے

مخاطب کون ہیں؟ان کے اس اشکال کو دور کرنے کے لئے میں نے انہیں یہ جواب دیا کہ اسلامی زبان کو عام کرنے کے مخاطب وہ صاحب اقتدار و حکم افراد ہیں جنہیں دعوت اسلام اور اسلامی شریعت کو نافذ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد خلفاء اسلام یہ کام سرانجام دیتے رہے ہیں، جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔

اسلام نے تمام انسانوں کو صرف ایک مذہب کی طرف بلایا ہے جو لسانی وحدت اور قوموں کی تمام ضروریات کا کفیل ہے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قومیں جوق در جوق دین اسلام میں داخل ہونے لگیں ۔ یہاں تک کہ ایک صدی کے اندر اسلام کا دائرہ عمل بحر اوقیانوس سے ہند و چین کی انتہائی سرحدوں تک وسیع ہو گیا۔ اگر اسلام میں بدعات رونما نہ ہوتیں اور مسلمانوں کی حکومتیں ظلم و استبداد میں مبتلا نہ ہوتیں، نیز مسلم قوموں میں جہالت، نااتفاقی، فتنے و فساد برپا نہ ہوتا تو عام انسانیت کی اکثریت اسلام کی حلقہ بگوش بن جاتی اور اسلام کی زبان (عربی) کو اسلامی حلقہ بگوشوں کی عام زبان تسلیم کیا جاتا، کیونکہ قوموں کا مزاج بہتر اشیاء کو اختیار کر لینے پر ہمیشہ آمادہ رہتا ہے۔ بشرطیکہ قومیں انہیں اچھی طرح پہچان لیں۔ چنانچہ ہمیں قرآن کریم نے یہ تعلیم دی ہے کہ انسانی سماج کا یہ فطری قانون ہے کہ جب حق و باطل، مفید اور مضر اور نیک و بد کی کشمکش ہوتی ہے تو آخرکار افضل چیز غالب آتی ہے اور زیادہ طاقتور شے پائیدار اور برقرار رہتی ہے۔ حق کی باطل شکنی کے سلسلے میں قرآنی آیات ملاحظہ کیجئے اور قرآن کریم کی اس مثال سے نصیحت حاصل کیجئے۔

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِى النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ (۱۳:۱۷)

(خدا نے آسمان سے پانی برسایا اور اس کے مطابق ندی نالے بہنے لگے اور سیلاب پھولا ہوا جھاگ اوپر اٹھا لایا اور جسے زیور یا اور کوئی سامان بنانے کے لئے آگ میں جلاتے ہیں وہ بھی جھاگ کی طرح ہوتا ہے۔ تاہم جھاگ تو خشک ہو کر غائب ہو جاتا ہے مگر جو چیز لوگوں کے کام آتی ہے وہ زمین میں برقرار رہتی ہے۔ اسی طرح خدا مثالیں بیان کرتا ہے۔)

قسطنطنیہ میں ایک جرمن عالم نے بعض مسلمانوں سے جن میں مکہ معظمہ کی ایک

معزز شخصیت بھی تھی، یہ کہا "ہمیں چاہئے کہ اپنے پائے تخت برلن کے کسی میدان میں معاویہ بن ابی سفیان کا طلائی مجسمہ نصب کریں۔" اس سے پوچھا گیا۔ "یہ کیوں؟" وہ کہنے لگا۔ "یہ اس لئے کہ معاویہ ہی نے جمہوریت کے مرکز سے ہٹ کر اسلامی نظام حکومت کی بنیاد قومی تعصب اور اقتدار پرستی پر قائم کی۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اسلام ساری دنیا میں پھیل جاتا اور ہم جرمن اور مغرب کی تمام قومیں عرب مسلمان بنی ہوئی ہوتیں۔"

در حقیقت اس جرمن عالم کو اس کے اس قومی تعصب اور اس مغربی تکبر نے فریفتہ کر رکھا ہے۔ جس نے اس کی قوم اور اس کے ہمسایوں کو گزشتہ جنگ عظیم میں زبردستی دھکیل دیا تھا جس کی وجہ سے یورپ کو دو کروڑ انسانوں کا جانی نقصان برداشت کرنا پڑا اور اربوں پونڈ کا مالی نقصان بھی اٹھایا اور آخر میں اس کی قوم ذلت اور تباہی کے غار میں گر گئی۔ اس جرمن عالم کو اسلامی ہدایت پسند نہیں آئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جرمن تعصب نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی جس کی وجہ سے وہ عام انسانی فلاح کا تصور نہیں کر سکتا۔ اگر وہ غور و فکر کے بعد اس پر نظر دوڑاتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ عالم انسانیت کے لئے یہی بہتر اور مناسب تھا کہ اس کی سب قومیں متحد ہو کر اپنے افراد کے کارناموں اور علوم و فنون پر فخر کرتیں اور اپنے نسب، وطن اور تفریق پیدا کرنے والی زبانوں پر ناز نہ کرتیں۔ یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اس عالم انسانیت کی فلاح کا راستہ صرف ایک ہی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اسلامی ہدایت سے مستفید ہو۔ اگر آج بھی یورپ اسلام کا حلقہ بگوش ہو جاتا تو اس کے سب تعصّبات ملکی اور بغض و عداوت ختم ہو جاتی اور وہ ہمہ تن متوجہ ہو کر انسانی فلاح اور ملکی تعمیر کے لئے علوم و فنون کی ترقی میں مصروف ہو جاتا۔ مگر یورپ کا اپنی سفید چمڑی پر ناز کرنا اور کالی، سرخ، گندم گوں اور زرد قوموں کو حقارت سے دیکھنا۔ ان کے حقوق کو ہضم کر لینا اور ان پر ظلم و ستم کرنا، ان کی تہذیب و تمدن پر سیاہ داغ ہے اور بعد میں (جاپانیوں کی حیرت انگیز ترقی کی وجہ سے) انہیں اس جذبہ حقارت سے مستثنیٰ کرنا مزید بدنامی کا باعث ہے۔ حالانکہ عالمگیر انسانیت کا اسلامی تمدن اس (مغربی تمدن) سے ہزاروں میل بلند ہے۔

کیا اب یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ یہ اسلامی اصول جو قوموں کو متحد کرتے ہیں اور ان میں ایسی فطری الفت اور محبت پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں، جو خود بخود ان کے دل میں

پیدا ہوتی ہے اور فوجی دباؤ کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ حضرت محمد ﷺ کی ذاتی رائے اس ادھیڑ عمر میں نفسیاتی الہام کا نتیجہ ہو سکتے ہیں؟ حالانکہ یہ وہ اصول ہیں جن کی وجہ سے آپ ﷺ تمام پیغمبروں اور حکماء سے فوقیت لے گئے ہیں۔ ایسی صورت میں کیا یہ معقول بات نہیں ہے کہ یہ اصول اس خدائی وحی کا نتیجہ ہیں جو محمد ﷺ پر نازل ہوئی۔

قرآن کریم کا مقصد پنجم

اسلام کے شخصی قوانین

اس باب میں ہم اسلام کے محاسن بیان کرتے ہیں جو شخصی قوانین یعنی حرام و حلال سے تعلق رکھتے ہیں اور اجمالی طور پر ہم ان اہم باتوں کو دس قاعدوں میں بیان کرتے ہیں۔

۱۔ اسلام ایک ایسا معتدل مذہب ہے جس میں روح و جسم کے حقوق اور دنیا اور آخرت کے مفادات باہم مجتمع ہو گئے ہیں۔ چنانچہ خدا نے فرمایا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (۲: ۱۴۳)

(ہم نے تمہیں درمیانی قوم بنایا ہے تاکہ تم نمونہ بن کر لوگوں پر گواہ بنو اور رسول تم پر گواہ بنیں۔)

اس آیت کی تشریح اور شہادت کے معنی صفحہ ۱۵۳ میں بیان کر دیئے گئے ہیں اور اس کی وضاحت تفسیر المنار کے دوسرے حصے کے ابتداء میں اس طرح بیان کی گئی ہے کہ مسلمانوں کی راہ ان قوموں کے درمیان ہے جن پر جسمانی خواہشوں اور مادی مفادات کا غلبہ ہے جیسے یہودی یا ان کے برخلاف وہ لوگ ہیں جن پر روحانیت، ریاضت، نفس کشی اور زہد غالب ہے جیسے ہندو اور عیسائی گو ان مذاہب کی اکثریت اپنی مذہبی تعلیمات کے برخلاف راہ پر گامزن ہے۔

۲۔ اسلام کی منزل مقصود ہے کہ وہ انسانوں کو صحیح ایمان، معرفت الٰہی، عمل صالح، شریفانہ اخلاق اور اچھے کاموں کے ذریعے تزکیہ نفس کر کے دنیا اور آخرت

میں کامیاب کرے۔ اسلام میں محض اعتقاد رکھنا اور صرف عقائد پر بھروسہ کرلینا یا شفاعت اور معجزات پر اکتفا کرنا ہی کافی نہیں ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

۳۔ اسلام کی غرض وغایت یہ ہے کہ انسانوں میں تعارف اور محبت بڑھے نہ کہ اختلاف و تفریق میں اضافہ ہو جیسا کہ دشمنان مذاہب خیال کرتے ہیں۔ یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اسلام عالمگیر مذہب ہے اور تمام پیغمبروں کے مذاہب کی تکمیل کرتا ہے اسی لیے حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ تمام دنیا کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ مقصد دوم میں رسولوں کے فرائض بیان کیے گئے ہیں اور مقصد چہارم میں بھی ابھی ہم اتحاد کے آٹھ اصولوں کی تفصیل بیان کر چکے ہیں۔

۴۔ اسلام آسان مذہب ہے اس میں کسی طرح کی تنگی سختی اور زبردستی نہیں۔ خدا فرماتا ہے۔

(۱) لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (۲:۲۸۶)

(خدا کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔)

(۲) وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ (۲:۲۲۰)

(اگر خدا چاہتا تو تمہیں سختی میں ڈال دیتا۔)

(۳) يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (۲:۱۸۵)

(خدا تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے سختی نہیں چاہتا۔)

(۴) وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (۲۲:۷۸)

(اللہ کی راہ میں ایسا جہاد کرو جیسا کہ اس کا حق ہے اس نے تمھیں منتخب کر لیا ہے اور دین کے معاملے میں تم پر کوئی سختی نہیں کی۔)

(۵) مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ (۵:۶)

(خدا نہیں چاہتا ہے کہ تم پر سختی ڈالے۔)

اس اصول کے تحت یہ مسئلہ بھی ہے اگر کسی فرض کا ادا کرنا مسلمان پر بار ہو، ادا کرنے میں تکلیف ہوتی ہو تو اسی سے وہ فرض یا تو بالکل ساقط ہو جاتا ہے یا اسکا عوض قبول کر لیا جاتا ہے جیسے کہ بیمار جس کے تندرست ہونے کی توقع ہو یا بالکل توقع نہ ہو یا کوئی شیخ فانی ہو، اول الذکر سے روزہ ساقط ہو جاتا ہے اور بعد میں تندرست ہونے پر مسافر روزہ کی

قضا کرے مگر شیخ فانی پر روزہ کی قضا بھی نہیں ہے بلکہ اس کا کفارہ یہ ہے کہ اگر استطاعت ہو تو ایک مسکین کو ہر دن کے بدلے کھانا کھلائے۔ اس طرح ضرورت پڑنے پر حرام بھی فی نص قرآن مباح ہو جاتا ہے۔ اگر حرام چیز کی حرمت یا مخالفت کسی خرابی کو دور کرنے کے لیے ہو تو وہ ضرورت کے موقع پر جائز ہو جاتی ہے جیسا کہ ہم سود، روزے اور حرام کھانوں کے متعلق آیات کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں۔ ہم اسلام کی سہولتوں کو رسالہ المنار اور تفسیر المنار میں متعدد مقامات پر بیان کر چکے ہیں جس کی زیادہ تفصیل تفسیر (۵:۱۰۴) میں ہے اور ایک مستقل رسالہ میں بھی اسے جمع کر دیا گیا ہے۔

۵۔ اسلام نے مذہبی بے اعتدالی اور انتہا پسندی کو منع کیا ہے وہ نفس کشی اور نفس کو تکلیف پہنچانے کا قائل نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام نے فضول خرچی اور تکبر کے جذبے کے بغیر زیب و زینت کرنے اور عمدہ چیزیں استعمال کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔ اس کی تفصیل ہم نے سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران کی ان آیات میں بیان کی ہے جن میں عمدہ اور پاکیزہ اشیاء کھانے کا حکم دیا گیا ہے نیز مندرجہ ذیل آیات کی تشریح میں بھی ہم نے یہ مضمون بیان کیا ہے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِىَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ (۷:۳۱-۳۲)

(اے فرزندان آدم! اپنی آرائش عبادت کے موقع پر اختیار کرو کھاؤ اور پیو (مگر) فضول خرچی نہ کرو کیونکہ وہ (خدا) فضول خرچی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے (اے پیغمبر) کہہ دیجئے کہ خدا کی اس زینت کو اور کھانے کی ان پاکیزہ چیزوں کو کس نے حرام کیا ہے؟ جو اس نے اپنے بندوں کے لیے جاری کی ہیں۔ کہہ دیجئے یہ چیزیں ایمان والوں کے لیے دنیا میں ہیں اور آخرت میں بھی خالص انہی کے لیے ہیں اس طرح ہم آیات کی تفصیل ان لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔)

نیز یہ بھی ارشاد فرمایا:

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ (۴:۱۷۱)

(اے اہل کتاب اپنے مذہب میں حد سے آگے نہ بڑھو۔)

ایسی بداعتدالی کی ممانعت مسلمانوں کے لیے اور زیادہ اہم ہے کیونکہ ان کا مذہب

رحمت اور آسانی کا مذہب ہے۔ چنانچہ عبادت میں انتہا پسندی پاکیزہ چیزوں کو چھوڑ دینے رہبانیت وغیرہ کی ممانعت میں جو صحیح احادیث مذکورہ ہیں وہ ان آیات کی تشریح اور مذہب اسلام کے اس نام کی تصدیق کرتی ہیں جو رسول اکرم ﷺ نے تجویز کیا تھا یعنی الحنفیہ السمحہ (سیدھا اور آسان مذہب)

۶۔ اسلام میں پابندیاں کم ہیں اور اس کے اصول عام فہم ہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ صحرائے عرب کے بدو آتے ہی مسلمان ہو جاتے تھے اور آپ ﷺ ایک ہی نشست میں انہیں اسلامی فرائض اور حرام چیزوں سے آگاہ کر دیتے تھے۔ چنانچہ ہر ایک انہیں سمجھ کر اس پر عمل کرنے کا وعدہ کر لیتا تھا اور آپ ﷺ یہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر یہ اعرابی اپنے وعدہ پر سچا رہا تو وہ فلاح پا گیا۔ انہی آسانیوں کی بدولت اسلام عوام میں جلد مقبول ہو گیا مگر (بعد کے) فقہاء نے اپنے اجتہادی خیالات سے اس میں مزید پابندیوں کا اضافہ کر دیا جس کی وجہ سے اس کا سمجھنا اور اس پر عمل کرنا بہت مشکل ہو گیا۔ اس سلسلے میں دن رات پانچ نمازوں کو پڑھنا قابل اعتراض نہیں ہے کیونکہ ہر نماز پانچ منٹ میں ادا کی جا سکتی ہے۔ ان میں رات بھر سونے کے بعد نماز فجر اور سونے سے پہلے نماز عشاء بھی شامل ہے۔ لہٰذا کیا سارے دن میں پندرہ منٹ کی تین نمازیں پڑھنی کسی انسان کے لیے مشکل ہو سکتی ہیں؟

اگر اس پر یہ اعتراض کیا جائے کہ نماز کے لیے طہارت کی شرط بھی ہے اس کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں کہ جسم اور لباس کی طہارت نہ صرف مذہبی حیثیت سے بلکہ طبّی حیثیت سے بھی ضروری ہے۔ یہ طہارت نماز سے پہلے ہوتی ہے اس کے ذریعے دن کے وقت کسی مسلمان کا نہ وقت ضائع ہوتا ہے اور نہ اس کے کام میں حرج واقع ہوتا ہے بلکہ ضروری غسل بھی رات یا صبح کے وقت ہوتا ہے لہٰذا کاروباری اوقات میں وضو کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے سوائے اس کے کہ وہ لوگ جو جرابیں یا نئے قسم کے جوتے پہنتے ہیں ان کے لیے پاؤں کا دھونا کچھ مشکل معلوم ہوتا ہے مگر جو کوئی وضو کرنے کے بعد انہیں پہن لے اس کے لیے پاؤں دھونے کے بجائے ان پر مسح کر لینا کافی ہو گا۔ بہر حال نماز اور طہارت کے روحانی اور جسمانی فوائد انمول ہیں۔ نماز سے روح کی صفائی اور تزکیہ نفس ہوتا ہے کیونکہ نماز ہی میں ایک مومن اپنے خدا سے مناجات اور سرگوشیاں کرتا ہے اس

طرح نماز اسے برے کاموں سے بچاتی ہے۔

۷۔ مذہبی قیود ورسوم پر دو طرح سے عمل کیا جاتا ہے (۱) سختی کے ساتھ عمل کرنا جسے "عزیمت" کہا جاتا ہے (۲) نرمی کے ساتھ عمل کرنا اسے رخصت کہا جاتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رخصت کے پہلو کو ترجیح دیتے ہیں اور حضرت عبداللہ بن عمر عزیمت کو پسند کرتے ہیں۔ بہر حال لوگوں کی عملی قوت میں سستی چستی اور اعتدال میں کافی فرق ہوتا ہے اس وجہ سے اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ سادہ لوح بدوی سے لے کر ایک فلسفی حکیم تک اور ان دونوں کے درمیانی طبقے کے تمام لوگوں کے مزاج کے موافق رہا ہے۔ اس فرق مراتب کو خدا نے اس طرح بیان کیا ہے۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ (۳۵:۳۲)

(پھر ہم نے کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنایا جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے انتخاب کیا تھا۔ ان میں کچھ اپنے نفس پر ظلم کرتے ہیں۔ کچھ اعتدال پسند ہیں اور کچھ خدا کے حکم سے نیک کاموں میں سبقت کرتے ہیں یہی بہت بڑی مہربانی ہے۔)

۸۔ کتاب وسنت دونوں میں اس حقیقت کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ عقل وفہم اور ہمت میں انسان مختلف درجوں کے ہیں اس لیے قطعی اور بنیادی احکام کی پابندی سب کے لیے ضروری رکھی گئی ہے مگر غیر قطعی احکام میں چونکہ ہر ایک کی سمجھ ایک دوسرے سے جداگانہ ہے اس لیے ہر ایک اپنے اجتہاد اور سمجھ کے مطابق اس پر عمل کرتا ہے یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ اپنے ہر صحابی کے اجتہاد کو صحیح قرار دیتے تھے۔ چنانچہ جب شراب اور جوئے کے بارے میں سورہ بقرہ کی آیت نازل ہوئی جس سے ان دونوں کی حرمت پر ظنی دلیل قائم ہوتی تھی تو اس موقع پر بعض صحابیوں نے اس کو چھوڑ دیا اور بعض نے نہیں چھوڑا۔ رسول اکرم ﷺ نے دونوں کے اجتہاد کو برقرار رکھا یہاں تک کہ سورہ مائدہ کی وہ آیات نازل ہوئیں جن میں شراب اور قمار بازی کی قطعی حرمت بیان کی گئی تھی۔

خدا فرماتا ہے۔

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ (۲۹: ۴۳)

(یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں مگر انہیں وہی سمجھتے ہیں جو اہل علم ہیں۔)

اس کی توضیح یہ ہے کہ عام مذہبی فرائض اور عام مذہبی محرمات صرف نص قطعی ہی ثابت ہو سکتے ہیں جسے ہر کوئی سمجھ سکے۔ فرائض کے بارے میں یہ حنفی فقہاء کا مسلک ہے تاہم محرمات میں علمائے سلف اس پر متفق ہیں مگر وہ آیات جن کا سمجھنا ظن غالب پر موقوف ہے اور وہ احادیث جن کی روایت اور مفہوم ظنی ہے قطعی نہیں ہے۔ تو ان پر عمل کا دار ومدار ان لوگوں کے اجتہاد پر موقوف ہے جن کے نزدیک عبادات اور ذاتی اعمال میں ان کا وجود ثابت ہو جائے۔ عدالتی معاملات اور سیاسی مسائل میں ارباب اقتدار کے اجتہاد پر عمل ہوگا۔ اس کی تشریح ہم اپنی تفسیر اور المنار میں کئی مقامات پر بیان کر چکے ہیں۔

۹۔ عوام کے ساتھ ان کی ظاہری حالت کے مطابق سلوک کیا جائے گا۔ باطن کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہوگا لہٰذا اسلامی احکام اور افسروں کو بلکہ خود خلیفۃ المسلمین کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ وہ کسی شخص کو اس کے دلی عقائد یا پوشیدہ خیالات کی بنیاد پر سزا دے یا اس سے باز پرس کرے۔ سزا اسی وقت دی جا سکتی ہے جب دوسروں کے حقوق اور مفادات کو چھین کر عام قوانین کی مخالفت کی جائے۔ اس اصول کی تفصیل ہم سورۂ توبہ کی تفسیر کے خلاصہ میں بیان کر آئے ہیں۔

۱۰۔ اسلام میں تمام ظاہری عبادات کا دار ومدار اسی پر ہے کہ بظاہر رسول کریم ﷺ کے بتائے ہوئے طریقہ کی اتباع کی جائے۔ اس معاملے میں کسی کی ذاتی رائے یا اس کی قیادت مداخلت نہیں کر سکتی ہے۔ باطنی عبادت کا اصل مفہوم یہ ہے کہ خدا کی سچے دل سے مخلصانہ طریقے سے عبادت کی جائے۔ ان دونوں معاملات میں بکثرت قرآنی آیات اور احادیث موجود ہیں۔ ان دس اصولوں میں ہر ایک اصول اس لائق ہے کہ اسے وحی کے مقاصد میں سے خاص مقصد قرار دیا جائے اور اس کے ذریعے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ یہ وحی خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے، اور حضرت محمد ﷺ کے ذاتی خیالات اور ادھیڑ عمر میں نفسیاتی الہامات کا نتیجہ نہیں ہے، اس وحی نے مذہبی رہنماؤں کی ان تمام خرابیوں کو دور کر دیا ہے جو نہ صرف لوگوں کے عقائد اور اعمال پر مسلط تھیں بلکہ ان کے جذبات اور احساسات پر بھی ان کا تسلط تھا۔ مگر آپ کو ان

خرابیوں کی تفصیلات کا علم نہ تھا۔

یہ بات ہم نے یہاں مختصر طور پر بیان کی ہے کیونکہ ہمارے زمانے کے لوگ بہت مصروف ہیں اور طوالت سے اکتا جاتے ہیں۔

قرآن کریم کا مقصد ششم
اسلامی حکومت کی نوعیت، بنیاد اور عام اصول

اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو ہدایت، قیادت، سیاست اور حکومت کا مجموعہ ہے کیونکہ اسلام نے انسانیت کے مذہبی معاملات نیز سماجی اور قانونی مفادات کی اصلاح کے سلسلے میں جو قدم اٹھایا ہے اس کا دارومدار اسی پر ہے کہ عمدہ قیادت کی ایسی حکومت قائم کی جائے جس کی بنیاد حق وانصاف پر ہو اور وہ ملک ومذہب کی حفاظت کرنے کے قابل ہو۔ اس بارے میں اسلام نے چند اصول وقواعد مقرر کیے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

اسلامی حکومت کی بنیاد:

اسلام میں حکومت کا اختیار قوم کی ہاتھ میں ہے اور یہ حکومت تمام قوم سے مشورہ حاصل کرتی ہے۔ اس حکومت کا صدر مسلمانوں کا امام یا خلیفہ ہوتا ہے جو اسلامی شریعت کو نافذ کرتا ہے مگر خلیفہ کو معزول کرنے یا مقرر کرنے کا اختیار قوم ہی کو حاصل ہے۔ خدا نے مومنوں کی شان میں فرمایا۔

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲:۳۸)

(ان کا معاملہ آپس کے مشورے پر ہے۔)

بلکہ خود رسول اللہ ﷺ کو یہ حکم دیا گیا۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (۳:۱۵۹)

(مسلمانوں سے مشورہ کیا کیجئے۔)

چنانچہ آپ ﷺ اپنے صحابیوں سے ان تمام سیاسی، فوجی، مالی اور ان عام مفادات

میں مشورہ لیتے تھے جن کے بارے میں کتاب اللہ کی صریح ہدایت نہیں ملتی تھی۔ میں نے اس آیت کی تفسیر میں یہ واضح کیا ہے کہ مشورہ کو قوم کے اجتہاد اور رائے پر چھوڑ دینے میں کیا مصلحت ہے کیونکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جو حالات اور زمانوں کے اختلاف کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے اور اگر اسے کسی نظام کے ساتھ وابستہ کر دیا جاتا تو یہ چیز بھی مذہبی فریضہ اور عبادت میں شامل ہو جاتی۔ (ملاحظہ ہو تفسیر المنارج ۴ صفحہ ۹۹)

اس بارے میں خدا فرماتا ہے۔

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا

(۵۹:۴)

(اے ایمان والو! خدا کی اطاعت کرو اور رسول اور ان لوگوں کی اطاعت کرو جو تم میں سے صاحب اقتدار ہیں اگر کسی بات میں تمہارا جھگڑا ہو جائے۔ تو اس بات کو خدا اور رسول کی طرف لے جاؤ اگر اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی بہتر ہے اور نتیجہ کے لحاظ سے اچھی بات ہو گی۔)

"الوالامر" قوم کے وہ اہل حل وعقد اور ارباب بصیرت ہیں۔ جن پر قوم بھروسہ کرتی ہے اور ان کی تجاویز کی پیروی کرتی ہے، اس تعریف کا ثبوت اس سورت کے بعد کی یہ آیت ہے۔

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ (۴: ۸۳)

(جب انہیں امن یا خوف کا کوئی معاملہ پیش آتا ہے تو وہ اسے شہرت دیتے ہیں حالانکہ اگر اسے رسول اور اپنے ارباب اقتدار کے پاس لے جاتے تو اسے وہ لوگ معلوم کر لیتے جو معاملات کو سمجھتے ہیں۔)

لہٰذا اولو الامر وہ لوگ تھے جو رسول اللہ کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کے سامنے قوم کے عام معاملات پیش کیے جاتے تھے خواہ ان کا تعلق امن سے ہو یا جنگ سے۔ آپ ﷺ ان سے نازک، اہم اور پوشیدہ معاملات میں مشورے لیا کرتے تھے اس طرح آپ ﷺ ان معاملات میں جن کا تعلق سب لوگوں سے ہے تمام مسلمانوں سے مشورہ کرتے تھے اور اکثریت کی رائے پر عمل کرتے تھے خواہ وہ آپ ﷺ کی ذاتی رائے کے برخلاف کیوں نہ ہوں۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے جنگ احد میں عام مسلمانوں سے ان دو باتوں میں سے ایک

پر مشورہ طلب کیا کہ آیا مدینہ میں محصور ہو کر بیٹھ جائیں یا احد میں جا کر مشرکوں کا مقابلہ کریں۔ آپ ﷺ اور بعض اکابر صحابہ محاصرہ کے حق میں تھے مگر جمہور کی رائے اس کے برعکس تھی لہٰذا اکثریت کی رائے پر عمل کیا گیا (یہ عام مشورہ کی مثال ہے) مگر جنگ بدر کے قیدیوں کے بارے میں آپ ﷺ نے خاص ارباب بصیرت حضرات سے مشورہ کیا اور اس معاملہ میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی رائے پر عمل کیا جیسا کہ ہم نے سورۃ انفال کی تفسیر میں بیان کیا ہے اس وقت تک مشورہ کے حکم کی آیت نازل نہیں ہوئی تھی کیونکہ یہ آیت جنگ احد میں نازل ہوئی تھی۔ جنگ بدر کا معرکہ سن ۲ھ میں ہوا اور جنگ احد سن ۳ھ میں ہوئی۔

میں نے پہلی آیت کی تفسیر میں اسلامی حکومت کے اصول بیان کر دیے ہیں اور یہ بھی بتایا ہے کہ یہ اصول اس پارلیمانی حکومتوں سے بہتر ہیں جو موجودہ زمانے کے ممالک میں رائج ہیں۔ (ملاحظہ ہو تفسیر جلد ۵ صفحہ ۱۸۰۔ ۲۲۲ نیز کتاب الخلافۃ)

یہ بات بکثرت دلائل سے ثابت ہے کہ اسلام میں عدالتی اور سیاسی قانون سازی کا حق قوم ہی کو حاصل ہے جسے حدیث میں "جماعت" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ گذشتہ دونوں آیات میں جو عام الفاظ حکومت اور سلطنت اور دوسرے احکام کے بارے میں مذکور ہیں ان میں قرآن کریم نے مومنوں ہی کو خطاب کیا ہے جیسا کہ اس آیت کریمہ میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۹:۱)

(اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکوں سے بیزاری ہے جن کے ساتھ تم عہد کر چکے تھے۔)

اس کے بعد کی آیات میں بھی جو معاہدات اور صلح اور جنگ کے معاملات سے تعلق رکھتی ہیں اسی طرح کا خطاب کیا گیا ہے نیز سورہ بقرہ آل عمران اور انفال میں بھی اس قسم کی آیات مذکور ہیں۔ اسی طرح کی ایک آیت کریمہ یہ ہے۔

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (۴۹:۹)

اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑیں تو ان کے درمیان صلح کرا دو لیکن اگر

ایک گروہ دوسرے پر سرکشی کرے تو سرکشی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع کرے۔ اس وقت انصاف کے ساتھ ان دونوں کے درمیان صلح کرادو اور انصاف کرو کیونکہ خدا انصاف پسندوں سے محبت کرتا ہے۔

اس طرح مالی احکام جیسے مال غنیمت اور اسے پانچ حصوں کی تقسیم کرنا نیز عورتوں کے معاملات میں بھی جماعت کو خطاب کیا گیا ہے (ان سب مسائل کو ان کے مواقع پر ہم اپنی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں)۔

علم اصول فقہ کے بعض بڑے علماء نے یہ تصریح کی ہے کہ اسلام میں مکمل اختیارات قوم کو حاصل ہیں۔ قوم کی جانب سے اس کے ارباب حل وعقد یہ اختیارات استعمال کرتے ہیں وہی خلفاء اور دیگر احکام کا تقرر کرتے ہیں اور بوقت مصلحت معزول بھی کر سکتے ہیں۔ امام رازی نے خلافت کی تعریف میں یہ کہا ہے۔

"خلافت دینی اور دنیاوی معاملات میں چند مخصوص اشخاص میں سے صرف ایک شخص کی قیادت اور حکومت کو تسلیم کر لینے کا نام ہے۔" اس تعریف میں چند مخصوص اشخاص کی قید اس لیے لگائی گئی ہے کہ اگر امام یا خلیفہ کو اس کے برے کاموں کی وجہ سے معزول کر دیا جائے تو حکومت کا اقتدار ان مخصوص اشخاص میں لوٹ جائے گا جن میں سے خلیفہ یا امام کا انتخاب کیا گیا تھا۔

علامہ سعد تفتازانی نے شرح مقاصد میں اس تعریف کا ذکر کرتے ہوئے یہ تحریر کیا ہے۔

"امام رازی کا مقصد یہ قید لگانے سے یہ ہے کہ قوم کے اہل حل وعقد پوری قوم کی نمائندگی کرتے ہیں اور انہی کا اقتدار عوام کے ہر فرد کے لیے مسلم ہے۔ قومی اقتدار کے مسئلہ کی تفصیل ہم اپنی کتاب "الخلافۃ" میں بیان کر چکے ہیں۔

اسلامی حکمرانی کا یہ بنیادی اصول انسانوں کی سب سے بڑی سیاسی اصلاح ہے جو اسلام نے اس زمانے میں مقرر کیا ہے جب تمام قومیں ایسی مطلق العنان اور ظالم حکومتوں کے پنجے میں گرفتار تھیں جنھوں نے مذہبی اور دنیاوی کاموں میں انہیں غلام بنا رکھا تھا۔ اس اصول کو سب سے پہلے عملی شکل دینے والے خود رسول اللہ ﷺ تھے۔ آپ ﷺ قوم کے عام سیاسی اور انتظامی معاملات میں مقتدر اور بارسوخ لوگوں کے مشورے کے بغیر

کوئی کام سرانجام نہیں دیتے تھے تاکہ آپ ﷺ کا یہ طریقہ آنے والی نسلوں کے لیے نمونہ بن جائے۔ آپ کے بعد خلفاء راشدین کا بھی یہی طرز عمل رہا۔ خلیفہ اوّل حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی بیعت کے بعد ہی منبر رسول سے یہ خطبہ دیا۔

"میں تمہارا حاکم بنا دیا گیا ہوں حالانکہ میں تم سب سے بہتر نہیں ہوں اگر میں راہ راست پر رہوں تو میری مدد کرنا اور اگر کجروی اختیار کروں تو مجھے درست کرو۔"

دوسرے خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "تم میں سے جو کوئی میرے اندر ٹیڑھا پن دیکھے تو وہ مجھے سیدھا کر دے۔"

یہ سن کر ایک بدو نے کہا "ہم تم میں کوئی کمی دیکھیں گے تو ہم اپنی تلواروں سے اسے سیدھا کر دیں گے۔" انہوں نے یہ سن کر فرمایا۔

"خدا کا شکر ہے کہ اس نے مسلمانوں میں ایسے لوگ پیدا کر دیے ہیں جو عمر رضی اللہ عنہ کی کجی کو تلواروں کے ذریعے درست کر سکتے ہیں۔"

آپ کا یہ دستور تھا کہ آپ اہل علم اور عقلمند صحابہ رضی اللہ عنہ کو جمع کر کے ایسے ہر معاملہ میں ان سے مشورہ طلب کرتے تھے جس کی صراحت نہ کتاب اللہ میں ہوتی تھی اور نہ سنت نبوی میں اور نہ رسول اکرم ﷺ کا کوئی فیصلہ ملتا تھا۔

خلیفہ سوم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بیعت کے بعد فرمایا تھا "میرا فیصلہ تمہارے فیصلہ کے مطابق ہوگا۔"

خلیفہ چہارم حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کا بھی یہی طرز عمل تھا۔ اگرچہ ان کا کوئی مختصر جملہ مجھے اس وقت یاد نہیں ہے۔

جب کہ خدا نے خود اپنے رسول کے لیے مشورہ کو ضروری قرار دیا ہے تو دوسروں کے لیے یہ اور زیادہ ضروری ہے بلکہ یہ نامناسب ہے کہ اسلام کا نظام حکومت، عربی ملکہ سبا کی حکومت سے کم تر ہو جو مشورہ کی پابند تھی۔ دوسری قوموں میں بھی اس قسم کا نظام جاری تھا۔ مگر اسلام کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ اس نے خدا کے ارشاد، رسول ﷺ کی عملی سنت، خلفاء راشدین کی سیرت اور اجماع امت کو پیش نظر رکھ کر اس طریقہ کو مذہب کا ضروری اور مسلم الثبوت حصہ قرار دیا۔ خواہ فقہاء اس سے ناواقف رہے ہوں کیونکہ انہوں نے بادشاہوں اور حاکموں کو خوش کرنے کے لیے مشورہ کی حکومت کو

واجب نہیں قرار دیا بلکہ مستحب کہا ہے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ بعد میں اکثر مسلمان بادشاہ اس سیدھے راستے سے بھٹک گئے تھے۔ رسوم پرست منافق علماء اور فتنہ پرداز جاہل خطیبوں نے ان کا ساتھ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اپنی مذہبی حکومت کے اس بنیادی قاعدے سے ناآشنا ہو گئے لیکن یہ اہل مغرب کی خوش نصیبی تھی کہ صلیبی جنگوں میں مسلمانوں کے جس بادشاہ نے ان پر فتح حاصل کی وہ اپنے نظام حکمرانی میں خلفاء راشدین اور حضرت عمر بن عبد العزیز کے نقش قدم پر گامزن تھا اس کا نام سلطان صلاح الدین ایوبی تھا۔ اس بادشاہ کے ایک ممتاز ساتھی نے جب اس سے ایک شخص کی فریاد کی تو سلطان نے کہا "میں خود کچھ نہیں کر سکتا، مسلمانوں کا قاضی ان کا فیصلہ کرتا ہے کیوں کہ شریعت کا قانون عام وخاص سب پر جاری ہے اور اس کے احکام و نواہی کی ضرور تعمیل کی جاتی ہے۔ میں اس کے سوا کچھ نہیں ہوں کہ شریعت کا غلام اور اس کا محافظ ہوں۔ حق بات کا ضرور فیصلہ کیا جائے گا خواہ وہ تمہارے حق میں ہو یا تمہارے برخلاف ہو۔"

سلطان کے اس قول کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ کوتوال یا پولیس افسر کی حیثیت سے شریعت کے احکام کو نافذ کرنے والا ہے، قاضی اپنے فیصلے میں قطعی آزاد ہیں کیونکہ وہ عدل و مساوات کے شرعی قوانین کے مطابق فیصلے کرتے ہیں۔

(سلطان صلاح الدین کے نظام حکمرانی کا مشاہدہ کرنے کے بعد) صلیبیوں نے حکومت کا یہ طریقہ اپنے ہاں رائج کرایا۔ پھر انہوں نے اسلامی تاریخ کا مطالعہ کیا اور اس کے مطالعہ کے بعد وہ ایسی باتوں سے واقف ہو گئے جن سے بعد کے اکثر مسلمان ناواقف ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی سلطنتوں کی حکومت کی بنیاد اسلام کے اس اصول پر قائم کی کہ حکومت اور اختیارات کا سرچشمہ عوام ہیں۔ مگر انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ خود اس (جمہوری) حکومت کے موجد ہیں بلکہ اسلامی حکومتوں کے استبداد پر نکتہ چینی کرنے لگے اور مذہب اسلام کو اس استبداد اور شخصی حکومت کا سبب قرار دینے لگے یہاں تک کہ وہ مسلمان جو خود اپنے مذہب اور تاریخ سے ناواقف تھے ان باتوں کی تصدیق کرنے لگے بلکہ مسلمان سیاست دان اور قانون پیشہ حضرات بھی یہ سمجھنے لگے کہ اسلامی حکومتوں کی اصلاح اہل مغرب کی تقلید ہی سے ہو سکتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی سب سے بڑی سیاسی اور

قانونی خصوصیات کا خاتمہ ہو گیا اور ان کی اکثر سلطنتیں برباد ہو گئیں اور ان پر یہ قول صادق آ گیا کہ وہ اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتھوں اور دشمنوں کے ہاتھوں ویران کر رہے ہیں حالانکہ وہ کروڑوں کی تعداد میں تھے مگر وہ خداوند تعالیٰ کے اس ارشاد کے مصداق بن گئے جو ان کے اولین دشمنوں کے حق میں فرمایا گیا تھا۔

يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِى الْمُؤْمِنِيْنَ فَاعْتَبِرُوْا يٰۤاُولِى الْاَبْصَارِ۝ (۵۹:۲)

(وہ اپنے گھروں کو اپنے ہاتھوں اور مسلمانوں کے ہاتھوں ویران کرنے لگے۔ للذا اے اہل بصیرت! اس سے عبرت حاصل کرو۔)

اسلامی قانون سازی کے اصول:

اہل سنت کے ہاں تشریع اسلامی کے اصول ہیں:

۱۔ قرآن کریم: علمائے اصول کہتے ہیں کہ مذہبی، قانونی اور سیاسی معاملات کے عملی احکام کی آیات، قرآن کریم کی تمام آیات کے دسویں حصہ سے زیادہ نہیں ہیں۔ بعض علماء نے عبادات و معاملات کی آیات کا شمار پانچ سو آیات بتایا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی مراد وہ آیات ہیں جن میں صریح اور واضح طور پر احکام بتائے گئے ہیں ورنہ قرآن کریم کا بیشتر حصہ مذہبی معاملات سے متعلق ہے کیونکہ اکثر دنیاوی معاملات کے فیصلہ کا حق لوگوں کے رسم و رواج اور ان کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

۲۔ سنت: رسول کریم ﷺ نے کتاب اللہ کے احکام کی وضاحت کرنے کے لیے اپنے قول اور عمل سے ایک طریقہ مقرر کر دیا ہے جسے سنت کہتے ہیں۔ علماء کرام نے یہ فرمایا ہے کہ بنیادی احکام کی احادیث صرف پانچ سو ہیں۔ البتہ مزید چار ہزار احکام کی احادیث ان کی تشریح و تفصیل کرتی ہیں۔

۳۔ اجماع امت: تمام اہل السنت اس بات پر متفق ہیں کہ مذہبی معاملات میں صحابہ کا اجماع سب کے لیے مسلم الثبوت ہے۔ شیعہ فرقہ کے نزدیک اہل بیت کا اجماع حجت ہے۔ البتہ مجتہدین کے اجماع کے مسئلہ کے لیے الگ تفصیل کی ضرورت ہے۔

۴۔ اجتہاد: قانونی، سیاسی، انتظامی اور جنگی معاملات میں آئمہ، حکام، قاضی اور سپہ

سالاروں کا اجتہاد بھی مسلم الثبوت ہے۔ بعض فقہاء نے اجتہاد کو قیاس کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے اور بعض علماء نے قیاس سے انکار کیا ہے اور بعض نے اسے مشروط ومقید طریقے سے تسلیم کیا ہے جیسا کہ ہم نے مختلف موقعوں پر اور بالخصوص آیت (۵۱ : ۱۰۱) کی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

یہی ترتیب مختلف احادیث میں بھی مد نظر رکھی گئی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسی پر عمل تھا جیسا کہ حضرت معاذ کی حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ جب رسول اکرم ﷺ مجھے یمن بھیجنے لگے تو آپ ﷺ نے مجھ سے دریافت کیا اگر تمھیں کسی معاملے میں فیصلہ کرنا پڑا تو کس طرح فیصلہ کرو گے؟ میں نے جواب دیا خدا کی کتاب کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ فرمایا اگر کتاب اللہ میں وہ موجود نہ ہو؟ کہا تو سنت رسول اللہ ﷺ کو اپنا رہبر بناؤں گا۔ فرمایا اگر سنت رسول میں بھی وہ موجود نہ ہو؟ میں نے کہا پھر میں اپنے اجتہاد اور رائے سے فیصلہ کروں گا اور اس میں کوتاہی نہیں کروں گا یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے میری پیٹھ ٹھونکی اور فرمایا خدا کا شکر ہے کہ اس نے رسول اللہ کے نمائندے کو یہ توفیق عطا فرمائی ہے کہ وہ اس کی مرضی کے مطابق کام کرے (یہ ابو داؤد اور ترمذی کی حارث بن عمر کے واسطہ سے روایت ہے) اس حدیث کی تائید میں دوسری نظیریں بھی ہیں بلکہ اسی ترتیب پر خلفاء راشدین رضی اللہ عنہ کا طرز عمل سب کو معلوم ہے اور ہم مناسب مقام پر اس کی تفصیل بیان کر چکے ہیں۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شرعی فیصلہ کے بارے میں اپنے قاضی شریح کو جو خط لکھا تھا وہ بہت مشہور ہے۔ لیکن بعض فقہاء نے اجماع کو یہاں تک کہ علماء اصول کے عرفی اجماع کو نص پر مقدم رکھا ہے مگر اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔

حکام کے لیے اجتہاد کا شرعی ثبوت اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے فرمایا "جب حاکم کے سامنے کوئی معاملہ پیش ہوتا ہے اور وہ اپنے اجتہاد اور رائے سے فیصلہ کرتا ہے تو اگر اس کا فیصلہ درست ہوتا ہے تو حاکم کو دوگنا ثواب ملتا ہے اور اگر غلط ہوتا ہے تو ایک ثواب ملتا ہے۔ ایک بڑی جماعت نے سوائے ترمذی کے حضرت ابو ہریرہ اور عمرو بن العاص سے یہ حدیث بیان کی ہے۔

بلکہ خود رسول اکرم ﷺ نے اپنے سپہ سالاروں کو یہ آزادی دے رکھی تھی کہ وہ مصلحت کے مطابق کام کیا کریں۔ چنانچہ آپ نے ایک سپہ سالار سے فرمایا تھا "جب تم کسی قلعہ کا محاصرہ کرو اور دشمن تم سے کہے کہ وہ فیصلہ الٰہی کے مطابق اطاعت کرنے پر آمادہ ہے تو تم یہ بات منظور نہ کرو اسے مجبور کرو کہ وہ تمہارے فیصلہ کے مطابق عمل کرے کیونکہ تمہیں خود نہیں معلوم ہے کہ آیا تم صحیح خدائی فیصلہ کے مطابق عمل کر سکو گے یا نہیں (اس حدیث کو احمد، مسلم، ترمذی اور ابن ماجہ نے بریدہ کے حوالے سے روایت کیا ہے) اس طرح یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ دشمن کو حاکم کی ذمہ داری میں چھوڑا جائے کیونکہ ممکن ہے کہ وہ اللہ اور اس کی ذمہ داری کو نہ بناہ سکے اور اسے توڑ دے۔ یہ حدیث سب سے زیادہ وسیع اور واضح ہے جس میں سیاسی اور فوجی احکام کے اختیارات خلفاء اور امراء اور سپہ سالاروں کے سپرد کیے گئے ہیں کیوں کہ ان کا تعلق عام اور قومی مفادات سے ہے جو وقت، مقام اور حالات کے اختلاف کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں اور یہی امام مالک کا مذہب ہے۔

اجتہاد کے قواعد :

کتاب وسنت میں بعض مذہبی احکام کا تعلق مخصوص کاموں اور مخصوص واقعات سے ہے جو بعض قانون سازی کے عام اصول ہیں۔ مخصوص احکام میں سے کچھ احکام ایسے ہیں جو صحیح روایت سے ثابت ہیں اور بالکل واضح ہیں ان میں اجتہاد کی گنجائش نہیں ہے اور نہ ان سے گریز کیا جا سکتا ہے سوائے اس کے کہ کوئی شرعی رکاوٹ پیش آجائے جیسے شبہ کی وجہ سے حد شرعی جاری نہ کی جائے یا کوئی ضرورت اور مجبوری کا عذر ہو جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قحط کے زمانے میں چور کا ہاتھ کاٹنے سے منع کر دیا تھا۔

بعض مذہبی احکام ایسے ہیں جو صاف اور واضح نہیں ہیں۔ ایسے معاملات میں حکام، قاضی اور سپہ سالاروں کے اجتہاد اور رائے پر عمل کیا جائے گا جیسا کہ عبادات اور محرمات کے باب میں بیان کیا جا چکا ہے۔

لیکن شریعت کے جو عام اصول و قواعد ہیں ان کی مختلف احکام میں ضرور پابندی کی جائے گی جن میں سے اہم اصول یہ ہے کہ ہر حالت میں حق و انصاف کو مدنظر رکھا جائے۔ قوانین شہادت اور احکام میں مساوات اختیار کی جائے۔ عوام کی بھلائی کا خیال رکھا جائے

اور فتنہ و فساد کو دور کیا جائے۔ عوام کے رسم ورواج کا مشروط طریقے سے لحاظ رکھا جائے نیز یہ کہ شبہ کا فائدہ ملزم کو دیا جاتا ہے اور اس کی وجہ سے شرعی سزا موقوف ہو جاتی ہے۔ ضرورت کے موقع پر حرام چیز بھی مباح ہو جاتی ہیں تاہم ضرورت کا صحیح اندازہ لگانا چاہیے۔ عام معاملات کے لیے شریعت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ نیکی کو مقدم رکھا جائے اور برائی سے پرہیز کیا جائے۔

ان عام اصولوں کو ثابت کرنے کے لیے ہم عدل وانصاف کی ضرورت اور ظلم کی حرمت پر قرآن کریم کی آیات پیش کرتے ہیں۔

اسلام میں عدل ومساوات :

عام عدل ومساوات کے ضروری ہونے اور ظلم کی ممانعت میں چند آیات پیش کی جاتی ہیں۔

چونکہ عدل ومساوات ہی تمام احکام کی بنیاد اور قانون سازی کا صحیح معیار ہیں اس لیے خداوند تعالیٰ نے مکی اور مدنی سورتوں میں جگہ جگہ اس پر بہت زور دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

۱۔ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (۱۶:۹۰)

در حقیقت خدا انصاف اور احسان کا حکم دیتا ہے۔

۲۔ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَہْلِہَا ۙ وَ اِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ (۴:۵۸)

(بے شک خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے مالکوں کے حوالے کردو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔)

یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُہَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ ۚ اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِہِمَا ۟ فَلَا تَتَّبِعُوا الْہَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ﴿۱۳۵﴾ (۴:۱۳۵)

(اے ایمان والو انصاف کو قائم کرنے والے بنو اللہ کے لیے گواہی دو خواہ وہ خود تمہارے اپنے یا تمہارے والدین اور رشتے داروں ہی کے خلاف کیوں نہ پڑے۔ اگر کوئی مالدار یا غریب ہے تو اللہ ان کا تم سے زیادہ خیر خواہ ہے لہٰذا اپنی خواہش کی پیروی کر کے انصاف سے نہ ہٹو اور گول مول اور غیر مبہم باتیں نہ کرو کیونکہ جو کچھ تم کرتے ہو۔ خدا اس سے خوب واقف ہے۔)

اس آیت میں خدا نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ بہت انصاف کریں، اس وجہ سے قوام اسم مبالغہ کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے تاکہ مسلمان انصاف کرنے میں کسی قسم کی سستی اور کوتاہی نہ کریں۔ مقدموں میں ان کی شہادتیں ہمیشہ خداوند تعالیٰ کی رضامندی کے لیے ہوں اپنی ذاتی خواہش یا کسی کی مصلحت کے لیے نہ ہوں خواہ وہ شہادتیں خود ان کی اپنی ذات یا ان کے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔ شہادت اور گواہی میں نہ امیر کی امارت کا لحاظ کرنا چاہیے اور نہ غریب کی مفلسی پر رحم کھایا جائے۔ بلکہ فیصلہ یا شہادت میں خواہشات کی پیروی کرنے سے منع کیا گیا ہے اور مذکورہ بالا لوگوں کی رعایت کرتے ہوئے انصاف دشمنی سے روکا گیا ہے اور جو کوئی حق بات سے کنارہ کشی کرے گا اسے خدا کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے۔

دوسری آیت میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۫ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ (۵:۸)

(اے ایمان والو! اللہ کے نام پر انصاف کے ساتھ گواہی دینے کے لیے کھڑے ہو جاؤ کسی کی دشمنی تمہیں انصاف سے نہ روکنے پائے۔ انصاف کیا کرو کیونکہ یہی تقویٰ کے قریب ہے۔ اللہ سے ڈرتے رہو کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔)

یہ آیت کریمہ پہلی آیت کی تکمیل کرتی ہے اُس میں حکم دیا گیا تھا کہ انصاف اور شہادت کے معاملے میں مکمل مساوات اختیار کی جائے خواہ اپنا معاملہ ہو یا دوسروں کا قریب والوں کا ہو یا دور والوں کا۔ امیر کا ہو یا غریب کا۔ اس آیت میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ انسان دونوں معاملوں میں اپنے آپ کو دشمنوں کے مساوی سمجھے خواہ حقارت اور عداوت کا دینی یا دنیاوی کوئی سبب ہو۔ مگر (جیسا کہ اس آیت میں بیان کیا گیا ہے) انصاف کو کسی حالت میں ہاتھ سے نہ چھوڑے کیونکہ عدل و مساوات پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے۔ پہلی آیت میں کسی جانبداری پر وعید نازل فرمائی گئی تھی اس طرح اس آیت میں ان لوگوں کو ڈرایا گیا ہے جو کسی کی دشمنی کی وجہ سے عدل و انصاف کو چھوڑ دیتے ہیں۔ دونوں قسم کے لوگوں کو ڈرایا گیا ہے کہ خدا ہر بات سے باخبر ہے اس سے کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔ وہ ہر آدمی سے اس کے عمل، نیت اور ارادہ کا حساب لے گا اور اپنے علم کے مطابق اسے ثواب یا عذاب دے گا۔

ذیل کی آیات میں میزان سے مراد عدل وانصاف ہی ہے۔

۱۔ اَللّٰهُ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَ الْمِیْزَانَ (۱۷:۴۲)

اللہ وہ ہے جس نے حق کے ساتھ کتاب اور ترازو اتاری۔

۲۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ۔(۵۷:۲۵)

بے شک ہم نے اپنے رسول کھلی نشانیوں کے ساتھ بھیجے اور کتاب اور میزان اس کے ساتھ اتاری تاکہ لوگ انصاف کو قائم کریں اور ہم نے لوہا اتارا جس میں بہت ہیبت ہے اور لوگوں کے لیے اس میں بہت سے فوائد ہیں۔

اس لیے بہترین انسان وہ ہیں جو قرآن کریم کی ہدایت کے مطابق ظلم وستم سے باز رہتے ہیں۔ ان کے بعد وہ لوگ ہیں جو حکومت کے انصاف کے ذریعے ظلم نہیں کرتے ہیں ۔ مگر بدترین انسان وہ ہیں جن کا علاج لوہے کی تلوار اور نیزوں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے یعنی وہ سزا سے درست ہوتے ہیں ۔ لہٰذا عام انسانیت کی اصلاح کا دارومدار اسی پر ہے کہ لوگ کتاب اللہ پر ایمان لائیں جس نے ظلم اور تمام برائیوں کو حرام قرار دیا ہے۔ اس طرح مسلمان دنیا اور آخرت میں عذاب الٰہی کے خوف اور ثواب کی امید کے بدولت ظلم سے دور رہیں گے اور اگر عدل وانصاف کے فیصلوں پر ایمان محکم ہوگا تو عوام حکومت کی سزا کے خوف سے ظلم وستم سے باز آئیں گے اور فولادی طاقت کے ذریعے بغاوت اور فتنوں کی سرکوبی ہوگی اور امن وامان قائم ہوگا۔

اسلام میں ظلم کی مخالفت :

عدل وانصاف قائم کرنے کے اس اصول کی تائید ان آیات سے بھی ہوتی ہے جن میں ظلم کو حرام قرار دیا گیا ہے اور اس پر سخت سزا کی وعید نازل ہوئی ہے چنانچہ قرآن کریم کی سینکڑوں آیات میں ظلم کو حرام قرار دیا گیا ہے اور اس کا سخت الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے بلکہ بعض آیات میں ظلم کا دنیا اور آخرت میں بدترین انجام بھی بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ظلم کا خمیازہ بھگتنا اس کا لازمی نتیجہ ہے کیونکہ خدا خود کسی پر ظلم نہیں کرتا ہے بلکہ انسان خود اپنے اعمال کے ذریعے اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں جیسا کہ ارشاد فرمایا ہے۔

وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا (۱۸:۴۹)

(تمہارا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا ہے۔)

دنیا میں ظلم کا انجام یہ ہے کہ قومیں ہلاک ہو جاتی ہے اور تہذیب و تمدن تباہ و برباد ہو جاتا ہے جیسا کہ خداوند تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ (۱۱:۱۱۷)

خدا قوموں کو ان پر ظلم کر کے تباہ نہیں کرتا اگر وہ اپنی روش میں اصلاح پسند ہوتیں۔

یعنی خدا کے یہ شایانِ شان نہیں ہے اور نہ اس کے اجتماعی نظام کا یہ اصول ہے کہ وہ قوموں کو ظلم کر کے ان کے شرک کی بدولت انہیں تباہ و برباد کر دے جب کہ وہ اپنے اعمال اور سیرت میں اصلاح پسند ہوں۔ البتہ وہ انہیں ان کے ظلم و فساد پر ضرور تباہ کرتا ہے۔

۲۔ وَتِلْكَ الْقُرٰى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا (۱۸:۵۹)

(ان آبادیوں کو جب انہوں نے ظلم کیا ہم نے تباہ و برباد کر ڈالا اور ہم نے ان کی بربادی کا وقت مقرر کر رکھا ہے۔)

قصاص کے حکم کے سلسلے میں یہ فرمایا۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۵:۴۵)

جو لوگ اللہ کی نازل کردہ شریعت کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے تو وہی لوگ ظالم ہیں۔

ہمارے خیال میں انفرادی اور اجتماعی مظالم کے سلسلے میں بے شمار آیات میں سے یہ چند آیات کافی ہیں۔ مظالم کی کئی قسمیں ہیں انسان اپنے اوپر بھی ظلم کرتا ہے اور دوسروں پر بھی ظلم کرتا ہے۔ ظلم قول و فعل اور فیصلوں میں بھی ہوتا ہے اور کسی کو جسمانی یا مالی تکلیف پہنچا کر اور دوسرے ذریعوں سے بھی ظلم کیا جاتا ہے اس لیے ان تمام قسموں کا لحاظ کرتے ہوئے مکرر آیات نازل ہوتی ہیں۔ اس تکرار و اعادہ کی حکمت اور مصلحت ہم پہلے بیان کر چکے ہیں (جو کوئی مزید تفصیل کا طالب ہو اسے سورہ ہود کے خاتمہ پر ہماری تفسیر کا حصہ ملاحظہ کرنا چاہیے)۔

احکام و معاملات میں نیکی کا تصور:

جو کوئی کتاب و سنت میں مذہبی احکام پر غور و خوض کرے گا خواہ وہ احکام شخصی ہوں یا شہری یا سیاسی اور فوجی معاملات ہوں وہ یہ ضرور محسوس کرے گا کہ تمام احکام و معاملات

کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ہر حیثیت سے نیکی کے تصور کو قائم رکھا جائے اور حق وانصاف، پابندی عہد، محبت وشفقت، ہمدردی اور احسان کے اثرات غالب رہیں اور ظلم وستم، بدعہدی، بے وفائی، جھوٹ، خیانت، سنگدلی، دغابازی، مکروفریب، سود خوری اور رشوت ستانی کا خاتمہ ہو۔ سب سے زیادہ مضر مذہب فروشی اور ریاکاری ہے جو اس مذہبی نفاق کی بنیاد ہے جو کفر سے بھی زیادہ بدتر اور حقیر چیز ہے۔

جرم وسزا:

اسلام میں عقوبات اور سزاؤں کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم شرعی حدود ہیں جو بہت کم استعمال ہوتی ہیں۔ یہ وہ سزائیں ہیں جس میں نص شرعی کی رو سے کسی خاص جرم پر خاص قسم کی سزا مقرر کی گئی ہے جیسے جانوں کی حفاظت کے لیے قتل کی سزا اور عزت وآبرو اور نسل کی حفاظت کے لیے زنا کی سزا۔ نیز مال اور امن وامان کی حفاظت کے لیے چوری اور ڈاکہ زنی پر سزا کا حکم ہے اس طرح عقل کی حفاظت کے لیے شراب نوشی اور نشہ پر خاص سزا تجویز کی گئی ہے۔ بعض علماء شراب نوشی کے لیے حد شرعی کے قائل نہیں ہیں کیونکہ قرآن وسنت میں اس کے سزا کے لیے کوئی حد مقرر نہیں ہے۔

مذکورہ بالا جرائم میں شرعی حدود قائم کرنے کی حکمت یہ ہے کہ بدکاروں اور آوارہ گرد لوگوں کو ڈرایا جائے، پھر بھی زنا کے جرم کو ثابت کرنے کے لیے ایسی شرطیں رکھی گئی ہیں جن کی وجہ سے جرم اس صورت میں ہی ثابت ہو سکتا ہے جب کہ ملزم خود جرم کا اقرار کرے۔ اس کے علاوہ یہ حکم بھی ہے کہ کسی جرم میں اگر عدالت کو کوئی شک وشبہ ہو جائے تو اس جرم کی سزائیں منسوخ کر دی جائیں۔ چنانچہ بہت سی مشہور احادیث میں یہ مضمون مذکور ہے۔ کہیں یہ الفاظ آئے ہیں "شہادت کی وجہ سے شرعی حدود روک دو "اور کہیں پر یہ الفاظ مذکور ہیں "خدا کے بندوں سے شرعی حدود روک دو"۔ ایک مقام پر یہ الفاظ منقول ہیں "جہاں تک تم سے ممکن ہو سکے شرعی حدود کو مسلمانوں سے ساقط کر دو، اگر تم کسی مسلمان کے لیے راہ گریز دیکھو تو اس کو چھوڑ دو کیونکہ امام اگر معاف کرنے میں غلطی کرے تو یہ زیادہ مناسب ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ سزا دینے میں غلطی کرے۔" یہ آخری مشہور روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے اور اس پر عام

فقہاء کا عمل ہے۔ ان کا یہ قول ہے کہ شرعی حدود کو قائم کرنا سب سے بڑے حاکم (خلیفہ) کا حق ہے دوسرے حکام کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔

سزاؤں کی دوسری قسم تعزیرات ہیں۔ ان میں دیگر جرائم کی سزاؤں کا تعین حکام کے اجتہاد اور صوابدید پر ہے مگر ان میں عدل وانصاف اور عوام وخواص کے مفادات کا ضرور لحاظ رکھا جاتا ہے، ان سزاؤں میں تمام جرائم شامل ہیں۔

ان تمام قوانین اور اصولوں کے سلسلے میں جن کی بدولت اسلام تمام پیغمبروں کے مذاہب اور تمام علماء وحکماء کے قوانین سے فوقیت لے گیا ہے۔ یہ نکتہ قابل غور ہے کہ یہ اصول وقوانین ایک ناخواندہ پیغمبر کی زبان سے بیان ہوئے ہیں۔ جس نے ناخواندہ انسانوں کے درمیان پرورش پائی تھی جن پر نہ کوئی الہامی شریعت نازل ہوئی تھی اور نہ ان کے پاس قانونی دستاویزوں کا کوئی مجموعہ تھا۔ ایسی صورت میں کیا کسی ہوشمند انسان کی عقل میں یہ بات آسکتی ہے کہ یہ سارے قوانین اچانک رسول اکرم ﷺ نے اپنی ادھیڑ عمر میں اپنے دل سے ایجاد کر لیے ہوں اور اس سے پہلے یہ باتیں ان کی طرف سے بیان نہ کی گئی ہوں؟ یہ بات کیسے ممکن ہے۔ جب کہ آپ سے پہلے اور آپ کے بعد بھی کسی انسان کے لیے یہ ناممکن ہے۔ حقیقت میں یہ خدا کی وحی ہے جیسا کہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۝ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰى ۝ (۵۳ : ۱تا۴)

(ستارہ کی قسم! جب وہ گرے۔ تمہارا ساتھی نہ بھٹکا ہے اور نہ گمراہ ہوا ہے وہ اپنی خواہش کے مطابق گفتگو نہیں کرتا ہے بلکہ یہ خدائی وحی ہے جو اس پر نازل ہو رہی ہے۔)

قرآن کریم کا مقصد ہفتم

مالی اصلاحات

تمہید:

ہم بیان کر چکے ہیں کہ قرآن کریم نے دینداری، ایمان وعمل، عقائد، عقل ودلائل ضمیر اور وجدان اور عادلانہ نظام حکومت کی راہوں سے کیا کیا اصلاحات نافذ کی ہیں۔ اس

نے نوع انسانی کی تکمیل کا راستہ بتا دیا ہے خواہ اس کا تعلق افراد سے ہو یا جماعتوں اور قوموں سے ہو۔ مگر ابھی ایک چیز باقی ہے۔ وہ چیز خطرناک سماجی خرابیوں کی اصلاح ہے جو مذکورہ بالا اصلاحات پر موقوف ہے وہ سماجی خرابیاں مندرجہ ذیل ہیں۔
ا۔ سرمایہ داری کی خرابیاں (۲) جنگ کی تباہ کاری اور سنگدلی (۳) عورتوں پر ظلم وستم (۴) کمزوروں اور قیدیوں پر مظالم اور ان کی آزادی سلب کرنا یعنی مطلق غلامی۔
ان کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی تمام مسرتین انہی خرابیوں کی اصلاح سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ ان کی مکمل اصلاح اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک مذہب و عقل، علم و حکمت اور حکومت تعاون نہ کریں لہٰذا ہم ان معاملات پر اجمالی گفتگو کریں گے اور سب سے پہلے مالی اصلاحات کا ذکر کریں گے۔ اس سلسلے کی آیات کریمہ ذیل کے سات محوروں پر گھومتی ہیں۔

ا۔ مال فتنہ اور آزمائش ہے:

مال کے بارے میں قرآن کریم کا بنیادی اصول یہ ہے کہ یہ فتنہ ہے یعنی دنیاوی زندگی میں اس کے ذریعے انسان کی آزمائش ہوتی ہے کیونکہ یہ نیکی بدی، خیر وشر، اصلاح وفساد کا ذریعہ ہے اور اسی کے کمانے اور خرچ کرنے میں جھگڑے اور رقابتیں پیدا ہوتی ہیں۔ وہی دولتمندوں میں گردش کرتا ہے اور عوام کے مفاد اور بھلائی کا ذریعہ بنتا ہے۔ مال ودولت ہمیشہ افراد قوموں اور سلطنتوں میں عداوت بھڑکاتی رہی ہے مگر مشکلات اور پیچیدہ معاملات کو حل کرنے کا واحد ذریعہ بھی یہی ہے۔ یہاں تک کہ بعض علمائے علم الاجتماع کا یہ قول ہے کہ مال ودولت ہی تمام سیاسی اور سماجی یہاں تک کہ مذہبی اور اسلامی انقلابات کی بنیاد ہے جیسا کہ میں نے اپنی تفسیر میں اسے بیان کیا ہے اور اس کی تردید بھی کی ہے۔ اس سلسلے میں مال ودولت کے فضائل میں مشہور عربی ادیب حریری نے مقامہ دیناریہ میں یہ الفاظ کہے ہیں۔
"اگر پرہیزگاری نہ ہوتی تو میں یہ کہہ دیتا کہ اس کی قدرت بہت بڑی ہے۔" ہماری قوم کے فقہاء، علماء اور ادیبوں نے مالیات کے سلسلے میں وہ گوناگوں اور کثیر القاصد مباحث بیان نہیں کیے ہیں جن کا موجودہ زمانے میں مختلف علوم وفنون میں ذکر کیا گیا ہے مگر ان علوم کے ذریعے انسانیت کی خرابیاں بڑھتی گئیں اور ان سے کوئی فائدہ حاصل نہیں

ہوا۔ان خرابیوں کا علاج صرف قرآن کریم میں موجود ہے۔ بہر حال خداوند تعالیٰ فرماتا ہے۔

لَتُبْلَوُنَّ فِيٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ (۳:۱۸۶)

(تمہارے جان ومال میں تمہاری آزمائش ہوگی)

اس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف سے یہ کہلایا گیا جب کہ انہوں نے ملکہ سبا کا تخت اپنے سامنے رکھا ہوا دیکھا۔

ا۔هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ۭ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ (۲۷:۴۰)

(یہ میرے پروردگار کی مہربانی ہے تاکہ میری آزمائش کرے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکر گذار بنتا ہوں جو شکر کرے گا تو وہ اپنے لیے شکر کرے گا اور جو ناشکری کرے تو میرا پروردگار بے نیاز اور کریم ہے۔)

۲۔ وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ جَزَاۗءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا۔ (۳۴:۳۷)

(نہ تمہاری دولت اور نہ تمہاری اولاد تمہیں ہمارے قریب لائے گی مگر جو ایمان لائے اور نیک کام کرے تو ان کے لیے ان کے اعمال کا دوگنا صلہ ہے۔)

۳۔ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (۳۰:۳۹)

(جو مال تم سود پر دیتے ہو کہ لوگوں کے مال میں اضافہ ہو تو وہ درحقیقت مال خدا کے ہاں نہیں بڑھتا ہے (لیکن) جو مال زکوٰۃ میں اللہ کی رضامندی کے لیے دیتے ہو تو ایسا کرنے والوں کو دوگنا صلہ ملے گا۔)

۴۔ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَاۗءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ (پ ۳:۱۴)

(لوگوں کے لیے خواہشوں کی محبت خوشنما بنادی گئی ہے جن میں عورتیں، فرزند اور سونے چاندی کے ڈھیر (شامل ہیں)۔

۵۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (۸:۲۸)

(جان لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد آزمائش ہی ہے اور اللہ کے پاس بڑا اجر ہے۔)

سورۃ تغابن میں بھی اسی قسم کا مضمون (۶۴:۱۵) اور اس کے بعد مال خرچ کرنے

کی طرف مائل کیا گیا ہے اور فلاح و بہبودی کا انحصار اسی پر بتایا گیا ہے کہ نفس کو اس کی کنجوسی سے باز رکھا جائے۔

٦۔ اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ اَمَلًا (١٨:٤٦)

(مال اور بیٹے دنیا کی زندگی کی رونق ہیں اور باقی رہنے والی نیکیاں تمہارے پروردگار کے پاس بہتر ثواب. اور بہتر توقع کا ذریعہ ہیں۔)

مذکورہ بالا آیت پر سورۃ کہف کی ابتدائی آیت کے ساتھ غور کرو جو یہ ہے۔

٧۔ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (١٨:٧)

(جو کچھ زمین پر ہے ہم نے اسے زمین کی رونق بنادیا ہے تاکہ انسانوں کی آزمائش کریں کہ ان میں کون زیادہ اچھے عمل والا ہے۔)

یہاں عمل سے مراد یہ ہے کہ زمین کو آباد کیا جائے اور بہترین عمل وہ ہے جو عوام کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچائے اور جو اس کے شکریہ کے طور پر خدا کو سب سے زیادہ پسند ہو۔ اسی لیے اس کے بعد خدا نے دو باغ والوں کی مثال دی ہے اور دنیا کی زندگی کو زمین کے پودوں کے مشابہ قرار دیا ہے (ملاحظہ ہو آیات سورۃ کہف (٣٨:٤٦)

خداوند تعالیٰ نے مال غنیمت کو اس کے مستحقین میں تقسیم کردینے کی حکمت اس طرح بیان فرمائی ہے۔

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاۗءِ مِنْكُمْ (٥٩:٧)

(تاکہ مال تمہارے دولتمندوں کے درمیان گردش نہ کرتا رہا۔)

یعنی مال کی گردش صرف دولتمندوں تک محدود نہیں ہونی چاہیے جسے آج کل سرمایہ داری کہتے ہیں۔ مال کے فتنہ ہونے کے بارے میں بکثرت آیات مذکور ہیں جن پر ہم نے اپنی تفسیر میں جابجا اور بالخصوص جلد ١٠ میں زیادہ گفتگو کی ہے۔ (ملاحظہ ہو تفسیر کی فہرست میں لفظ المال)

قرآنی آیات میں کامیابی اور سعادت مندی کو مال صرف کرنے اور بدبختی کو کنجوسی کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح مختلف آیات میں ترغیب و ترہیب ہے۔ ذیل کی آیت میں ترغیب و ترہیب دونوں کو جمع کر دیا گیا ہے۔

وَ اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (۲: ۱۹۵)

(اللہ کی راہ میں صرف کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔)

یعنی خدا کی راہ میں صرف کرنے سے روکنا ہلاکت کا ذریعہ ہے اس کے بعد مال صرف کرنے کی ترغیب کے لیے یہ فرمایا گیا ہے۔

وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ (۲: ۱۹۵)

(احسان کرو کیونکہ خدا احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔)

سورۃ اللیل میں بھی اسی طرح ارشاد فرمایا ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَ اتَّقٰى وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰى وَ اَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰى وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى وَ مَا یُغْنِیْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰى (۹۲: ۵-۱۱)

(جس نے مال دیا اور تقویٰ اختیار کیا اور اچھی بات کی تصدیق کی تو اسے ہم بتدریج آسانی میں پہنچا دیں گے اور جس نے بخل کیا اور بے پرواہ رہا اور اچھی بات کو جھٹلایا اسے ہم سختی میں پہنچائیں گے اور جب وہ گڑھے میں گرے گا تو اس کا مال کام نہیں آئے گا۔)

مذکورہ بالا آیات اس سے پہلے کے قول خداوندی اِنَّ سَعْیَكُمْ لَشَتّٰى (۹۲: ۴) (تمہاری کوشش مختلف ہے) کی تفصیل ہے جس کی مختصر تشریح یہ ہے کہ مال کمانے اور اسے صرف کرنے میں تمہاری کوشش آغاز و انجام، طریقہ کار، مقاصد و نتائج کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ ایک شخص اپنے شخصی اور قومی حقوق اور اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو سرانجام دیتا ہے اور ان انفرادی اور اجتماعی خرابیوں سے پرہیز کرتا ہے جو ان حقوق کے ادا نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں اور نیک کاموں پر خدا کے اس وعدہ کی تصدیق کرتا ہے کہ وہ نیک کام پر دوگنا ثواب عطا فرمائے گا جیسا کہ اس نے دوسری اس آیت میں بھی بیان کیا ہے۔

لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى (۵۳: ۳۱)

(تاکہ وہ ان لوگوں کے اعمال کا ویسا بدلہ دے جنھوں نے برے کام کیے ہیں اور جنھوں نے احسان کیا ہو انھیں اچھا بدلہ دے۔)

اس میں دنیا اور آخرت دونوں کا بدلہ شامل ہے تو اس صورت میں خدا نفسی صفات

کے زیر اثر اور خاص و عام حالات میں اعمال کی تاثیر سے اپنے مقررہ نظام کے مطابق ایسے شخص کے لیے ان کی ذاتی بھلائی اور عوام کے مفاد کے لحاظ سے اس کی زندگی کا راستہ آسان کر دیتا ہے چنانچہ وہ عوام میں بھی ہر دل عزیز ہوتا ہے اور خدا بھی اس سے خوش ہوتا ہے۔ لیکن جو کوئی ان حقوق کے ادا کرنے میں بخل کرتا ہے اور اپنے مال کے گھمنڈ پر اپنے آپ کو عوام کی تعریف و محبت کا حقدار اور خدا کی رضا مندی اور ثواب سے بے نیاز سمجھتا ہے اور ثواب کے بارے میں وعدہ الٰہی کی اس صورت سے تکذیب کرتا ہے کہ مال صرف نہ کر کے اس راہ پر نہیں چلتا ہے خواہ زبان سے اس کا معترف ہی کیوں نہ ہو، تو ایسی صورت میں خداوند تعالیٰ اپنے مذکورہ بالا نظام کے ماتحت اسے سب سے زیادہ برے اور مشکل راستے پر ڈال دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانوں کے لیے تکلیف کا باعث ہو کر ان کا اور خدا کا دشمن بن جاتا ہے۔ چنانچہ لوگوں کی طرف سے اور خدا کی طرف سے دنیا اور آخرت میں اسے بدترین سزا دی جائے گی۔ ان حقائق کی تائید مالیات کی آیات کے دوسرے حصہ سے بھی ہوتی ہے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۲۔ دولت کی سرکشی اور غرور:۔

دولت سچائی اور نیکی کا راستہ روک دیتی ہے جیسا کہ خداوند تعالیٰ سورہ علق میں فرماتا ہے۔

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۙ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۭ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۭ (۹۶:۶۔۸)

(جب آدمی اپنے آپ کو دولتمند دیکھتا ہے تو وہ ضرور سرکشی پر اتر آتا ہے۔)

یعنی جب انسان اپنے آپ کو مالدار دیکھتا ہے تو وہ اپنی دولت اور خزانہ کی بدولت رفاہ عام اور خدا کی خوشنودی اور آخرت کے ثواب کے کاموں سے اپنے آپ کو بے نیاز خیال کرتا ہے اور حق و صداقت، انصاف اور نیکی کی حدود سے آگے بڑھ جاتا ہے۔

یہ آیت اور اس کے بعد کی آیت ابوجہل کے بارے میں نازل ہوئیں جو رسول اکرم ﷺ اور اسلام کا شروع ہی سے دشمن تھا۔ اس سلسلے کی یہ پہلی آیت ہے۔ اس طرح یہ سورۃ ہے۔

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝ (۱۱۱:۱-۲)[1]

(ابولہب کے ہاتھ ٹوٹیں اور وہ ہلاک ہو جائے نہ تو مال اس کے کام آیا اور وہ چیز جو اس نے کمائی۔)

اسی طرح سورہ ہمزہ میں ہے۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۝ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۝

(۱۰۴:۱-۳)

(ہلاکت ہے ہر غیبت کرنے اور طعنہ دینے والے کے لیے جو مال جمع کرتا اور اسے بار بار گنتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا۔)

یہ سورۃ ولید اور امیہ بن خلف کے حق میں نازل ہوئی تھی۔ اسی مضمون کی یہ آیات کریمہ ہیں۔

ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا ۝ وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ۝ وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا ۝ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا ۝ ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ ۝ كَلَّا ۭ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا ۝ سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ۝

(۷۴:۱۱-۱۷)

(مجھے اور اسے اکیلا چھوڑ دو جسے میں نے پیدا کیا اور میں نے اسے بہت سا مال اور حاضر رہنے والے بیٹے دیے اس کے بعد میں نے اسے اچھی طرح ساز وسامان دیا پھر بھی اسے لالچ ہے کہ میں اسے زیادہ دوں گا ہرگز نہیں وہ ہماری آیات کا کٹر مخالف ہے۔ عنقریب میں اسے اچھی طرح (برے مقام پر) چڑھاؤں گا)

یہ آیات ولید بن مغیرہ کے حق میں نازل ہوئی ہیں۔ اس طرح سورہ نون میں ارشاد فرمایا۔

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۝ هَمَّازٍ مَّشَّاۗءٍۢ بِنَمِيْمٍ ۝ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝ عُتُلٍّۢ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ۝ اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ ۝ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ (۶۸:۱۰-۱۵)

(اطاعت نہ کرو کسی قسمیں کھانے والے کی جو بے قدر ہو۔ طعنے دیتا ہو اور چغل خور ہو اور اس کے ساتھ

---

(۱) .... ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ ابولہب کی مال و دولت، تجارتی نفع اور اس کی اولاد اسے ہلاکت اور تباہی سے نہیں بچا سکی۔ اس نے بعثت کے بعد اپنے بیٹے کو دشمنی کی وجہ سے یہ حکم دیا کہ وہ رسول اکرم ﷺ کی صاحبزادی کو چھوڑ دے۔ چنانچہ اس کے بیٹے کے ساتھ یہ انجام بد ہوا کہ شام کے راستے میں ایک شیر نے اسے پھاڑ کھایا جبکہ ایک تجارتی قافلہ اسے گھیرے ہوئے تھا۔ خود ابولہب نے جنگ بدر میں مشرکین مکہ کی بہت مالی مدد کی مگر وہ بے گور و کفن مر گیا اور اس کی لاش سڑتی رہی اور اس میں اس قدر بدبو آ رہی تھی کہ لوگوں نے بعض حبشی لوگوں کو اجرت دے کر وہ لاش دفن کرائی۔ (خلاصہ تفسیر بیضاوی)

ساتھ نیکی سے روکتا اور زیادتی کرتا ہو۔ گنہگار ہو اور ان سب کے بعد بد نام ہو (یہ سب برائیاں اس لیے تھیں) کہ وہ مال اور اولاد والا تھا۔ جب ہماری آیات اسے سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ اگلوں کی کہانیاں ہیں۔)

یہ لوگ قریش میں سب سے زیادہ مالدار تھے انہی لوگوں نے رسول اکرم ﷺ سے دشمنی کر رکھی تھی اور محض اپنی دولتمندی کے غرور کی وجہ آغاز بعثت ہی سے منکر ہو گئے تھے۔ چنانچہ ابو سفیان وغیرہ نے جب جنگ بدر کے لیے ان دولتمندوں سے چندہ اکٹھا کیا تو خدا نے یہ آیت نازل فرمائی۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ فَسَيُنفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ (۳۶:۸)

(درحقیقت جنھوں نے کفر اختیار کیا وہ اپنا مال اس لیے صرف کرتے ہیں کہ اللہ کی راہ سے لوگوں کو باز رکھیں۔ وہ ضرور خرچ کریں گے پر ان کا یہ مال ان کے لیے حسرت کا باعث ہوگا اور آخرکار وہ مغلوب ہو جائیں گے۔)

ایسے ہی لوگوں اور گذشتہ انبیاء کے مالدار حلقہ کے حق میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَقَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ (۳۴:۳۵)

وہ کہنے لگے ہمارے پاس سب سے زیادہ مال واولاد ہے اور ہمیں ہرگز عذاب نہیں دیا جائے گا۔

اس قسم کی عام انسانی فطرت کے بارے میں یہ ارشاد ہے۔

وَأُحْضِرَتِ الْأَنفُسُ الشُّحَّ ۔ (۱۲۸:۴)

انسانی طبیعتوں میں بخل اور حرص کی رغبت پائی جاتی ہے۔

اور سورۃ معارج میں فرمایا۔

إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ۝ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ۝ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ۝ إِلَّا الْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ۝ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ ۝ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ۝ (۷۰: ۱۹۔۲۵)

(انسان کم ہمت پیدا ہوا ہے جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو بہت ڈر جاتا ہے جب اسے بہت مال ملتا ہے تو وہ (حقوق ادا کرنے میں) بخل کرتا ہے سوائے ان نمازیوں کے جو اپنی نماز کے ہمیشہ پابند ہیں اور جن کے مال میں سائل اور غیر سائل سب کا حق ہے۔)

اکثر دولتمند کنجوس ہوتے ہیں سوائے ان لوگوں کے جنہیں خدا نے مذکورہ بالا آیات میں مستثنی قرار دیا ہے۔

اس قسم کی آیات کو پیش کر کے واعظ حضرات لوگوں کو مال اور دنیا سے نفرت دلاتے ہیں اور اس معاملے میں حد سے بڑھ جاتے ہیں حالانکہ قابل مذمت چیز یہ ہے کہ انسان مال ودولت کے فتنہ میں مبتلا ہو کر غرور، سرکشی اور تکبر کی وجہ سے حق سے دور ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مال کے ساتھ اولاد کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور کنجوسی، ناجائز ذرائع سے مال کھانا جیسے رشوت، سود خوری وغیرہ کی مذمت کی ہے اس کی مثالیں مندرجہ ذیل باب میں ہیں۔

۳۔ بخل اور مال میں ریاکاری:

خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُم بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (۳:۱۸۰)

(جو لوگ اللہ کے دیئے ہوئے عطیہ کو صرف کرنے میں بخل کر رہے ہیں وہ ہرگز نہ سمجھیں کہ یہ بخل ان کے حق میں اچھا ہے بلکہ یہ بہت برا ہے قیامت کے دن وہ اسی چیز کے طوق میں گرفتار کیے جائیں گے جن میں وہ بخل کر رہے ہیں۔)

خدا لوگوں کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ اس کی راہ میں اخلاص کے ساتھ پاکیزہ اور حلال کمائی صرف کریں۔ اس میں نہ وہ ریاکاری سے کام لیں، نہ احسان جتائیں اور نہ لوگوں کو تکلیف دیں۔ اس کے بعد خداوند تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

اَلشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُم بِالْفَحْشَاءِ وَاللَّهُ يَعِدُكُم مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا

(۲:۲۶۸)

(شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا اور بدکاری کا حکم دیتا ہے مگر اللہ تم سے اپنی مغفرت اور بخشش کا وعدہ کرتا ہے۔)

یہاں مفسرین نے الفحشاء کی تفسیر بخل سے کی ہے یعنی شیطان تمہیں اللہ کی راہ میں مال صرف کرنے سے اسی طرح روکتا ہے کہ وہ تمہیں مفلسی کا خوف دلاتا ہے اور تمہیں

بخل کا حکم دیتا ہے جو نہایت برا اور مضر ہے۔

ایک دوسرے مقام پر والدین، قریبی رشتہ داروں، یتیموں، غریبوں اور پڑوسیوں کے ساتھ اچھے سلوک کا حکم دینے کے بعد فرمایا۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنۡ کَانَ مُخۡتَالًا فَخُوۡرَا ۙ الَّذِیۡنَ یَبۡخَلُوۡنَ وَیَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبُخۡلِ

خدا اکڑنے والوں اور فخر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے جو بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بخل کا حکم دیتے ہیں۔ (۴: ۳۶، ۳۷)

یہ ان اشخاص کی بارے میں ارشاد ہے جنھوں نے خدا سے یہ عہد کیا تھا کہ اگر وہ اپنی مہربانی سے اسے دولتمند بنادے گا تو وہ اس سے مال میں سے ضرور خیرات کریں گے۔

فَلَمَّاۤ اٰتٰہُمۡ مِّنۡ فَضۡلِہٖ بَخِلُوۡا بِہٖ وَتَوَلَّوۡا وَّہُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ۝ فَاَعۡقَبَہُمۡ نِفَاقًا فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ اِلٰی یَوۡمِ یَلۡقَوۡنَہٗ بِمَاۤ اَخۡلَفُوا اللّٰہَ مَا وَعَدُوۡہُ وَبِمَا کَانُوۡا یَکۡذِبُوۡنَ ۝ (۹: ۷۶-۷۷)

(جب خدا نے انہیں اپنا عطیہ بخشا تو بخل کرنے لگے اور کنارہ کشی کرتے ہوئے پھر گئے۔ اس پر خدا نے انہیں یہ سزا دی کہ ان کے دلوں میں قیامت تک کے لیے نفاق ڈال دیا کیونکہ انہوں نے اللہ سے وعدہ خلافی کی اور وہ جھوٹ بولا کرتے تھے۔)

۲۔ ھٰۤاَنۡتُمۡ ہٰۤؤُلَآءِ تُدۡعَوۡنَ لِتُنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۚ فَمِنۡکُمۡ مَّنۡ یَّبۡخَلُ ۚ وَ مَنۡ یَّبۡخَلۡ فَاِنَّمَا یَبۡخَلُ عَنۡ نَّفۡسِہٖ ؕ وَ اللّٰہُ الۡغَنِیُّ وَ اَنۡتُمُ الۡفُقَرَآءُ ۚ وَ اِنۡ تَتَوَلَّوۡا یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ ۙ ثُمَّ لَا یَکُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَکُمۡ ۝ (۴۷: ۳۸)

(تم وہ ہو جو کہ تمھیں دعوت دی جارہی ہے کہ اللہ کی راہ میں صرف کرو۔ مگر تم میں ایسے بھی ہیں جو کنجوسی کرتے ہیں مگر جو بخل کرتا ہے اپنے حق میں کنجوسی کرتا ہے۔ اللہ تونگر ہے اور تم سب فقیر ہو۔ اگر تم روگردانی کرو گے تو خدا تمہارے سوا دوسری قوم کھڑی کردے گا اور وہ تمہاری جیسی نہیں ہوگی۔)

یعنی اگر تم خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے روگردانی کرو گے تو خدا تمہارا دور ختم کرکے تمھیں برباد کردے گا۔ اور دوسرے لوگوں کو تمہاری جگہ لا کھڑا کرے گا جو قومی مفاد میں اور ملک کی مدافعت پر اور حق وانصاف قائم کرنے میں اپنی دولت صرف کریں گے۔

۳۔ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَاۡکُلُوۡۤا اَمۡوَالَکُمۡ بَیۡنَکُمۡ بِالۡبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنۡ تَکُوۡنَ تِجَارَۃً عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡکُمۡ ۟ (۴: ۲۹)

(اے ایمان والو! اپنا مال آپس میں ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ سوائے اس کے کہ یہ تمہاری باہم رضامندی سے تجارت ہو۔)

۴۔ وَلَا تَأْكُلُوٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲:۱۸۸)

(آپس میں ایک دوسروں کا مال ناجائز طور پر نہ کھاؤ اور جھوٹا مقدمہ بنا کر حکام کے پاس نہ لے جاؤ تاکہ اس طرح جان بوجھ کر ناجائز طریقے سے لوگوں کا کچھ مال کھا جاؤ۔)

اور یہودیوں کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔

وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (۴:۱۶۱)

(وہ سود کھاتے تھے حالانکہ انہیں اس سے منع کیا گیا تھا اور ناجائز طور پر لوگوں کا مال کھاتے تھے۔)

ان کے بارے میں یہ بھی ارشاد ہے: اکالون للسحت: وہ ناجائز مال کو بہت کھانے والے ہیں۔

اس میں اکالون کا لفظ اسم مبالغہ ہے۔ یعنی وہ ناجائز مال دنیاوی اور دینی مکر و فریب اور رشوت کے ذریعے بہت کھاتے ہیں۔ سحت (بالضم) اس حقیر چیز کو کہتے ہیں جس کی بدولت کسی کو ذلت اور خست حاصل ہو اور اس کی مروت اور انسانیت جاتی رہے۔ چنانچہ اس لفظ کو میں نے اپنے وطن کے ظالم حکام کے بارے میں مقصورہ رشیدیہ میں اس طرح استعمال کیا ہے۔

وَكَيْفَ لَا يُسْتَحِيهُ اللهُ وَهُمْ لِلسُّحْتِ اَكَّالُوْنَ فِيْهِ وَالرِّشَاءِ۔

خدا اسے کیسے ذلیل نہ کرے جب کہ وہ (حکام) ناجائز مال اور رشوت بہت کھاتے ہیں۔

ایک دوسرے مقام پر خدا نے یہ ارشاد فرمایا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ (۹:۳۴-۳۵)

(اے ایمان والو! بہت سے عالم اور راہب ناجائز طریقے پر لوگوں کا مال کھاتے اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی

بشارت سنا دو جس دن (مال کو) دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا اور اس کے ذریعے ان کی پیشانیوں پہلوؤں اور پشت پر داغ لگایا جائے گا (اور پھر کہا جائے گا) یہ ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا اب اپنے خزانوں کا مزہ چکھو۔)

مال جمع کرنے پر یہ وعید اس لیے نازل ہوئی ہے کہ اس سے لوگوں کو فائدہ نہیں پہنچایا گیا اور نہ اسے گردش میں لا کر اس کے ذریعے لوگوں کے حقوق ادا کیے گئے (ملاحظہ ہو تفسیر المنار جلد ۱۰ صفحہ ۳۹۵۔۴۱۰)

۴۔ مال و دولت کی تعریف:

مال اور دولت خدا کی نعمت ہے۔ ایمان اور عمل صالح پر اس کے ذریعے ثواب حاصل ہوتا ہے چنانچہ خداوند تعالیٰ نے سورۃ نوح میں حضرت نوح کی زبانی یہ قول نقل کیا ہے۔

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ﴿۱۰﴾ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ﴿۱۱﴾ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ﴿۱۲﴾ (۷۱: ۱۰۔۱۲)

(میں نے کہا "تم اپنے پروردگار سے گناہوں کی معافی مانگو کیونکہ وہ بڑا بخشنے والا ہے۔ وہ کثرت سے تم پر بارش برسائے گا اور تمہارے مال و اولاد میں ترقی دے گا اور تمہارے لیے باغ لگائے گا اور نہریں جاری کرے گا۔)

سورہ ہود میں حضرت ہود کی زبانی اسی طرح کے الفاظ نقل کیے گئے ہیں (۱۱: ۵۲) حضرت آدم و حوا اور ان کی اولاد پر مذہبی ہدایت کے احسان کا ذکر کرتے ہوئے سورۃ طٰہٰ میں قصہ کے آخر میں یہ فرمایا گیا ہے۔

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا (۲۰: ۱۲۳۔۱۲۴)

(خدا نے فرمایا "یہاں سے اکٹھے ہو کر اتر جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے لیکن جب کبھی تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے تو جو کوئی میری ہدایت کو مانے گا وہ نہ گمراہ ہو گا اور نہ بدنصیب ہو گا اور جو کوئی میرے ذکر سے روگردانی کرے گا تو اس کی روزی تنگ ہو گی۔)

اس سے یہ معلوم ہوا کہ مذہبی ہدایت کو ماننے کا انجام یہ ہے کہ انسان دنیا کی بدبختی سے محفوظ رہتا ہے اور خوشگوار زندگی کی نعمتوں سے سرفراز ہوتا ہے اور جو کوئی اس سے اعراض کرتا ہے وہ بدنصیب رہے گا اور اس کی روزی تنگ ہو گی۔ اسی مفہوم میں سورہ جن

کی یہ آیت ہے۔

وَّاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰٓى اٰمَنَّا بِهٖ فَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا (۷۲: ۱۳)

(ہم نے جب ہدایت کی بات سنی تو ہم اس پر ایمان لے آئے جو کوئی اپنے پروردگار پر ایمان لاتا ہے اسے نہ نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے نہ ظلم کا۔)

یعنی ایسے انسان کی نہ حق تلفی ہوتی ہے اور نہ اسے ذلت اٹھانی پڑتی ہے کیونکہ ایمان کی عزت اس کی حفاظت کرتی ہے، اس میں دنیا اور آخرت دونوں شامل ہیں۔ اس کے بعد خاص دنیا کے معاملہ میں یہ ارشاد فرمایا گیا۔

وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا (۷۲: ۱۶، ۱۷)

(اگر یہ لوگ ہدایت کے راستے پر قائم رہتے تو ہم انہیں فراغت کے پانی سے سیراب کرتے (ان کا رزق کشادہ کر دیتے) تاکہ ہم اس بارے میں ان کی آزمائش کریں اور جو شخص اپنے پروردگار کی یاد سے روگردانی کرے گا تو خدا اسے سخت عذاب میں داخل کرے گا۔)

یہی حقیقت جس سے مفسرین غافل ہیں اس آیت کریمہ میں بھی بیان فرمائی گئی ہے جس میں بت پرستوں کو خانہ کعبہ میں داخل ہونے سے منع فرمایا گیا ہے۔ اس کے بعد یہ ارشاد ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖۤ اِنْ شَآءَ (۹: ۲۸)

(اگر تم مفلسی سے ڈرتے ہو تو اگر خدا چاہے گا تو اپنی مہربانی سے تمہیں خوشحال بنا دے گا۔)

یعنی اگر تمہیں اندیشہ ہے کہ مشرکوں کے نہ آنے سے مکہ معظمہ اپنی اس آمدنی سے محروم ہو جائے گا جو موسم حج وغیرہ میں ان سے حاصل ہوتی ہے تو خدا تمہیں اسلام، اس کی غنیمتوں اور فتوحات سے مالا مال کرے گا (ملاحظہ ہو اس آیت کی تفسیر ہماری تفسیر کی جلد ۱۰ صفحہ ۷۷ میں)

اس طرح ان لوگوں سے فرمایا جنھوں نے بدر کے قیدیوں کی آزادی کے لیے فدیہ دیا تھا۔

اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّاۤ اُخِذَ مِنْكُمْ (۸: ۷۰)

(اگر خدا کو معلوم ہوگا کہ تمہارے دلوں میں نیکی ہے تو وہ تمہیں اس سے بہتر دے گا جو تم سے لیا گیا ہے۔)

حقیقت میں ایسا ہی ہوا خدا نے فاقہ مست عربوں کو اسلام کی برکت سے خوشحال بنا دیا اور وہ دنیا کی سب سے زیادہ مالدار قوم بن گئے (ملاحظہ ہو صفحہ ۱۰۰ تفسیر مذکور)

خود خدا نے اپنے پیغمبر اعظم ﷺ پر بھی مفلسی کے بعد خوشحالی کا احسان جتایا ہے اور فرمایا ہے۔ وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ (۸:۹۳) (خدا نے تمھیں مفلس پایا اور خوشحال بنا دیا۔)

ایک دوسری سورۃ میں آپ کی قوم قریش کو بھی یہ احسان جتایا گیا ہے (سورۃ قریش) کہ خدا ہی نے ان لوگوں کو سردی اور گرمی میں تجارتی سفر کی توفیق عطا فرمائی نیز اس نے مال کثیر کو "خیر" کے لفظ سے تعبیر کیا جیسا کہ یہ آیت ہے۔

وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ (۸:۱۰۰)

(وہ (انسان) مال کی محبت میں بہت سخت ہے۔)

مرنے والے انسان کو خطاب کرتے یہ فرمایا ہے:

إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ (۲:۱۸۰)

(اگر اس نے مال چھوڑا ہے تو والدین اور رشتہ داروں کے لیے وصیت ہے۔)

در حقیقت خدا کے مومن، پرہیزگار اور شکر گذار بندے ان لوگوں سے زیادہ دنیاوی نعمتوں کے حقدار ہیں جو کفران نعمت اور ظلم و فسق کے مرتکب ہوئے ہیں۔ کیونکہ شکر کا مطلب یہی ہے کہ نعمتوں کا استعمال صحیح مقاصد کے لیے کیا جائے جن مقاصد کے لیے وہ عطاء کی گئی ہیں۔ ان کا صحیح استعمال یہ ہے کہ انہیں حق و صداقت، انصاف، نیکی اور تعمیری کاموں میں صرف کیا جائے، اسی چیز سے خدا بھی خوش ہوتا ہے بلکہ یہ خدائی قانون ہے کہ شکر کی بدولت نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے اور ان کا ناجائز استعمال کر کے ناشکری کو تمام نعمتوں کے سلب ہونے یا اس کے فوائد سے محروم ہونے کا ذریعہ بن جاتا ہے جیسا کہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے۔

۱۔ وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ (۱۴:۷)

(اور خدا نے اعلان کر دیا کہ اگر تم شکر کرو گے تو میں تمھیں اور زیادہ دوں گا۔ اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بہت سخت ہے۔)

۲۔ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَىٰ قَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ (۸:۵۳)

(یہ اس وجہ سے ہے کہ خدا کسی قوم کی دی ہوئی نعمت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنی حالت کو نہ بدل ڈالے۔)

زراعت، صنعت، تجارت اور دیگر ذرائع معاش کے حصول میں مومن اور کافر سب

شریک ہیں کیونکہ یہ دنیاوی اسباب ہیں اور مذہب کے اختلاف سے ان میں کمی بیشی نہیں ہوتی جیسا کہ خدا فرماتا ہے۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (۱۷:۲۰)

(اِن میں سے اور اُن میں سے ہر ایک کو ہم تمہارے پروردگار کی بخشش میں سے کچھ دیتے رہتے ہیں اور تمہارے رب کی بخشش پر پابندی عاید نہیں کی گئی۔)

یعنی خدا کی بخشش کی پابندی ان لوگوں کے لیے نہیں ہے جو دنیا کی ناپائدار زندگی کے خواہاں ہیں اور نہ ان کے لیے پابندی ہے جو آخرت کی شادکامیوں کے طالب ہیں تاہم مال و دولت کے صحیح استعمال ہی سے ایک کو دوسرے پر فوقیت حاصل ہے للذا اگر اسے فسق و فجور، ظلم، اسراف اور تکبر میں صرف کیا جائے گا تو یہ کفران نعمت ہوگا اور زوال نعمت یا اس کی بت پرستی کا سبب بنے گا اور اس سے بہت زیادہ نقصان اور خرابیاں پیدا ہوں گی۔ چنانچہ یہ دیکھا گیا ہے کہ اکثر فضول خرچ اور بدکار دولت مند مفلس قلاش یا خطرناک بیماریوں اور سخت مصائب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح فضول خرچ اور ظالم قومیں کمزور ہو کر اپنی آزادی اور خود مختاری کو کھو بیٹھتی ہیں۔ لیکن مال کو بھلائی اور رفاہ عام کے کاموں میں صرف کرنے سے اس میں اضافہ ہوتا ہے۔ دوسرے مقامات پر ہم اس موضوع کی پوری تحقیق کر چکے ہیں۔ اس سلسلے کی زیب و زینت اور پاکیزہ رزق کے بارے میں یہ آیت کریمہ ہے۔

قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ (۷:۳۲)

(آپ کہہ دیجئے کہ یہ نعمتیں مومنوں کے لیے دنیا کی زندگی میں ہیں اور قیامت کے دن خالص انہی کی ہوں گی۔)

یعنی یہ نعمتیں مومنوں کو دنیا میں مستحق ہونے کی وجہ سے حاصل ہوئی ہیں اور ان میں عالم اسباب کے تقاضوں کے مطابق دوسرے لوگ بھی شریک ہو جاتے ہیں لیکن آخرت میں یہ نعمتیں انہی کے لیے مخصوص ہیں (ملاحظہ ہو تفسیر صفحہ ۲۹۸ جلد ۸) کیونکہ وہ ان کا شکر ادا کر کے آخرت کی مکمل اور ابدی سعادت حاصل کرتے ہیں اگر ایسا نہ ہوتا تو خدا دنیا کی زینت کو صرف کافروں کے لیے مخصوص کر دیتا جیسا کہ اس نے فرمایا ہے۔

وَ لَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّ مَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ۝ وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّ سُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ۝ وَ زُخْرُفًا وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ (۴۳: ۳۳-۳۵)

(اگر یہ بات نہ ہوتی کہ لوگ ایک ہی قوم بن جاتے تو ہم رحمان کا انکار کرنے والوں کے گھروں کی چھتیں چاندی کی بناتے اور ان کے بلند زینے چڑھنے کے لیے ہوتے اور ان کے گھروں کے لیے پھاٹک اور تخت ہوتے جن پر وہ آرام کرتے نیز سونے کی چیزیں ہوتیں یہ دنیا کا سامان ہیں اور آخرت تمہارے پروردگار کے پاس پرہیزگاروں ہی کے لیے ہے۔)

یعنی اگر یہ ناپسندیدہ بات نہ ہوتی کہ اگر دنیا کی نعمتوں اور اس کی زیب وزینت کو کافروں کے لیے مخصوص کر دیا جاتا تو سب لوگ کافر بن جاتے ورنہ ہم ان کی گھروں کی چھتیں اور دروازے چاندی کے بنادیتے اور سیڑھیاں بھی چاندی کی ہوتیں جن پر چڑھ کر وہ اپنے محلات کے بالا خانوں پر پہنچ جاتے اور ایسے ہی ان کے تخت ہوتے اور ایسے ہی سونے کی چیزیں ہوتیں مگر یہ سب دنیا کا عارضی اور ناپائدار ساز وسامان ہے۔ ان کے مقابلے میں آخرت کی نعمتیں پائدار اور ہمیشہ رہنے والی ہیں مگر انسان موجودہ چیزوں کے فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے خدا نے دنیاوی دولت اور اس کی زیب وزینت کو مشترکہ دنیاوی ذرائع پر موقوف رکھا ہے اور مسلمانوں کو اس کا زیادہ حقدار بنایا ہے، وہ ان قدرتی ذرائع سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں کیونکہ وہ خود اعتدال کی زندگی بسر کر کے اور دوسروں کو فائدہ پہنچا کر خداداد نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا ہے اس کی تائید ان قرآنی ہدایت سے بھی ہوتی ہے جن میں مال کی حفاظت اور کفایت شعاری کی تلقین کی گئی ہے جن کا اگلے باب ششم میں ذکر آ رہا ہے۔

اسلامی تمدن کی یہ شریعت اور اعلیٰ تہذیب وثقافت کا خزانہ نظام عالم کی تمام قوموں کی تہذیبوں سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ کیا اس قسم کی باتیں جو ابھی بیان ہوئی ہیں یا جو آگے چل کر بیان ہوں گی انسانی فطرت کے برخلاف محمد ﷺ کی طبیعت سے چالیس سال کے بعد ادھیڑ عمر ہی میں خود بخود پھوٹ نکلی تھیں؟ کیونکہ ایسا کبھی نہیں دیکھا گیا کہ عمر کے اس حصے میں انسانوں کے دل ودماغ سے کبھی ایسی باتیں نمودار ہوئی ہوں جب تک کہ انہوں نے بچپن اور جوانی کی عمر میں ان پر غور وخوض نہ کیا ہو۔ ایسی صورت میں

ایک مومن تو ضرور کہے گا کہ یہ سب باتیں خدائی وحی کا نتیجہ ہیں۔ بہر حال دونوں باتیں خلاف عادت ہیں۔ خدا پر ایمان رکھنے والا تو یہ کہے گا کہ یہ سب وحی کی باتیں ہیں کیونکہ کسی دوسرے کو یہ قدرت حاصل نہیں ہے۔ مگر جو خدا پر ایمان نہیں رکھتا وہ بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گا کہ محمد ﷺ تمام انسانوں سے افضل ہیں کیونکہ انہوں نے ایسے کارنامے سرانجام دیے جو دوسروں کے لیے ممکن نہیں تھے اس لیے وہ اس عمر میں ایسے کارنامے سرانجام نہیں دے سکے۔

۵۔ مال کی حفاظت اور کفایت شعاری:

خدا نے مسلمانوں کے لیے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ وہ فضول خرچی سے مال کی حفاظت کریں اور کفایت شعاری اختیار کریں۔ چنانچہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّ ارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَ اكْسُوْهُمْ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ (۴:۵-۶)

(بیوقوفوں کو اپنا وہ مال نہ دو جسے خدا نے تمہارے لیے ذریعہ معاش بنایا ہے۔ انہیں ان میں سے کھلاؤ اور پہناؤ اور انہیں اچھی بات کہو۔ یتیموں کو آزماتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں اب اگر ان میں ہوشیاری دیکھو تو انہیں ان کا مال دے دو۔)

ان آیات میں خدا نے حکم دیا ہے کہ یتیموں کو آزماتے رہا کرو اور ان کا مال انہیں اس وقت تک سپرد نہ کرو جب تک ان کے کام میں ہوشیاری ظاہر نہ ہو، تاکہ وہ مال و دولت کو مضر کاموں میں یا بیکار ضائع نہ کریں۔ مومنوں کی صفات بیان کرتے ہوئے خدا فرماتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۝ (۲۵:۶۷)

(وہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں بلکہ اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہیں۔)

۲۔ لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ وَ مَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ (۶۵:۷)

(خوشحال کو چاہیے کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق صرف کرے اور جس کا رزق تنگ ہے وہ اس میں سے صرف کرے جو خدا نے اسے دیا ہے۔)

یہ آیت اس مطلقہ عورت کے نان نفقہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو عدت میں ہو۔ یہ عام ہدایت ہے اس وجہ سے شان نزول کے مخصوص حالات کے باوجود اس کی عمومیت باقی رہتی ہے۔

صرف کرنے کے سلسلے میں یہ عام ارشاد ہے۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ (۲:۳)

(ہم نے انہیں جو کچھ دیا ہے اس میں سے کچھ وہ خرچ کرتے ہیں۔)

اس آیت کے مطابق ہر ایک کے لیے یہ ضروری ہے خواہ وہ مالدار ہو یا تنگدست کہ وہ خداداد رزق میں سے سب نہیں بلکہ کچھ صرف کرے۔ اقتصادیات کا سب سے بڑا اصول ہے کیونکہ جو شخص اپنی کمائی کا کچھ حصہ صرف کرتا ہے اور کچھ بچاتا ہے تو وہ شاذونادر ہی تنگدست ہوتا ہے۔

سورۃ اسراء کی حکیمانہ ہدایت میں ان آیات کا ذکر آچکا ہے جن میں فضول خرچی اور حد درجہ کنجوسی کا برا انجام بیان کیا گیا ہے ان میں یہ آیت بھی شامل ہے۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۝ (۱۷:۲۶)

(رشتہ دار غریب اور مسافر کا حق ادا کرو اور بہت زیادہ فضول خرچی نہ کرو۔)

اگر ان ہدایات کے ساتھ ساتھ ان کی حکمتیں، اسباب اور فوائد مذکور نہ ہوتے تو انہیں حکمت نہیں کہا جاسکتا تھا یہی وجہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں فضول خرچی کی ممانعت کے ساتھ ساتھ یہ الفاظ آئے ہیں۔

اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ (۱۷:۲۷)

(درحقیقت فضول خرچ شیطان کے بھائی ہیں۔)

کیونکہ وہ اپنے اسراف کی بدولت معاشی نظام کو خراب کرتے ہیں اور خدائی نعمت کی حفاظت نہ کرکے اور اسے اعتدال میں نہ رکھ کر اس کی ناشکری کرتے ہیں اس وجہ سے اس کے بعد یہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ۝ (۱۷:۲۷)

(شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔)

اس کے بعد یہ فرمایا گیا ہے۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ﴿۲۹﴾

(۱۷:۲۹)

(تم اپنا ہاتھ نہ تو اپنی گردن میں لٹکائے رکھو اور نہ اسے بالکل کھول دو ورنہ ملامت زدہ اور درماندہ ہو کر بیٹھ جاؤ گے۔)

مذکورہ بالا آیت میں فضول خرچی کے برے انجام کی یہ توجیہ بیان کی ہے کہ نہ صرف لوگ فضول خرچی کی برائی کریں گے بلکہ اس کی مالی حیثیت اور طاقت بھی ختم ہو جائے گی اور وہ عاجز اور مفلس بن کر پریشان رہا کرے گا کیونکہ وہ انجام پر غور نہیں کرتا ہے۔

اگر مسلمان کفایت شعاری کے بارے میں ان حکیمانہ آیات پر غور و فکر کرتے اور ان ہدایات پر عمل کرتے تو انہیں مال و دولت کی حفاظت میں اور کسی کتاب یا ہدایت کی ضرورت نہ ہوتی اور مسلمانوں میں شاذ و نادر ہی کوئی مفلس نظر آتا۔ علاوہ ازیں اگر یہ قرآن کریم حضرت محمد ﷺ کی فطرت، آپ کی رائے اور احساسات کا تابع ہوتا تو اس قسم کی کفایت شعاری کی تعلیم اس میں موجود نہ ہوتی کیونکہ آپ کی فطرت اور طبیعت پر بخشش اور احسان کا جذبہ زیادہ غالب تھا۔ اس قسم کا مزاج رکھنے والا بہت کم کفایت شعاری کا خیال رکھتا ہے لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ یہ سب ہدایات پروردگار کی طرف سے نازل ہوئی ہیں۔

۶۔ مال کا انفاق قومی زندگی کی بنیاد ہے:

اللہ کے راہ میں مال صرف کرنا ایمان کی نشانی، قومی زندگی کا ذریعہ، سلطنت کی عزت اور انسانی فلاح کا سبب ہے۔ اس بناء پر یہ اصول قرآنی مالیات اور اسلامی تہذیب و تمدن کی اصل بنیاد ہے۔ اس سے پہلے کے ابواب میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ اس کے ذرائع ہیں اور آگے چل کر جو بیان ہوگا وہ اس کی عملی صورت ہے۔ اس کی سب سے واضح دلیل یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے اسے صحیح اسلام اور بنیادی ایمان کا معیار قرار دیا ہے کیونکہ اس کی شہادت کے بغیر ایمان کا دعویٰ باطل سمجھا جاتا ہے گو اسلام کا اطلاق ظاہری رسوم پر جن پر عملی احکام کی بنیاد ہے کیا جاسکتا ہے مگر خدا اندرونی باتوں پر محاسبہ کرتا ہے بلکہ روز قیامت میں جزا اور سزا کا دار و مدار بھی اسی پر ہے۔ ایسی صورت میں اسلام ایسے عمل کا نام ہے جو محض ظاہری بھی ہو سکتا ہے جس میں خلوص اور ایمان نہ ہو مگر ایمان اس دلی عقیدہ

کا نام ہے جس میں اسلامی احکام پر عمل بھی ضروری ہے۔ گو نفاق کے بغیر نیک نیتی کے ساتھ ظاہری اسلام بھی ایمان تک پہنچنے کا قریبی ذریعہ ہے۔ ایمان اور اسلام کے اس فرق کو ظاہر کرنے والی بنیادی آیت کریمہ یہ ہے۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ (۴۹: ۱۴-۱۵)

(بدوی لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں (اے پیغمبر) آپ کہہ دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے ہو بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں ایمان تو ابھی تک تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو گے تو وہ تمہارے عمل کے ثواب میں کوئی کمی نہیں کرے گا اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ وہی اصل مومن ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر وہ شک وشبہ میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ اللہ کی راہ میں اپنے مال وجان سے جہاد کرتے رہے۔ یہی لوگ سچے ہیں۔)

مذکورہ بالا آیات میں صحیح ایمان اور اس کے مدعیوں کی صداقت کو ثابت کرنے کے لیے مالی جہاد کو جان کے جہاد سے مقدم رکھا گیا ہے۔

اس دلیل کی مؤید وہ آیت ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کی محبت میں مال ودولت صرف کرنا ایمان کی سب سے بڑی نشانی ہے اس کے بعد نماز اور پھر زکوٰۃ کا ذکر کیا گیا ہے جسے مسلمانوں کا حاکم لازمی طور پر وصول کر لیتا ہے۔ ان کے بعد دوسری بنیادی نیکیاں اور اعلیٰ اخلاق کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ آیت کریمہ یہ ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰي حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَـتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّاۗىِٕلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰھَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝

(۲: ۱۷۷)

(بھلائی یہ نہیں ہے کہ اپنا منہ مشرق اور مغرب کی طرف کرو بلکہ نیکی یہ ہے کہ انسان اللہ پر روز آخرت پر فرشتوں پر آسمانی کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لائے اور اللہ کی محبت کی وجہ سے رشتہ داروں، یتیموں، غریبوں، مسافروں، سائلوں اور غلام کو آزاد کرنے کے لیے مال خرچ کرے۔ نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے۔ نیز معاہدہ کرنے کے بعد عہد پورا کیا جائے (وہ بھی نیک ہیں جو) تنگدستی، تکلیف اور جنگ

کے موقع پر صبر کرتے ہیں یہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ پرہیز گار ہیں۔)

وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ کی تفسیر میں مفسرین کی دو رائے ہیں۔ اوّل یہ کہ انسان مال کی محبت کے باوجود اسے صرف کرے جیسے یہ ارشاد ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (۳:۹۲)

(تم ہرگز نیکی حاصل نہیں کر سکتے جب تک اپنی محبوب چیز خرچ نہ کرو۔)

دوسرا قول یہ ہے کہ اللہ سے محبت کی بناء پر مال صرف کرنے جیسا کہ فرمایا۔

وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا (۷۶:۸)

(وہ اللہ کی محبت میں غریب، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔)

اس بارے میں کہ دولت اور دنیا کی ہر چیز پر اللہ اور اس کے رسول کی محبت کو ترجیح دینا ضروری ہے۔ یہ آیت قابل غور ہے۔

قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْھَا وَتِجَارَۃٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَھَا وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَھَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَجِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِہٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ (۹:۲۴)

(کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے والدین تمہارے بیٹے تمہارے بھائی تمہاری بیویاں تمہارا خاندان اور وہ مال جو تم نے کمار کھا ہے اور وہ تجارت جس کی کساد بازاری کا تمہیں اندیشہ ہے اور وہ مکانات جنہیں تم پسند کرتے ہو۔ تمہیں اللہ اور اس کے رسول سے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پسند ہیں تو انتظار کرو۔ یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیجے۔ اللہ نافرمان قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔)

راہ خدا میں مال صرف کرنے والے مومنوں کو دوسرے مسلمانوں پر ان آیات میں فضیلت دی گئی ہے۔

لَا یَسْتَوِی الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ وَالْمُجٰھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فَضَّلَ اللّٰہُ الْمُجٰھِدِیْنَ بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ عَلَی الْقٰعِدِیْنَ دَرَجَۃً وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنٰی (۴:۹۵)

(وہ مسلمان جو بغیر کسی عذر کے گھر میں بیٹھے رہے اور وہ لوگ جو اپنے مال و جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں برابر نہیں ہیں اللہ نے مال و جان سے جہاد کرنے والوں کا درجہ ان لوگوں سے بہت زیادہ رکھا ہے جو گھر میں بیٹھ گئے ہیں۔ اللہ نے سب سے نیکی کا وعدہ کیا ہے۔)

۲۔ وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَ قٰتَلُوْا وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى (۵۷:۱۰)

(تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں صرف نہ کرو حالانکہ آسمان اور زمین اللہ کی میراث ہیں۔ جن لوگوں نے فتح (مکہ) سے پہلے مال صرف کیا ہے اور لڑائی لڑی ہے تم میں سے کوئی ان کے برابر نہیں ہے۔ ان لوگوں کا درجہ ان سے کہیں بڑا ہے جنھوں نے فتح کے بعد مال خرچ کیا ہے اور جہاد میں حصہ لیا ہے۔ تاہم ہر ایک سے خدا نے نیکی کا وعدہ کیا ہے۔)

نیک کاموں میں مال صرف کرنے کا ذکر بیسیوں آیات میں آیا ہے، اسی طرح صدقہ اور زکوٰۃ کا بکثرت ذکر ہے بلکہ کئی مقامات پر صدقہ اور خیرات کو نہایت عمدہ طریقے سے خدائی قرضہ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور خدا کو قرض دینے والے کو دوگنا اجر دینے کا وعدہ کیا ہے جیسا کہ ان آیات میں مذکور ہے۔ (۲:۲۴۵، ۵۷:۱۱، ۶۴:۱۷)

راہ خدا میں مال صرف کرنے کی ترغیب، اس کے ثواب میں اضافہ کرنے اور اس کے آداب کے بیان میں سورۃ بقرہ کے آخر کی بیس آیات ہیں جو قرآن کریم کی آخری آیات بھی ہیں جن میں سود خوری پر سخت وعید بھی نازل ہوئی ہے (ملاحظہ ہو آیات نمبر ۲۶۱۔۲۸۱) ان کی تشریح ہماری تفسیر کے تیسرے حصے میں ہے، نیز لفظ مال کے ماتحت جلد ۱۰:۱۱ میں بھی ان کی توضیح ملاحظہ ہو)۔

یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ اس زمانے میں مسلم قومیں دوسری قوموں کے مقابلے میں راہ خدا میں بہت کم مالی قربانی کرتی ہیں حالانکہ اسی سے ان کی آزادی محفوظ رہ سکتی ہے اور اسی کی بدولت ان کے ملک کی عزت ہوتی ہے اور اسی سے خدا کے مذہب کا بول بالا ہو سکتا ہے بلکہ اسی ذریعے سے ان کی قوم ترقی یافتہ بن سکتی ہے۔ ایسی صورت میں دوسری قومیں یہ ضرور تسلیم کر لیتیں کہ ان کا مذہب سب مذاہب عالم سے بہتر ہے اور وہ مان لیتیں کہ دولت کے پرستاروں سے موجودہ تہذیب و تمدن اور کروڑوں انسانوں کو چھڑانے کی یہی صورت ہے کہ اسی مذہب کو اختیار کیا جائے نیز روسی کمیونزم کی مذہبی اور اخلاقی ابتری سے دنیا کو یہی مذہب بچا سکتا ہے۔

۷۔ اسلام کا مالی نظام :

خدا نے فرمایا ہے۔

خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمۡ وَتُزَكِّيۡهِمۡ بِهَا (۹ : ۱۰۳)

((اے پیغمبر) ان کے مال میں سے خیرات وصول کیجیے اور انہیں پاک وصاف بنا دیجیے۔)

اس آیت کی تفسیر میں میں نے پوری ایک فصل تحریر کی ہے جس میں فرض زکوٰۃ خیرات عالم انسانیت کے لیے مالی اصلاحات اور اسی معاملے میں دیگر مذاہب کے مقابلے میں اسلام کی امتیازی خصوصیات بیان کی گئی ہیں اور واضح کیا گیا ہے کہ انسانی زندگی میں مال و دولت کا کیا مقام ہے اور بغاوتوں، جنگوں سیاست تہذیب و تمدن میں اسے کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ بعض قوموں نے سرمایہ داری اور ذخیرہ اندوزی میں انتہا کر دی ہے اور اس کے ذریعے انہوں نے کروڑوں انسانوں کو غلام بنا لیا ہے، یہ قومیں سرمایہ دار کہلاتی ہیں۔ ان کے مقابلے میں دوسری جماعتیں کھڑی ہوئی ہیں وہ انسانوں کے بین الاقوامی نظام کو توڑ کر ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہتی ہیں جس میں سب لوگ برابر کے شریک ہوں۔ یہ لوگ بالشویک اور کمیونسٹ کہلاتے ہیں۔ ان دونوں میں جو اختلافات اور جھگڑے ہیں وہ بھی میں نے بیان کر دیئے ہیں۔

اس کے بعد میں نے یہ واضح کیا ہے کہ یہ سب فتنے ہیں جن سے دنیا کی تباہی اور بربادی کا اندیشہ ہے۔ ان سب کا علاج اسلام کی مالی اصلاحات کے اجرا پر موقوف ہے۔ ان اصلاحات کا خلاصہ میں نے چودہ اصولوں میں بیان کیا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ اسلام نے ذاتی ملکیت کو حدود کے ساتھ تسلیم کیا ہے مگر ناجائز طور پر لوگوں کا مال کھانا حرام قرار دیا ہے۔

۲۔ سود خوری اور جوئے بازی حرام ہے۔

۳۔ مال و دولت کو مالداروں میں گردش کرنے سے روکا ہے۔

۴۔ کم عقل انسانوں کے مال پر پابندی لگا دی ہے تاکہ وہ اسے اپنے لیے اور قوم کے لیے مضر کاموں میں نہ ضائع کریں۔

۵۔ ابتدا ہی سے زکوٰۃ فرض کر کے اسلام کا اشتراکی نظام قائم کیا گیا جس کا محرک حکام کی زبردستی نہیں ہے بلکہ دلی عقیدہ ہے اس لیے جہاں اسلامی حکومت بھی نہ ہو وہاں

بھی یہ نظام جاری رہ سکتا ہے۔

۶۔ جب اسلامی حکومت قائم ہو گئی تو یہ اختیاری صورت منسوخ کر دی گئی اور زکوۃ کی مقدار اس طرح مقرر کی گئی کہ ہر سال سونے چاندی اور تجارت کے مال پر نصاب پورا ہونے کی صورت میں چالیسواں حصہ ادا کیا جائے۔ زرعی فصلوں پر دسواں اور پانچواں حصہ ہے کیونکہ ان پر خوراک کا دارومدار ہے۔ مویشی پر بھی زکوۃ مقرر ہے نیز زمین میں دفن کیے ہوئے خزانہ اور معدنیات پر پانچواں حصہ مقرر ہے۔

۷۔ زوجیت اور رشتہ داری کا نان نفقہ مقرر ہے۔

۸۔ بے کسوں کی خبر گیری ضروری ہے خواہ وہ کسی مذہب وملت سے تعلق رکھتے ہوں اسی طرح مسافروں کی مہمان نوازی بھی ضروری قرار دی گئی ہے۔

۹۔ بعض گناہوں اور جرائم کے کفارے میں مال صرف کرنا ضروری ہے۔

۱۰۔ محتاجوں کو خیرات دینا مستحب قرار دیا ہے۔

۱۱۔ اسراف اور بخل دونوں کی مذمت کی گئی ہے۔

۱۲۔ زیب وزینت اور پاکیزہ کھانے مشروط طور پر جائز قرار دیے گئے ہیں۔

۱۳۔ اعتدال اور کفایت شعاری کو مستحب بلکہ واجب قرار دیا گیا ہے۔

۱۴۔ شاکر دولت مند کو صابر فقیر سے افضل قرار دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے میں نے زکوۃ کے مصارف کی مندرجہ ذیل آیت کی تفسیر میں تشریح کر دی ہے۔

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (۹:۶۰)

(درحقیقت صدقات، فقیروں، غریبوں، خیرات وصول کرنے والوں اور ان لوگوں کے لیے ہیں جن کی تالیف قلوب کی جائے نیز غلام کو آزاد کرنے قرض خواہوں کے لیے اور خدا کی راہ میں اور مسافروں کے لیے (مقرر کیے گئے) ہیں۔)

اس کے بعد میں نے سورہ توبہ کے آخر میں بطور خلاصہ ایک فصل تحریر کی ہے جس میں اسلام کے مالی احکام جمع کر دیئے ہیں ان کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ مالیات کے مذہبی اور اجتماعی مسائل۔

۲۔ مال کی قسمیں اور مصارف

۳۔ انسانوں کے لیے اسلام کی مالی اصلاحات کے فوائد (مزید تفصیل کے لیے ہماری تفسیر ملاحظہ فرمائی جائے۔)

مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مال و دولت کی اصلاح کے لیے اسلام نے جو علمی اصول مقرر کیے ہیں وہی "خیر عام" کا ذریعہ بن سکتے ہیں جیسا کہ خداوند تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس کا نام رکھا ہے۔ انہی مذہبی ہدایات اور اسلام کے بین الاقوامی قوانین کی بنیاد پر باہمی جھگڑے دور ہو سکتے ہیں اور یہی اصول تمام انسانوں کے لیے ان کے مختلف حالات اور ان کی مختلف صلاحیتوں میں قابل عمل بن سکتے ہیں اور ان اصولوں کی بدولت وہ دین و دنیا میں شاد کام ہو سکتے ہیں۔ ایسے اصول نہ کسی مذہب میں پائے جاتے ہیں نہ انسانی قانون و حکمت کی کتابوں میں موجود ہیں۔

دولت اور سرمایہ کے جھگڑوں کی وجہ سے ایسی صورت حال پیدا ہو گئی ہے جس کی بنا پر انسانیت ایک ایسے خطرے سے دوچار ہے جس کو دنیا کے سیاست دان نہیں روک سکتے حالانکہ فلاح کا راستہ ان کے سامنے کھلا ہوا ہے مگر وہ انہیں نظر نہیں آتا۔ وہ سیدھا راستہ اسلام اور قرآنی ہدایت کا ہے جیسا کہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝

(۲۵۱:۲)

(اگر خدا لوگوں کی زیادتیاں ایک دوسرے کے ذریعے دور نہ کرتا تو زمین میں فساد پھیل جاتا لیکن اللہ تعالیٰ تمام جہانوں پر فضل کرنے والا ہے۔)

اس تمام گفتگو کا مقصد یہ ہے کہ وحی محمدی دراصل وحی الٰہی ہے کیونکہ ہماری عقل یہ ہرگز یقین نہیں کر سکتی کہ حضرت محمد ﷺ نے جو امی نبی تھے اور جن کی تاریخ ہم معلوم کر چکے ہیں۔ اپنی "نفسیاتی وحی" کے ذریعے پچاس سال کے بعد کی عمر میں یعنی ہجرت کے بعد ایسے حقائق کا سراغ لگایا ہو جو تمام آسمانی اور انسانی کتابوں کے حقائق سے فوقیت لے گئے ہیں اور جن کی نظیر سب سے زیادہ ترقی یافتہ، سائنس، حکمت اور بین الاقوامی قوانین کے عہد حاضر میں بھی نہیں مل سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ شخص جس کا یہ عقیدہ ہے کہ اس دنیا کا پروردگار بہت مہربان مدبر اور علم و حکمت والا خدا ہے وہ بھی یہی یقین کرے گا کہ یہ سب کچھ خدائی وحی ہے جو اس نے اپنے خاتم النبیین پر اسی وقت نازل

فرمائی جب انسان ان باتوں کو سمجھنے کے قابل بن چکے تھے اور اس کے بعد انہیں کسی اور وحی کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔

قرآن مجید کا مقصد ہشتم

اسلام کا نظام جنگ

اسلام نے نظام جنگ کی اصلاح کی ہے، اس کی خرابیاں دور کر کے اسے انسانیت کی بھلائی کے لیے محدود کر دیا ہے اس لیے ہم اسلام کے فلسفہ جنگ و صلح اور معاہدات پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہیں۔

زندہ انسانوں میں ذرائع معاش اور حصول مال وجاہ میں تصادم ہونا انسانی زندگی کا طبعی تقاضا ہے۔ زندگی کی اسی کشمکش کا نتیجہ جماعتوں اور قوموں میں باہم قانون دشمنی اور جنگوں کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اس طرح یہ تصادم سماجی زندگی کا قانون اور اس کی ناگزیر ضرورت بن گیا ہے بلکہ کبھی کبھی یہ تہذیب وتمدن کا ذریعہ بھی بن جاتا ہے چنانچہ جب کبھی حق و باطل میں تصادم ہوتا ہے تو حق ہی کو فتح حاصل ہوتی ہے۔ علم و جہالت کی کشمکش ہو تو علم کامیاب ہوتا ہے۔ خیر اور شر کی لڑائی میں نیکی غالب آتی ہے اور اگر منظم حکومت اور بد نظمی کی طاقتوں کی لڑائی ہوتی ہے تو ہمیشہ منظم طاقت غالب آتی ہے۔ چنانچہ حق و باطل کے بارے میں خدا فرماتا ہے۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ (۲۱: ۱۸)

(بلکہ ہم حق کو باطل پر پھینک مارتے ہیں (جب) حق باطل کا سر توڑتا ہے تو باطل مردہ ہو جاتا ہے۔)

اسی حق و باطل کے سلسلے میں اس نے ایک مثال بیان کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے۔

فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۚ وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (۱۳: ۱۷)

(لیکن جھاگ (باطل) سوکھ کر وہ جاتا ہے مگر جو چیز آدمیوں کو فائدہ پہنچاتی ہے وہ زمین میں باقی رہتی ہے۔)

ان آیات کی مکمل تشریح پہلے بیان کی جاچکی ہے۔

باطل پرستی، ظالمانہ اقتدار، کمزوروں کو غلام بنانے کے لیے اور دنیا میں اپنی عظمت اور اقتدار قائم کرنے کے لیے باہمی جھگڑے، دشمنیاں اور جنگجوئی کے نقصانات بہت زیادہ ہیں۔ ان کے شعلے چاروں طرف بھڑک اٹھتے ہیں بلکہ خونریزی سے دلوں میں کینے پیدا ہوتے ہیں اور انتقامی جذبات بھڑک اٹھتے ہیں چنانچہ موجودہ زمانے میں یہ خرابیاں اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ اب خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ یہ شاندار تہذیب تھوڑے ہی عرصے میں تباہ و برباد ہو جائے گی کیونکہ سائنس کی ترقیوں نے ایسے تباہ کن آلات جنگ پیدا کر دیئے ہیں جیسے زہریلی گیس اور تباہ کن اور آتش گیر مواد ہے جو فضائے آسمانی سے تباہ کن منڈ لاتے ہوئے ہوائی جہازوں کے ذریعے پھینکا جاتا ہے۔ ان کے ذریعے ہزاروں مرد عورتوں اور بچوں کی گنجان آبادیوں اور شہروں پر اس طرح حملہ کیا جاتا ہے کہ وہ سب کے سب ایک گھنٹے میں یا چند گھنٹوں میں فنا ہو جاتے ہیں۔

جنگی طاقتوں والی بڑی بڑی سلطنتیں بھی ان خطروں کو دور کرنے سے عاجز آ گئی ہیں یہاں تک کہ وہ سلطنتیں جن کے پاس سب سے زیادہ سامان جنگ، بڑے بڑے بحری اور ہوائی بیڑے اور بے شمار تباہ کن آلات جنگ اور مال و دولت ہے، وہی سب سے زیادہ خائف اور پریشان ہیں کہ کہیں دشمن ان کی تمام قوم اور ملک کا مع ساز و سامان خاتمہ نہ کر دے۔ اس وجہ سے ان کے تمام شہر جدید ترین سامان حفاظت سے محفوظ کیے جاتے ہیں۔ اس پر بھی ان کے سیاست داں اپنے حریفوں سے امن وامان قائم کرنے کے لیے معاہدات کے لیے گفت و شنید کرتے رہتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے سامنے قسمیں کھاتے ہیں پھر بھی ناکام ہو کر عہد شکنی کرتے ہیں اور جو فیصلہ کرتے ہیں اس کی کوئی تاویل نکال کر اسے مسترد کرتے ہیں اور فریب دے کر واپس آ جاتے ہیں۔

موجودہ معاہدوں پر قرآنی فیصلہ:

موجودہ سلطنتوں کی اس حیرت ناک ناکامی کی وجہ خدا نے قرآن کریم میں خاص انداز میں بیان فرمائی ہے۔ ذیل کی آیت اگرچہ بت پرست عربوں کے زمانے میں نازل ہوئی تھی مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جاہلیت کے عربوں کے بجائے مغربی طاقتوں کے حق میں زیادہ صادق آتی ہے، گویا کہ خاص انہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ بھی قرآن کریم

کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے بہر حال خداوند تعالیٰ نے لوگوں کو معاہدات کی پابندی کرنے اور بد عہدی سے منع کرنے کے بعد اس طرح ارشاد فرمایا ہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ أَنْ تَكُونَ أُمَّةٌ هِيَ أَرْبَىٰ مِنْ أُمَّةٍ (۱۶: ۹۲)

(تم اس عورت کی طرح نہ بنو جو اپنے سوت کو بن چکنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی ہے تم اپنی قسموں کو آپس میں مکر و فریب کا ذریعہ بناتے ہو۔ تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ جائے۔)

اس آیت کی تشریح یہ ہے کہ تم اس بیوقوف عورت کی طرف نہ بن جاؤ جو اپنا سوت بننے کے بعد اسے بار بار توڑتی رہتی ہے۔ اس طرح تم بھی بار بار معاہدے کر کے اسے توڑتے رہتے ہو۔ تم ان معاہدوں کو اپنی پوشیدہ چال بازی کا ذریعہ بناتے ہو تاکہ اس طریقے سے اپنی سیاسی معاشی اور تجارتی حالت کو مضبوط بنا کر آیندہ اپنے دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے زیادہ تیار ہو سکو۔

اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ اقوام عالم کے مابین معاہدات صلح واتفاق کا مقصد اصلاح انصاف اور مساوات ہونا چاہیے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ان کی بنیاد اخلاص اور نیکی پر ہو نہ کہ ایسی فریب کاریوں اور چالبازیوں پر جن کا مقصد یہ ہو کہ ایک قوم اپنی تعداد، جماعت اور مفادات کو دوسری قوم کے مقابلے میں زیادہ بڑھا سکے۔ جیسا کہ آج کل مغربی طاقتیں معاہدات کرتی ہیں بالخصوص پہلی جنگ عظیم کے بعد معاہدہ ورسائی (انہی بدنیتوں کا مظہر ہے)۔

اگر اہل مغرب اس ہولناک خطرے سے نکلنا چاہیں تو انہیں مذہب اسلام میں پناہ ملے گی کیونکہ وہ حق وانصاف اور سلامتی کا مذہب ہے۔

اب جنگ و صلح کے بارے میں قرآنی اصول بیان کیے جاتے ہیں۔

۱۔ جنگ و صلح کے اسلامی اصول:

ہم نے سورۃ انفال کی آیات سے جنگ و صلح اور معاہدات سے متعلق ایک بنیادی اصول پیش کر کے اسی سورت کی تفسیر کے خلاصہ میں بیان کر دیا ہے جس کا مجمل بیان اس کے باب ہفتم میں ہے اور مذکورہ آیات کی تفسیر میں ان کی تفصیلات ہیں۔ اسی طرح سورۃ توبہ کی آیات سے بھی اصول جنگ مستنبط کیے ہیں جن میں سے اکثر معاہدات، ان

کی پابندی ان کے شرائط، صلح ناموں اور دارالاسلام میں دشمن کو پناہ دینے سے متعلق ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ جنگ اور جزیہ کے بیس احکام ہیں جسے ہم نے اس سورۃ کی تفسیر کے خلاصہ میں بیان کیا ہے (ملاحظہ ہو تفسیر المنار جلد ۱۰ صفحہ ۱۳۹۔۱۴۴)

یہاں ہم تفصیلات سے گریز کر کے مختلف سورتوں سے چند اصول استنباط کر کے نمونہ کے طور پر پیش کرتے ہیں کیونکہ یہاں ہم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے یہ تمام اصول اپنی ذاتی رائے اور فکر سے تیار کیے ہوں۔ جب کہ آپ ﷺ نے نبوت سے پہلے گوشہ نشینی اور تنہائی کی زندگی بسر کی تھی، بچپن میں گلہ بانی اور جوانی میں تجارت کی تھی مگر اس کے باوجود آپ ﷺ نے وہ اصول اور علوم پیش کیے جن سے نہ صرف الہامی اور آسمانی کتابیں قاصر رہیں بلکہ انسانی حکمت و قوانین کی کتابیں بھی انہیں پیش نہ کر سکیں۔

اسلامی جنگ کی نوعیت:

اسلام نے جنگ کی پیش قدمی کرنے والوں کا مقابلہ کرنے کا حکم دیا ہے تاکہ اپنی حفاظت ہو سکے۔ فتنہ وفساد دور ہو اور امن وامان قائم ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ ظلم وسرکشی کی وجہ سے مسلمانوں کو جنگ کی پیش قدمی کرنے سے منع کیا۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝

(۱۹۰:۲)

(اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے لڑتے ہیں مگر زیادتی نہ کرو کیونکہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔)

اس آیت کریمہ میں سرکشی اور زیادتی کی نیت سے جنگ کرنے کو اس لیے روکا گیا ہے کہ خدا ظالموں کو پسند نہیں کرتا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس قسم کی جنگ کی ممانعت قطعی ہے اور منسوخ نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اس آیت کی تشریح میں ہم نے اپنی تفسیر کے دوسرے حصے میں یہ واضح کیا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے کافروں سے جتنی جنگیں لڑیں وہ سب مدافعانہ تھیں نہ کہ جارحانہ۔ پھر سورۃ توبہ کی آیت سیف کی تفسیر میں ہم نے بیان کیا ہے کہ مشرکین عرب سے جنگ اور فتح مکہ کے بعد ان سے معاہدہ منسوخ کرنے کا

معاملہ بھی اسی اصول پر مبنی تھا۔ حالانکہ اسلام کی عربوں کے ساتھ سیاسی پالیسی دیگر اقوام کے ساتھ سیاسی پالیسی سے بالکل مختلف تھی کیونکہ اسلام ان عربوں کو ان کی اپنی مرضی سے مسلمان بنانا چاہتا تھا جو کسی خاص شریعت کے پابند نہ تھے، اس لیے اس نے ان کے دلوں سے شرک کے عقائد کی بیخ کنی کی۔ نیز اسلام کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ جزیرہ عرب کو خالص اسلام کا گہوارہ، اس کا مضبوط قلعہ اور مرکز بنائے۔ ان کے برخلاف اسلام نے دوسری قوموں کو ان کے وطن میں باقی رکھا اور ان کے مذہب سے تعرض نہیں کیا۔

اسی بحث میں میں نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہ پر یہ بات شاق گذری تھی کہ مشرکین مکہ نے معاہدوں کو توڑ کر جنگ شروع کر دی ہے۔ اس سے پہلے بھی وہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ اپنے معاملات کو بار بار توڑ چکے تھے کیونکہ ان کا کوئی دلی عقیدہ یا مقرر ضابطہ نہ تھا جس کے مطابق وہ معاہدہ کی پابندی کو ضروری سمجھتے۔ اس لیے یہ ارشاد فرمایا گیا۔

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ

(۹: ۱۳)

(تم اس قوم سے کیوں جنگ نہیں کرتے ہو جنھوں نے اپنی قسمیں توڑیں اور رسول اکرم ﷺ کو نکالنے کا قصد کیا اور ساتھیوں نے پہلی مرتبہ جنگ کی ابتدا کی (لہٰذا انہوں نے جارحانہ جنگ کی)۔

(ان آیات کی تفسیر سورۃ توبہ کے آغاز میں ہماری تفسیر کے دسویں حصے میں ملاحظہ فرمایئے) بعض غافلوں کو (جارحانہ جنگ کے سلسلے میں) غلط فہمی اسی وجہ سے ہوتی ہے کہ بعض غزوات اور سریوں میں مسلمانوں نے پیش قدمی کی تھی۔ وہ یہ فراموش کر چکے ہیں کہ مشرکوں نے جنگ کی ابتداء کر کے اور اسے جاری رکھ کر حالت جنگ پیدا کر دی تھی ایسی صورت میں یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر معرکہ میں مسلمانوں کی دفاعی پوزیشن ہو (بلکہ حالت جنگ نمودار ہونے کے بعد مسلمان موقع اور محل کے مطابق پیش قدمی کر سکتے ہیں)

جنگ کے آخری احکام میں بھی بعینہٖ وہی بات کہی گئی ہے جو جنگ کے آغاز کی پہلی آیت میں بتائی گئی ہے۔ سورۃ حج کی یہ آیت مندرجہ ذیل ہے۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۝ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ (۲۲: ۳۹، ۴۰)

(ان لوگوں کو جنگ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے جن سے جنگ کی جاری ہے کیونکہ یہ لوگ مظلوم ہیں در حقیقت اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ان کے گھروں سے اس بات پر نکال دیا گیا کہ وہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے۔)

ان آیات کا باقی ماندہ حصہ دوسرے اصول میں بیان کیا جائے گا۔

جب مشرکین مکہ نے معاہدہ حدیبیہ کو جو انہوں نے رسول اکرم ﷺ کے ساتھ ۶ھ میں قائم کیا تھا توڑ دیا اور آپ نے مکہ معظمہ کو فتح کرنے کا ارادہ کیا تو اس موقع پر سورۃ ممتحنہ نازل ہوئی جس میں مسلمانوں کو مشرکین مکہ کے ساتھ دوستی رکھنے کو منع کیا گیا تھا۔ اسی سورۃ میں یہ تصریح کر دی گئی تھی کہ یہ عدم موالات صرف ان مشرکوں کے لیے ہے جنھوں نے مسلمانوں سے جنگ کی اور انہیں محض مذہبی تعصب کی وجہ سے ان کے گھروں سے نکالا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی مشرک کے ساتھ نیکی اور انصاف نہ کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے سورۃ ممتحنہ۔۶۰) کی آیات۔(۷۔۹) غور سے ملاحظہ فرمائی جائیں۔

۲۔ جنگ کا مقصد اور نتیجہ :

دشمن کے ظلم و ستم کا انسداد کرنے اور امن وامان بحال کرنے کے بعد اسلام نے جنگ کا مقصد مثبت قرار دیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ تمام مذاہب عالم کو جبر و تشدد سے بچایا جائے اور مسلمان صرف ایک خدا کی عبادت کر سکیں، اس کے مذہب کا بول بولا کریں انہیں اس کی شریعت کی تبلیغ و تعمیل کی آزادی ہو۔ کیونکہ یہ مذہب تمام انسانیت کی بھلائی اور فلاح کے لیے ہے، ان پر ظلم و تعدی کرنے کے لیے نہیں ہے۔ اس کا سب سے پہلا ثبوت مذکورہ بالا آیت کا یہ آخری حصہ ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۭ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝

(۲۲:۴۰-۴۱)

(اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے سے نہ روکتا تو خانقاہیں تعلیم گاہیں عبادت خانے اور مساجد ڈھادی جاتیں جن میں اللہ کا بہت ذکر کیا جاتا ہے۔ اللہ ضرور ان کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے۔

بے شک اللہ زبردست اور زور والا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین پر جگہ دیں تو نماز قائم کریں زکوۃ ادا کریں نیکی کا حکم دیں برائی سے منع کریں معاملات کے نتائج تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔)

جنگ کی اجازت دینے کے سلسلے میں تین باتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱۔ مسلمان مظلوم تھے، ان پر زیادتی کی جارہی تھی اور اسلام قبول کرنے کی وجہ سے انہیں ان کے گھروں اور جائیدادوں سے جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ یہ سب انہی کے لیے مخصوص ہے اس میں ذاتی اور وطنی دونوں حیثیتیں شامل ہیں۔ یا یوں کہا جائے کہ اس میں دینی اور دنیاوی دونوں اسباب جمع ہیں۔

چنانچہ ہم نے اس مقصد کو سورۃ انفال کے قواعد جنگ کا مستقل اصول قرار دیا ہے اور اسے "مذہبی آزادی اور مذہبی فتنہ کے انسداد" سے تعبیر کیا ہے تاکہ کسی کو اس کے مذہب سے لوٹانے کے لیے کوئی تکلیف نہ دی جائے۔ اس پر ہم قرآن کریم کی اس آیت سے استدلال لاتے ہیں۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ فَإِنِ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۳۹﴾

(۳۹:۸)

(اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور تمام دین اللہ کے لیے ہو جائے اگر وہ باز آجائیں تو حقیقت میں اللہ جو کچھ وہ کرتے ہیں اسے دیکھتا ہے۔)

مشرکین مکہ جہاں تک ان سے ہو سکتا تھا، مسلمانوں کو ہر قسم کی تکلیف اس لیے دیتے تھے کہ انہیں اپنے مذہب سے لوٹا دیں۔ مگر مسلمانوں نے صدر اسلام میں ایسا نہیں کیا اور ان کے بعد اگر کسی نے مذہبی تشدد کیا تو اس نے اسلام کے احکام کی خلاف ورزی کی ہے کیونکہ اس نے مذہبی معاملے میں فتنہ انگیزی اور جبر و تشدد کو حرام قرار دیا ہے بلکہ کسی نئے مذہب میں داخل ہونے کے لیے یہ شرط رکھی ہے کہ اسے برضا و رغبت قبول کیا گیا ہو۔

۲۔ اگر خدا اس مدافعانہ کارروائی کی اجازت نہ دیتا تو یہودیوں عیسائیوں اور مسلمانوں کے وہ عبادت خانے ویران کر دیئے جاتے جن میں پیغمبروں کے پیرو خدا کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ تباہ کاری ان بت پرستوں کے مظالم کا نتیجہ ہوتی جو روز قیامت کے منکر تھے۔ جنگ کے مدافعت کا یہ سبب تمام مذاہب کی طرف سے زبردست مشترکہ حفاظت کا اقدام ہے اور اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ اسلام تمام مذاہب کی آزادی کا احترام کرتا ہے اسی بنا پر مسلمان تمام مذاہب اور ان کے عبادت خانوں کی حفاظت کے

ذمہ دار ہیں چنانچہ انہوں نے اسی تعلیم پر عمل کیا۔

اگر یہ کہا جائے کہ اسلام نے مشرکوں کو ان کے مذاہب پر کیوں اس طرح برقرار رہنے دیا، جس طرح یہودیوں، عیسائیوں اور مجوسیوں کو اپنے مذاہب پر رہنے کی اجازت دی تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عربوں کے شرک اور بت پرستی کی بنیاد عبادت الٰہی اور اس کے بندوں کی بھلائی پر نہ تھی جیسے کہ دوسرے مذاہب تھے گو وہ بھی شرک کی آمیزش سے خالی نہ تھے تاہم مشرکین عرب نہ تو قیامت کے قائل تھے نہ جزا اور سزا کے عقیدہ کو تسلیم کرتے تھے بلکہ وہ یہ بھی نہیں مانتے تھے کہ نیکی کا اچھا بدلہ ملے گا اور برائی کا برا بدلہ ہوگا یا خدا نیک کاموں کا حکم دیتا ہے اور برے کاموں سے روکتا ہے۔ اس سلسلے میں اسلام کے نزدیک اتباع مذہب کا عام اصول یہ ہے۔

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (۲:۶۲)

(جو لوگ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان کا بدلہ ان کے پروردگار کے پاس ہے نہ ان پر خوف طاری ہوگا اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔)

۳۔ جنگ کا تیسرا اسلامی مقصد یہ بھی ہے کہ مسلمان زمین میں اقتدار اور حکومت حاصل کرنے کے بعد نماز قائم کریں جو انسان کا تزکیہ نفس کرتی اور برائیوں سے روکتی ہے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ خدا سے تعلق قائم کرکے دل میں اس کا خوف اور محبت بھی پیدا کرتی ہے نیز وہ زکوٰۃ کا نظام بھی قائم کریں جس کے ذریعے تمام سماجی اور اقتصادی کاموں کی اصلاح ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کا یہ بھی نصب العین ہوگا کہ وہ نیکی کی دعوت دیں جس میں رفاہ عام کے تمام کام شامل ہیں۔ اور ہر ایسی برائی سے روکیں جس سے خود انہیں یا دوسروں کو نقصان پہنچتا ہو۔

تمام جنگجو سلطنتیں ریاکاری کے طور پر نیک نامی حاصل کرنے کے لیے اس طرح کے بعض اعلیٰ مقاصد کا دعویٰ کرتی ہیں لیکن ان کا عمل ان کی تکذیب کرتا ہے بالخصوص برائیوں سے روکنے کے بارے میں ان کا دعویٰ بالکل غلط ہے کیونکہ یہ سلطنتیں اپنے محکوموں کے لیے تمام ایسی برائیوں اور بدکاریوں کے مواقع فراہم کرتی ہیں جن کے ذریعے ان کے اخلاق و آداب اور سماجی رشتے خراب ہو جائیں بلکہ علم، تہذیب اور نیکی کی

راہ میں بھی جہاں تک ان کے امکان میں ہوتا ہے رکاوٹ بنتی ہیں البتہ اپنی زبان اپنی قومی عظمت اور اپنے قومی مذہب کی اشاعت کرتی ہیں تاکہ ان کے ذریعے محکوم قوموں کی ملی اور قومی بنیادیں متزلزل ہو جائیں اور وہ استعماری طاقتوں کی غلامی اور ذلت سے نکلنے کی توقع نہ رکھیں۔ اس قسم کی تعلیم سے ان کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ محکوم قومیں علم، دولت، عزت اور طاقت میں ان کے ہم پلہ ہو جائیں مگر ان کے اس رویہ کے برخلاف ہمارے مسلمانوں نے اپنی فتوحات کے زمانے میں کبھی انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

۴۔ صلح کو جنگ پر ترجیح:

یہ اصول ان دو بنیادی اصولوں پر مبنی ہے جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ جنگ اس وقت ضروری ہو جاتی ہے جب اس کے ذریعے لوگوں کو فائدہ حاصل ہوتا ہو اور ان کی خرابیاں دور ہو سکیں تاہم دراصل امن ہی ایک ایسی چیز ہے جس پر انسانوں کی زندگی کا انحصار ہے اس لیے خدا نے ہمیں حکم دیا ہے کہ اگر دشمن صلح کی طرف مائل ہو اور اس پر رضا مند ہو جائے تو صلح کو ترجیح دی جائے، اس کا ثبوت یہ ارشاد خداوندی ہے۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۱﴾ (۸:۶۱)

(اگر وہ لوگ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ درحقیقت وہ خوب سننے والا اور جاننے والا ہے۔)

۵۔ انسداد جنگ کے لیے مکمل تیاری:

کسی سلطنت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ جنگ سے پہلے قوم کو اپنے زمانے کے جنگی ساز و سامان سے مسلح رکھے اور ان جنگی تیاریوں کے سلسلے میں یہ مقصد پیش نظر رکھے کہ ان کے ذریعے دشمن مرعوب ہو جائے اور وہ یہ سمجھے کہ اس قوم پر اس کے افراد پر یا اس کے مال و متاع یا ملکی مفاد پر دست درازی کرنے کا انجام خطرناک ہوگا۔ اسی صورت میں قوم مطمئن ہو کر امن و امان کے ساتھ اپنے ملک میں زندگی بسر کر سکے گی۔ اور اس کے افراد کے نہ صرف جان و مال اور قومی مفادات محفوظ ہوں گے بلکہ انہیں مذہبی آزادی بھی حاصل ہوگی۔ اس قسم کی تیاریوں کو آج کل کے زمانے میں "مسلح امن یا "پر امن

ہتھیار بندی" کہا جاتا ہے۔ موجود جنگجو سلطنتیں بھی مکروفریب سے اس قسم کا جھوٹا دعویٰ کرتی ہیں مگر ان کے اعمال خود ان کے دعوے کو جھٹلاتے ہیں البتہ اسلام ہی ایک ایسا ممتاز مذہب ہے جس نے اس قسم کی تیاریوں کو مسلمانوں کے لیے ضروری قرار دیا ہے چنانچہ خداوند تعالیٰ نے انہیں مندرجہ ذیل آیت کریمہ میں جنگی تیاریوں کا اس طرح حکم دیا ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (۸ : ۶۰)

(دشمنوں کے خلاف جس قدر تم سے ہو سکے اپنی طاقت مضبوط کرو اور گھوڑے تیار رکھو اس طرح کہ تم اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو مرعوب کر سکو۔)

۶۔ جنگ میں رحم و شفقت:

جب جنگ میں مسلمان غالب ہو جائیں جسے (اثخان) کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور مسلمانوں کو یقین ہو جائے کہ دشمن اب ان پر غالب نہیں آسکتا تو اس موقع پر خدا کا یہ حکم ہے کہ خون ریزی موقوف کر دی جائے اور دشمن کو قید کر لینا ہی کافی سمجھا جائے۔ اس کے بعد یہ اجازت دی جائے کہ قیدیوں کو یا تو احسان کر کے چھوڑ دیا جائے یا فدیہ لے کر آزاد کیا جائے چنانچہ سورہ محمد ﷺ کی یہ آیت کریمہ اس حکم کی وضاحت کرتی ہے۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ [1]

(۳ : ۱۹۵)

---

[1] دشمنوں نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ قرآن کریم یہ حکم دیتا ہے کہ مسلمان جہاں کافروں کو پائیں، مار ڈالیں۔ یہاں تک کہ مصر میں سابق برطانوی ہائی کمشنر لارڈ کرومر نے بھی ایک تقریر میں اس کا ذکر کیا تھا۔ حالانکہ اس آیت کا تعلق ان لڑنے والے دشمنوں سے ہے جو میدان جنگ میں لڑ رہے ہوں۔ اسلامی شریعت میں کافروں کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) جنگی دشمن (حربی) ان کا حکم اس اصول میں اور اس سے پہلے کے قواعد میں بیان کیا جا چکا ہے۔

(۲) معاہد، ان کے احکام بعد میں بتائے جائیں گے۔

(۳) مستامن اور ذمی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں کی حکومت کو تسلیم کر کے ان کی رعایا بن جاتے ہیں۔ یہ بات پہلے واضح کی جا چکی ہے کہ اسلام نے ان لوگوں کو تمام عدالتی شہری اور سیاسی حقوق میں مسلمانوں کے برابر قرار دیا ہے اور مسلمانوں کے لئے ان کے جان و مال کی حفاظت ضروری ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی ان کے مذہب اور جان و مال پر دست درازی کرے تو مسلمانوں کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو جنگ کر کے ان کی حفاظت کریں۔

جب تم کافروں سے مقابلہ کرو تو گردنیں مارو یہاں تک کہ جب خون ریزی کر چکو تو انہیں قید کر لو۔ اس کے بعد احسان کر کے انہیں چھوڑ دو یا فدیہ وصول کرو۔ یہاں تک کہ لڑائی ختم ہو جائے۔ اگر خدا چاہے تو وہ ان سے بدلہ لے مگر وہ تمھیں ایک دوسرے کے ذریعے آزمانا چاہتا ہے جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں خدا ان کے اعمال ضائع نہیں کرے گا۔

اس آیت کی تشریح و تفسیر ہم نے مندرجہ ذیل آیت کی تفسیر میں بیان کر دی ہے۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ (۸:۶۷)

(کسی پیغمبر کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ قیدی اس کے ہاں آئیں جب تک کہ وہ زمین میں خون ریزی نہ کرے۔)

۷۔ معاہدات کی پابندی:

جس طرح اسلام میں کسی مادی یا روحانی امانت میں خیانت جائز نہیں ہے اس طرح جنگ اور صلح میں معاہدوں کی پابندی ضروری ہے اور ان میں کسی قسم کی پوشیدہ یا علانیہ بدعہدی کرنا حرام ہے۔ اس بارے میں صاف اور کھلی آیات موجود ہیں جنھوں نے معاہدوں کو توڑنے اور طاقت کے موقع پر کسی حیلہ اور بہانے سے انہیں نظر انداز کر دینے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا (۱۶:۹۱)

(جب تم معاہدہ کرو تو اللہ کے عہد کو پورا کرو اور قسموں کو پختہ کر لینے کے بعد انہیں نہ توڑو۔)

اس آیت میں معاہدہ کی پابندی کا حکم دیا گیا ہے اور بدعہدی سے منع کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مندرجہ ذیل مثالیں دے کر مزید تاکید فرمائی ہے۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِىْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا (۱۶:۹۲)

(تم اس عورت کی طرح نہ بن جاؤ جو سوت کو مضبوط بننے کے بعد اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی ہے۔)

اسی آیت کی ہم نے اس باب کے شروع میں اچھی طرح وضاحت کر دی ہے۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کا اہم وصف یہ بیان کیا گیا ہے۔

وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا۔

(وہ اپنا معاہدہ پورا کرتے ہیں جو معاہدہ کرتے ہیں۔)

نیز قرآن کریم میں ان یہودیوں کی مذمت کی ہے جنھوں نے رسول اکرم ﷺ سے

بدعہدی کی تھی۔ اور انہیں جانوروں سے بھی بدتر قرار دیا ہے۔

اس کے بعد جب مسلمانوں کو ان مشرکوں سے معاہدے توڑنے کا حکم دیا گیا جنھوں نے رسول اکرم ﷺ اور مسلمانوں سے بدعہدی کی تھی تو ایسے موقع پر معاہدہ کے پابند مشرکین کو مستثنیٰ قرار دیدیا گیا تھا حالانکہ وہ سب ایک ہی مقام کے تھے۔ چنانچہ ان کے بارے میں ارشاد ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ۝ (۹ : ۴)

(سوائے ان مشرکوں کے جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا اور انہوں نے نہ تم سے کوئی بدعہدی کی اور نہ تمہارے مقابلہ میں کسی کی مدد کی تو ان کا عہد ان کی مدت تک پورا کرو۔ بے شک خدا پرہیزکاروں کو پسند کرتا ہے۔)

معاہدہ کی پابندی پر اس قدر زور دیا گیا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے ہمیں یہ اجازت نہیں دی ہے کہ معاہدے والے کفار کے برخلاف ہم اپنے ان مسلمان بھائیوں کی مدد کریں جو ہماری حکومت کے فرماں بردار نہیں ہیں چنانچہ غیر مہاجروں کے بارے میں یہ ارشاد ہے۔

وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ (۸ : ۷۲)

(اگر وہ مذہب کے معاملے میں تم سے مدد طلب کریں تو ان کی مدد تم پر لازم ہے سوائے ان لوگوں کے جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہو چکا ہے) (ملاحظہ ہو تفسیر المنار، جلد ۱۰ صفحہ ۱۰۸)

تو کیا اس سے بڑھکر کسی مذہبی حکومت میں معاہدہ کی پابندی کی کوئی مثال مل سکتی ہے؟

۸۔ جزیہ کی تشریح اور شرائط :

ہم نے اہل کتاب سے جنگ کے متعلق آیت جزیہ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (یہاں تک کہ مطیع ہو کر جزیہ پر قادر ہو کر اسے دینے لگیں) کی تفسیر میں، اپنی تفسیر میں یہ تحریر کیا ہے کہ یہ اہل کتاب سے جنگ کرنے کا انتہائی مقصد ہے۔ چنانچہ ہمارے غالب ہو جانے کے بعد لڑائی بھی ختم ہو جائے گی۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب جنگ کرنا تمہارے لیے ضروری ہو جائے تو تم اس وقت اہل کتاب سے جنگ کر دلیکن

جب کہ وہ تم پر یا تمہارے ملک پر دست درازی کریں یا تمہیں اپنے مذہب سے برگشتہ کرنے کے لیے تمھیں تکلیفیں پہنچائیں یا تمہارے امن وامان کو خطرے میں ڈالیں اور تبلیغ اسلام کی آزادی میں حائل ہوں جیسا کہ آپ ﷺ کے زمانے میں اہل روم نے کیا تھا اور اس کی وجہ سے غزوہ تبوک کا واقعہ پیش آیا، ان حالات میں جنگ کی اجازت ہے۔ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک تم ان کی دست اندازی سے بالکل اس طرح محفوظ نہ ہو جاؤ کہ وہ تمھیں دو شرطوں کے ساتھ جزیہ ادا کرنے لگیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ جزیہ اس وقت ادا کریں جب کہ وہ اس کو دور کرنے کی قدرت رکھتے ہوں (جن لوگوں کی مالی حیثیت جزیہ ادا کرنے کی نہیں ہے ان پر کوئی زیادتی کی صورت نہیں ہے۔) دوسری شرط مسلمانوں کے فائدہ کے لیے ہے وہ یہ ہے کہ صغار کے ساتھ جزیہ ادا کریں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ ہتھیار ڈال دیں اور وہ تمہاری برتری اور حکمرانی کے آگے جھک جائیں تو اس حالت میں ان کا جزیہ ادا کرنا مفید ہوگا کیونکہ اس وقت اسلامی ہدایت کا راستہ ان کے لیے آسان ہو جائے گا۔ وہ تمہارے انصاف ہدایت اور خوبیوں کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالیں گے کہ تم ان کے پیغمبروں کی راہ ہدایت پر ان سے زیادہ قریب ہو۔ اس کے بعد اگر وہ اسلام لے آئیں تو ہدایت انصاف اور اتحاد کا دائرہ وسیع ہو جائے گا۔ اور اگر وہ مسلمان نہ ہوئے تو ایسی صورت میں بھی انصاف و مساوات کی وجہ سے تمہارے اور ان کے درمیان رشتہ اتحاد مستحکم ہو جائے گا اور دارالاسلام کے انصاف و مساوات کے نظام میں حائل نہ ہوں گے۔

اگر جنگ ضروری اسباب کے بغیر شروع ہو جائے تو اس صورت میں جزیہ ادا کرنے پر جنگ کا ختم ہو جانا بدرجہ اولیٰ ضروری ہے کیونکہ جزیہ ادا کرنے کے بعد مسلمانوں پر ان کی حفاظت اور حمایت واجب ہو جاتی ہے اور جزیہ کی شرائط کے مطابق ان کی مذہبی آزادی کی حفاظت کرنی بھی ضروری ہوگی، بلکہ مسلمانوں کی طرح ان کے ساتھ عدل و مساوات کا سلوک کیا جائے گا۔ اس وقت نہ ان کی طاقت سے زیادہ ان پر بوجھ ڈالا جائے گا اور نہ ان پر کسی قسم کا ظلم کیا جائے گا۔ انھیں ذمی اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ انہیں یہ تمام حقوق اللہ اور اس کے رسول کی ذمہ داری پر حاصل ہوئے ہیں مگر وہ لوگ جن سے اس بنیاد پر صلح اور معاہدہ ہوتا ہے کہ ہر ایک ایک دوسرے کی خود مختاری تسلیم کرے تو یہ لوگ معاہد کہلاتے ہیں (ملاحظہ ہو قواعد ۶۔۹ صفحہ ۱۴۰۔۱۴۱ جلد ۱۰ تفسیر المنار)

جزیہ کی اصل حکمت:

اسلام میں جزیہ کبھی اس طرح کا ٹیکس نہیں سمجھا گیا جو فاتح مفتوحوں پر انہیں تکلیف دینے کے لیے تاوان کے طور پر لگایا کرتے تھے بلکہ یہ اس حق خدمت کی قلیل رقم ہے جو اسلامی حکومت ان کے دفاعی اخراجات کے لیے وصول کرتی ہے۔ اس رقم سے ان کے دشمنوں سے ان کی حفاظت کے لیے اسلامی فوج کا یہ تقرر ہوتا ہے جیسا کہ رسول اکرم ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہ کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ شریعت کے مقاصد سے اوروں کی نسبت زیادہ واقف تھے اور اس کے احکام کو نافذ کرنے میں سب سے زیادہ انصاف پسند تھے۔ چنانچہ ان کی ایسی مثالیں بہت زیادہ ہیں ان میں سے ایک مثال ہم نے مذکورہ بالا آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں اس طرح بیان کی ہے۔

"جب حضرت خالد بن ولید فرات کے علاقہ میں فاتحانہ داخل ہوئے تو انہوں نے صلوبا بن نسطونا کو یہ معاہدہ لکھ کر دیا۔"

"یہ تحریر خالد بن ولید کی طرف سے صلوبا بن نسطونا اور اس کی قوم کے نام ہے.... میں نے تم سے جزیہ لینے اور تمہاری حفاظت کرنے کا عہد کیا ہے۔ تمہیں ہماری ذمہ داری اور حمایت حاصل ہوگی جب تک ہم تمہاری حفاظت کریں گے اس وقت تک تم سے جزیہ لیں گے جب تمہاری حفاظت نہیں کر سکیں گے تو جزیہ بھی نہیں لیا جائے گا۔ ماہ صفر ۱۲ھ میں یہ تحریر لکھی گئی۔"

یہ تحریر اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ جزیہ حمایت و حفاظت کا وہ معاوضہ ہے اور اس وقت تک لیا جا سکتا ہے جب تک ان کی حفاظت کی جائے ورنہ نہیں۔

اس عمل کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے جسے بلاذری نے فتوح البلدان میں اور ازدی نے فتوح الشام میں لکھا ہے۔ صحابہ کرام نے حضرت ابو عبیدہ کے حکم سے وہ تمام جزیہ واپس کر دیا تھا جو وہ اہل حمص سے وصول کر چکے تھے جبکہ جنگ یرموک کی وجہ سے وہ یہ تمام علاقہ خالی کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اس وقت انہوں نے یہ صاف کہہ دیا تھا کہ چونکہ وہ ان کی حفاظت نہیں کر سکتے، اس لیے جزیہ کی رقم واپس کرنی ضروری ہے۔ اس پر حمص کے یہودیوں اور عیسائیوں کو بہت تعجب ہوا کہ فاتح ہونے کے باوجود انہوں نے مال واپس کر دیا ایسے رویہ سے متاثر ہو کر وہ رومیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی فتوحات

کی دعائیں کرنے لگے۔

اس تفصیل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے ظلم وتعدی کی جنگ کو حرام قرار دیا ہے اور مدافعانہ جنگ کا مقصد صرف یہ رکھا ہے کہ دنیا سے فتنہ وفساد کو دور کیا جائے اور عوام کے مفادات اور مصالح کو برقرار رکھا جائے۔ لہٰذا جنگ ضرورت کے موقع پر بدرجہ مجبوری اس خاص ضرورت تک محدود رہنی چاہیے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ صحیح امن وامان عالم انسانیت کو اسلامی ہدایت کی بدولت اور اس کے اصول جنگ کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

جو کوئی اسلام کے ان اصولوں پر غور کرے اسے یہ معلوم ہو جائے گا کہ اسلام سے پہلے نہ کوئی ایسا مذہب اور نہ کوئی ایسا بین الاقوامی قانون یا فلسفیانہ اور اخلاقی نظریہ موجود تھا جو اسلامی اصولوں کا مقابلہ کرتا ہو اور نہ کوئی قوم ایسے قوانین اور ضابطوں پر گامزن تھی۔ کیا صرف یہی بات اس انسان کے لیے جو علم وحکمت والے پروردگار پر ایمان رکھتا ہو اس بات کا کھلا اور واضح ثبوت نہیں ہے کہ یہ سب کچھ محمد ﷺ عربی، نبی امّی نے خدائے بزرگ وبرتر کی وحی کے ذریعے حاصل کیا ہو۔ کیونکہ آپ ﷺ کی عقل وذہانت ان سماجی پیچیدگیوں کو وحی الٰہی کے بغیر نہیں سلجھا سکتی تھی۔ لہٰذا اس اعلیٰ ہدایت کا جب مذکورہ بالا معلومات اور آئندہ بیان ہونے والی روحانی، اخلاقی، سماجی اور غیب کی خبروں کے ساتھ اضافہ کیا جائے تو آپ ﷺ کی نبوت کے دلائل بالکل واضح ہو جاتے ہیں۔

مقصد نہم:
اسلام میں حقوق نسواں

اسلام سے پہلے تمام اقوام، مذاہب، قوانین یہاں تک کہ اہل کتاب کی شریعت میں بھی خواتین مظلوم، حقیر اور کنیزیں سمجھی جاتی تھیں۔ تاآنکہ اسلام آیا اور خدا نے اپنے خاتم النبیین محمد ﷺ کو پیغمبر بنا کر اپنے دین کی تکمیل کی۔ اس وقت اس نے اپنی مقدس

کتاب اور سنت نبوی کے ذریعے جو کتاب اللہ کی عملی اور قولی تشریح ہے خواتین کو وہ تمام حقوق عطا فرمائے جو مردوں کو حاصل تھے۔ سوائے ان باتوں کے جو خواتین کے مخصوص مزاج اور ان کے مخصوص نسوانی فرائض واحکام سے متعلق ہیں اور کسی چیز میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اسلام نے خواتین کے ساتھ عزت واحترام اور رحم وشفقت کا سلوک کیا ہے یہاں تک کہ رسول اکرم ﷺ فرمایا کرتے تھے۔

"خواتین کی وہی عزت کرتا ہے جو شریف النفس ہے اور ان کی توہین وہی کرتا ہے جو کمینہ ہے (ابن عساکر نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے واسطے سے یہ حدیث روایت کی ہے۔)

دانشمند صحابی یہ محسوس کرتے تھے کہ اسلام نے عربوں کے مظالم، بداخلاقیوں اور دوسری خرابیوں کی زبردست اصلاح کی ہے چنانچہ اس اصلاحی پہلو کو وہ بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے اور اسے محمد ﷺ کی نبوت کی ایک کھلی نشانی قرار دیتے تھے کیونکہ آپ ﷺ نبوت سے پہلے علم وفضل اور بلاغت میں کوئی ممتاز درجہ نہیں رکھتے تھے۔ البتہ آپ ﷺ پاکیزہ فطرت اور اعلیٰ اخلاق کے مالک ضرور تھے۔ اس وجہ سے اسلام کے جلیل القدر، مصلح اعظم اور سنت نبوی کو جاری کرنے والے اور اسلامی سیاست کو عملی شکل دینے والے حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن الخطاب فرمایا کرتے تھے:

"اسلامی سلسلہ ایک ایک کڑے کر کے ٹوٹ جائے گا جب کہ عہد اسلام میں وہ لوگ پیدا ہوں جو دور جاہلیت سے ناواقف ہوں۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اگر تاریخ اقوام سے واقف ہوتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ اسلام نے نہ صرف عربوں کی بلکہ تمام قوموں کی اصلاح فرمائی ہے خواہ وہ قومیں بت پرست ہوں یا اہل کتاب، وحشی ہوں یا متمدن ہر حالت میں ان قوموں کی محض کسی ایک چیز کی اصلاح نہیں ہوئی ہے بلکہ ان کے ہر معاملہ کو درست کیا گیا ہے۔ یہاں میں صرف اصلاح نسواں کے بعض اہم اصولوں کی طرف اشارہ کروں گا جنہیں اپنی کتاب بعنوان "نداء الجنس اللطیف" میں مفصل بیان کر چکا ہوں۔ اس کتاب کے مقدمہ میں بعثت محمدی ﷺ سے پہلے تمام اقوام میں خواتین کا حال اس طرح لکھا ہے۔

"خواتین کی مال واسباب اور چوپایوں کی طرح خرید وفروخت ہوتی تھیں۔ ان کی

مرضی کے خلاف اس کی شادی کر دی جاتی تھی یا انہیں بدکاری پر مجبور کیا جاتا تھا۔ مرد ان کے مال کے وارث بن جاتے تھے مگر وہ کسی کے مال کی وارث نہیں سمجھی جاتی تھیں۔ دوسرے لوگ ان کے مالک بن جاتے تھے مگر خود انہیں کسی چیز کا حق ملکیت حاصل نہ تھا۔ اور جو لوگ ان کے مالک تھے ان میں سے اکثر عورت کو مرد کی اجازت کے بغیر کسی چیز میں تصرف کا حق نہیں دیتے تھے۔ مگر شوہر کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اس کے مال میں اس کی اجازت کے بغیر جس طرح چاہے تصرف کرے۔ طرفہ تماشہ یہ تھا کہ بعض ملکوں میں یہ بحث ہوتی رہی کہ آیا مرد کی طرح عورت بھی جانداد ہے اور لازوال روح رکھتی ہے یا نہیں؟ نیز اسے مذہبی تعلیم دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اور آیا اس کی عبادت صحیح بھی ہوگی یا نہیں؟ اور آخرت میں وہ جنت میں داخل ہونے کی مستحق ہے یا نہیں؟ چنانچہ روم کی ایک کانگرس نے یہ فتویٰ دیا کہ عورت نجس حیوان ہے، اس کے اندر روح نہیں ہے اور نہ وہ لافانی ہے مگر عبادت اور خدمت کرنا اس کے لیے واجب ہے نیز اونٹ اور پاگل کتے کی طرح اس کا منہ باندھ دینا چاہئے تا کہ وہ نہ ہنس سکے نہ بول سکے کیونکہ وہ شیطانی جال ہے۔

بعض شریعتیں یہ اجازت دیتی تھیں کہ باپ اپنی بیٹی کو فروخت کر سکتا ہے، اسی طرح بعض عربوں کے نزدیک باپ کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو قتل کر دے بلکہ زندہ دفن کر دے۔ بعض کے نزدیک اگر مرد عورت کو قتل کر دے تو نہ اس سے قصاص لیا جائے گا نہ خون بہا (دیت) وصول کیا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد میں نے خواتین کے مالی حقوق پر گفتگو کرتے ہوئے یہ لکھا تھا "اسلام نے آکر عرب و عجم کی ان زیادتیوں کا خاتمہ کر دیا جو انہوں نے خواتین کے حق میں روا رکھی تھیں۔ وہ انہیں حق ملکیت سے محروم رکھتے تھے، خواتین خود اپنے مال کو اپنی مرضی کے مطابق نہیں استعمال کر سکتی تھیں لیکن شوہر اپنی بیویوں کی جانداد میں من مانی کارروائی کرتے تھے مگر اسلام نے خواتین کو ہر قسم کی ملکیت اور تصرف کا حق دیا۔ چنانچہ مردوں کی طرح انہیں وصیت کرنے اور وارث بننے کا حق بھی دیا بلکہ ان پر یہ اضافہ بھی کیا کہ مردوں کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ وہ مہر کی شکل میں ان کا حق زوجیت ادا کریں اور خواہ بیوی مالدار ہی کیوں نہ ہو مگر اس کا اور اسکی اولاد کا نان نفقہ شوہر کے ذمہ ہوگا۔ انہیں مردوں کی طرح خرید و فروخت، اجارہ، ہبہ اور صدقہ کرنے کے حقوق

حاصل ہیں نیز وہ جائز طریقہ سے اپنے مالی حقوق کی حفاظت کر سکتی ہیں جس طرح وہ اپنی جان کی محافظ ہیں حالانکہ فرانس کی خواتین آج تک مالی اور قانونی معاملات میں اپنے شوہر کی پابند ہیں۔

اپنی مذکورہ بالا کتاب میں سے ذیل کے مسائل کو اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہوں۔

۱۔ بہت سے مغربی افراد اور دوسرے لوگ خواتین کو انسان نہیں بلکہ بے عقل جانور یا شیطان سمجھا کرتے تھے اور بعض اس کی انسانیت میں شک کرتے تھے مگر حضرت محمد ﷺ نے آکر خدا کے اس فرمان کا اعلان کیا۔

۱۔ يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى۔(۴۹ : ۱۳)

(اے لوگو! ہم نے تمھیں مرد و عورت سے پیدا کیا ہے۔)

۲۔ يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً (۴ : ۱)

(اے لوگو! تم اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمھیں ایک ہی جان سے پیدا کیا اور اس میں سے اس کا جوڑا بھی پیدا کیا اور دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں۔)

۲۔ مغرب اور دوسرے ممالک میں بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ عورت کا دین وایمان بھی صحیح نہیں ہے اس لیے انہوں نے باضابطہ طور پر انہیں مقدس مذہبی کتابیں پڑھنے سے منع کر رکھا تھا مگر اسلام نے آکر تمام مذہبی معاملات میں مردوں اور عورتوں کو مومنین و مومنات، مسلمین و مسلمات کہہ کر یکساں طور پر بلا تفریق خطاب کیا۔ اس قسم کے خطاب کی بے شمار آیات قرآنی موجود ہیں۔

خاتم النبیین محمد ﷺ پر جو سب سے پہلے ایمان لائی وہ ایک خاتون ہی تھی یہ آپ ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ بنت خویلد تھیں۔ خود قرآن کریم میں خداوند تعالیٰ نے خواتین سے رسول اکرم ﷺ کی بیعت کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد آپ نے مردوں سے بیعت لی۔ جب قرآن کریم باضابطہ طور پر ایک مجلد کے اندر جمع کیا گیا تو ایک خاتون ہی کے پاس رکھا گیا جو حضرت حفصہ ام المومنین تھیں۔ ان کے پاس یہ سرکاری نسخہ قرآن کریم خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے سے لے کر خلیفہ سوم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے تک رکھا رہا۔ یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ

عنہ نے ان سے یہ نسخہ لے لیا اور اسی پر بھروسہ کر کے اس کی نقلیں مختلف شہروں میں بھیجی گئیں۔

۳۔ بعض انسانوں کا یہ خیال ہے کہ خواتین میں لافانی روح نہیں ہوتی، اس وجہ سے وہ آخرت میں مومنوں کے ساتھ بہشت میں نہیں رہیں گی۔ یہ خیال اس بنیاد پر مبنی ہے کہ عورتوں میں دینداری نہیں ہے مگر قرآن نے مندرجہ ذیل آیات نازل فرما کر یہ فیصلہ صادر کیا:

(۱) لَیۡسَ بِاَمَانِیِّکُمۡ وَلَاۤ اَمَانِیِّ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ ؕ مَنۡ یَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا یُّجۡزَ بِہٖ ۙ وَلَا یَجِدۡ لَہٗ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیۡرًا ﴿۱۲۳﴾ وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی وَہُوَ مُؤۡمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ یَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّۃَ وَلَا یُظۡلَمُوۡنَ نَقِیۡرًا ﴿۱۲۴﴾ (۴: ۱۲۳۔۱۲۴)

(نہ تمہاری آرزوؤں سے کچھ ہوگا اور نہ اہل کتاب کی آرزوؤں سے جو شخص برائی کرے گا اسے سزا ملے گی اور وہ خدا کی مقابلہ میں کسی کو حامی اور مددگار نہیں پائے گا اور جو کوئی نیک کام کرے گا مرد ہو یا عورت اگر وہ مومن ہے تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔)

(۲) فَاسۡتَجَابَ لَہُمۡ رَبُّہُمۡ اَنِّیۡ لَاۤ اُضِیۡعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنۡکُمۡ مِّنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی ۚ بَعۡضُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ۚ (۳: ۱۹۵)

(ان کے پروردگار نے جواب میں ان سے فرمایا میں تم سے کسی عمل کرنے والے مرد یا عورت کا عمل ضائع ہونے نہیں دوں گا تم آپس میں ایک ہی ہوا۔)

مذکورہ بالا آیات میں صاف وعدہ ہے کہ عورتیں جنت میں داخل ہوں گی جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔

۴۔ بعض انسان عورتوں کو حقیر سمجھتے تھے اور انہیں مردوں کے ساتھ مذہبی عبادت گاہوں اور ادبی محفلوں میں شریک ہونے اور دوسرے سیاسی سماجی اور اصلاحی تحریکات میں حصہ لینے کے قابل نہیں سمجھتے تھے مگر قرآن کریم نے صاف طور پر اس مسئلہ کی اس طرح وضاحت کر دی۔

وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتُ بَعۡضُہُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ ۘ یَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَیَنۡہَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَیُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ وَیُطِیۡعُوۡنَ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ ؕ اُولٰٓئِکَ سَیَرۡحَمُہُمُ اللّٰہُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ﴿۷۱﴾ (۹: ۷۱)

(مومن مرد اور مومن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کی مددگار ہیں یہ سب مل کر نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے منع کرتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں زکوٰۃ ادا کرتے اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ انہی لوگوں پر عنقریب اللہ رحم کرے گا بے شک اللہ عزت اور حکمت والا ہے۔)

اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مومن خواتین مومن مردوں سے ہر کام میں تعاون کرتی ہیں، اس میں جنگی مدد بھی شامل ہے مگر چونکہ اسلامی شریعت نے عورتوں پر جہاد فرض نہیں کیا ہے اس لیے اسلامی جنگوں میں ان کا تعاون اس طریقے سے تھا کہ وہ مجاہدوں کے لیے کھانا تیار کرتی تھیں، پانی لاتی تھیں اور زخمیوں کی تیمارداری کرتی تھیں۔ (زمانہ امن وامان میں) وہ مردوں کے ساتھ نماز پڑھتی تھیں اور حج کرتی تھیں۔ اس طرح تبلیغی سلسلے میں وہ لوگوں کو نیکی کی طرف بلاتی تھیں اور برائی سے روکتی تھیں۔ یہاں تک کہ بعض خواتین امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن الخطاب پر کھلا کھلا اعتراض کرتی تھیں اور اگر وہ غلطی پر ہوتے تھے تو ان کی رائے کو تسلیم کر لیتے تھے۔ حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہیبت سے مرد بھی لرزہ براندام ہوتے تھے۔

اس آیت کے بعد خدا نے یہ سب سے بڑی آیت نازل فرمائی جس میں مرد اور خواتین دونوں شامل ہیں۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (۹: ۷۲)

(خدا نے مومن مردوں اور عورتوں سے ایسی جنتوں کا وعدہ کیا ہے جن میں نہریں بہتی ہوں گی جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ دائمی جنتوں میں پاکیزہ مکانات ہوں گے اور اللہ کی رضامندی سب سے بڑی چیز ہے اور یہی سب کی بڑی کامیابی ہے۔)

۵۔ کچھ لوگ خواتین کو میراث وغیرہ کے حق سے محروم رکھتے تھے اور کچھ لوگ انہیں اپنی مملوکہ چیزوں کو استعمال کرنے نہیں دیتے تھے۔ اسلام نے آکر اس ظلم کا خاتمہ کیا اور ان کے لیے شریعت کے دائرہ میں حق ملکیت اور حق تصرف ثابت کیا جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۝ (۴: ۷)

(والدین اور رشتہ دار جو کچھ چھوڑیں اس میں مردوں کا حصہ بھی ہے اور عورتوں کا بھی خواہ وہ ترکہ زیادہ ہو یا کم۔ یہ مقرر کیا ہوا حصہ ہے۔)

ہمیں یہ معلوم ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے ابھی حال ہی میں خواتین کو ملکیت اور تصرف کا حق دیا ہے لیکن فرانسیسی خاتون آج بھی مالی تصرفات اور عدالتی معاہدوں میں اپنے شوہر کی مرضی کی پابند ہے۔ برخلاف ان کے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے مسلمان خواتین کو یہ حقوق حاصل ہو چکے تھے۔

۶۔ بدوی قبائل اور متمدن اقوام میں شادی کرنا دراصل ایک طرح عورتوں کو غلام بنانے کے مترادف سمجھا جاتا تھا مگر اسلام نے اسے ایک مذہبی اور تمدنی معاہدہ قرار دیا تاکہ جنسی بے چینی دور ہو کر باہمی محبت کے ذریعے نفس کو سکون حاصل ہو، اور محبت کا دائرہ وسیع ہو کر دونوں خاندانوں میں خوشگوار تعلقات قائم ہوں نیز رحم و کرم کا انسانی جذبہ مکمل ہو کر والدین کے ذریعے اولاد میں منتقل ہو۔ اسی مقصد کی وضاحت ذیل کی آیت کریمہ میں ہے۔

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ۝ (۳۰:۲۱)

(خدا کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہارے ہی قسم کے جوڑے بنائے تاکہ ان سے سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحم کے تعلقات قائم کئے۔ بے شک اس میں غور کرنے والوں کے لئے بہت نشانیاں ہیں۔)

۷۔ قرآن کریم نے نیکی اور بھلائی کی بنیاد پر تمام فرائض اور حقوق کو مردوں کو اور خواتین میں مساویانہ طور پر تقسیم کر دیا ہے البتہ گھریلو زندگی کی قیادت مرد کے سپرد کی ہے۔ کیونکہ وہ عورت سے زیادہ کمانے اور حفاظت کرنے کی قابلیت رکھتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے۔

وَلَھُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْھِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَیْھِنَّ دَرَجَةٌ (۲:۲۲۸)

(نیکی کی بنیاد پر خواتین کے ویسے ہی حقوق ہیں جیسی ان کی ذمہ داریاں ہیں۔ البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ (فضیلت) ہے۔)

اس درجہ کی اس طرح تشریح کی گئی ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (۴:۳۴)

(مرد عورتوں کے نگہبان ہیں کیونکہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس لئے کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔)

اسی قیادت کے فرائض کی بناء پر شوہر کے ذمہ بیوی اور اولاد کے اخراجات رکھے گئے ہیں، بیوی خواہ اس سے زیادہ مالدار کیوں نہ ہو۔ اس کے ذمہ نان و نفقہ کا ذرا سا بھی بار نہیں ہے بلکہ اس کے لئے مہر کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ لہٰذا معاہدہ زوجیت کے بموجب ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اپنی بیوی کا مہر جلد ادا کر دے۔ یہاں تک کہ اگر عقد کے وقت مہر کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے تو اس کے باوجود شوہر کو بیوی کی سماجی حیثیت کے مطابق مہر مثل ادا کرنا ہوگا۔ باہمی رضامندی سے وہ مہر کی ادائیگی کو موخر بھی کر سکتے ہیں۔ برخلاف اس کے دوسری غیر مسلم قوموں کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ خواتین کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ خود اپنے شوہروں کو مہر ادا کریں۔

اسلام سے پہلے عورت کے سرپرست اسے ایسے مرد سے شادی کرنے پر مجبور کرتے تھے جس کو وہ ناپسند کرتی تھیں یا اگر شوہر طلاق دے دے تو اسے دوسری شادی کرنے نہیں دیتے تھے۔

اسلام نے ان سب باتوں کو حرام قرار دے دیا۔ چنانچہ اس بارے میں قرآن و حدیث کے احکام سب کو معلوم ہیں۔

۸۔ عرب، بنو اسرائیل اور دوسری قوموں کے مرد، جتنی عورتوں سے چاہتے تھے، نکاح کر لیتے تھے وہ کسی تعداد کے پابند نہ تھے اور نہ اپنی بیویوں کے ساتھ انصاف کرتے تھے مگر اسلام نے زیادہ سے زیادہ چار بیویوں کی قید لگائی اور یہ بھی کہا کہ جسے یہ اندیشہ ہو کہ وہ دو عورتوں کے ساتھ بھی انصاف نہیں کر سکے گا اسے صرف ایک ہی بیوی پر اکتفا کرنا چاہئے۔ اسلام نے ایک سے زیادہ شادی کی صرف اس شخص کو اجازت دے دی، جسے واقعی اس کی ضرورت ہو اور ان کے مصارف برداشت کر سکتا ہو۔ تعداد ازواج بعض حالات میں سماج کی اہم ضرورت بن جاتی ہے جیسے پہلی بیوی بانجھ ہو یا اتنی بوڑھی ہو گئی ہو کہ اولاد نہ پیدا کر سکے یا ایسی بیماری میں مبتلا ہو کہ

کام کی نہ رہی ہو بلکہ بعض اوقات تعداد ازواج صرف خواتین کے مفاد کے لئے بھی ضروری ہوتا ہے جب کہ ان کی تعداد کسی قوم یا قبیلہ میں بہت زیادہ ہو جائے جیسا کہ جنگوں کے بعد ایسی صورت حال پیدا ہو جائے یا کسی آبادی کے بہت سے مرد دوسرے ممالک میں روزی کمانے کے لئے ہجرت کر جائیں۔

یہ حقیقت قابل غور ہے کہ زنا کو حرام قرار دے کر اس پر سزا دینے والی قوم کیونکر خواتین یا انسانیت کی بھلائی کے لئے یہ تصور کر سکتی ہے کہ مردوں سے زائد خواتین ازدواجی زندگی، اس کی پرہیزگاری، شوہر کی کفالت اور مامتا کی برکات سے محروم رہ جائیں۔ کیا سماج کا عمومی اور خصوصی فائدہ اسی میں ہے کہ عورتوں کو بدکاری کی اجازت دی جائے اور وہ ان جسمانی اور سماجی آلام و مصائب میں مبتلا ہو جائیں جن مصائب میں ہم آج کل مغربی ممالک کی خواتین کو اور ان کے محکوم اور مقلد ممالک کی خواتین کو مبتلا دیکھ رہے ہیں۔

ہم نے سورۃ النساء کی آیت "تعدد ازدواج" میں تفصیلات بیان کر دی ہیں۔ اس کے بعد اپنی کتاب "اسلام میں حقوق نسواں" میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ اس کے بعد ہر عقلمند اور انصاف پسند انسان اس بات کا قائل ہو جائے گا کہ تعداد ازدواج کا مسئلہ حق وانصاف اور انسانیت کی فلاح بالخصوص خواتین کی بھلائی پر مبنی ہے۔ اسلام نے تعداد ازدواج کی سخت شرائط کے مطابق صرف اجازت دی ہے، اسے ضروری قرار نہیں دیا ہے۔ ایسی صورت میں بھی ان خواتین کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ایک شادی شدہ مرد کی زوجیت میں آنا قبول کریں یا نہ قبول کریں بلکہ شریعت عورت کو اجازت دیتی ہے کہ وہ نکاح کے وقت یہ شرط مقرر کرائے کہ اگر وہ چاہے تو اپنے آپ کو طلاق دے سکتی ہے جیسا کہ بعض فقہاء نے یہ بیان کیا ہے کہ ہر وہ شرط جو کتاب وسنت کے نص قطعی کے خلاف نہ ہو جائز ہے بالخصوص زوجیت کے شرائط کی پابندی تو بہت زیادہ ضروری ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ نکاح کی شرطیں پوری کرنا سب سے زیادہ ضروری ہیں۔ امام بخاری اور دیگر محدثین نے اس مضمون کی حدیثیں کئی مقامات پر نقل کی ہے۔

۹۔ طلاق بھی کبھی ازدواجی زندگی کے لئے ضروری ہو جاتی ہے جب میاں بیوی دونوں کے لئے حقوق زوجیت ادا کرنا ناممکن ہو جائے اور وہ خدائی قوانین کے مطابق اجتماعی

زندگی بسر نہ کر سکیں۔ طلاق اہل کتاب اور مشرکین دونوں قوموں میں جائز تھی مگر صرف خواتین ہی اس کے مضر اثرات کا شکار ہوتی تھیں اور انہیں اس سلسلے میں ناقابل برداشت تکلیفیں اور مظالم برداشت کرنے پڑتے تھے مگر اس معاملہ میں بھی اسلام نے ایسی اصلاحی پالیسی اختیار کی، جو نہ کسی مقامی شریعت میں موجود تھی اور نہ کسی ملکی قانون میں تھی بلکہ اہل مغرب تو طلاق کو حرام سمجھتے تھے اور اس کی وجہ سے اسلام پر اعتراضات کرتے تھے لیکن بعد میں وہ مجبور ہوگئے کہ اسے جائز قرار دیں اور اب وہ اس معاملہ میں اس قدر حد سے آگے بڑھ گئے ہیں کہ ان کی گھریلو زندگی کے درہم برہم اور کنبوں اور خاندان کے رشتے ٹوٹ جانے کا اندیشہ پیدا ہوگیا ہے۔ اہل مغرب کے ہاں طلاق کی جو وجوہات اخباروں میں شائع ہوتی ہیں وہ نہایت مضحکہ خیز ہیں مثلاً یہ کہ عورت اپنے سر پر پورے بال رکھتی ہے۔ مرد داڑھی منڈاتا ہے یا بڑھاتا ہے۔ بیوی کو یہ شکایت ہوتی ہے کہ مرد اس کی طرف متوجہ نہیں بلکہ گھر پر بھی اخبار اور کتابیں پڑھتا رہتا ہے یا مرد نہاتا نہیں ہے، اس وجہ سے اس کے بدن سے بدبو آتی رہتی ہے۔ اسی طرح مرد کی طرف سے یہ شکایت ہوتی ہے کہ عورت بہت باتونی ہے اور ٹیلیفون پر بھی باتیں کرتی رہتی ہے۔[1]

اسلام نے نکاح کا معاملہ مرد کے ہاتھ میں رکھا ہے اس لئے طلاق کا حق بھی قدرتی طور پر اسی کے ہاتھ میں ہونا چاہئے کیونکہ نکاح کرنے اور نکاح توڑنے کے اخراجات کا ذمہ دار مرد ہی ہوتا ہے اس لئے نکاح کو برقرار رکھنا اس کے لئے زیادہ مفید ہے۔ وہ عورتوں سے زیادہ حوصلہ مند اور تکالیف پر صابر ہوتا ہے۔ مزید برآں خدا نے اپنی کتاب میں یہ حکم دے کر مردوں کو مزید ضبط نفس اور عورتوں کی ناخوشگوار باتوں کے متحمل ہونے کا خوگر بنا دیا ہے۔

---

[1] اخبار الاہرام نے کیلیفورنیا امریکہ کی شہر لاس اینجلس کے طلاق کے مشہور ترین جج کا ایک بیان شائع کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے علاقہ سے عنقریب ازدواجی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا اور اس کے بجائے مرد اور عورت کے تعلقات کھلم کھلا آزادی اور بے باکی کا دور دورہ ہوگا، جبکہ آج کل ازدواجی زندگی کی مثال کمپنی کے دو شریکوں کی سی ہے۔ وہ اس معاہدہ کو مذاہب کی ہدایت کے برخلاف ذرا سی بات پر توڑ دیتے ہیں۔ کیونکہ مذہب اور محبت کا کوئی رابطہ نہیں استوار کیے ہوئے نہیں ہے بلکہ اس ازدواجی زندگی کا اصل محرک شہوت پرستی، عیاشی اور لذت پسندی ہو گیا ہے۔

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِن كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ﴿١٩﴾ (۴: ۱۹)

(عورتوں کے ساتھ بھلائی کے ساتھ زندگی بسر کرو اگر تم انہیں ناپسند کرتے ہو تو ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور خدا اس میں تمہارے لئے بہت بھلائی رکھ دے۔)

شریعت نے عورت کو یہ حق دیا ہے کہ اگر شوہر میں کوئی جسمانی خرابی ہو یا وہ بیمار ہو یا نان و نفقہ کا متحمل نہ ہو سکے تو عورت قاضی سے مطالبہ کر سکتی ہے کہ وہ اس کا نکاح فسخ کر دے بلکہ مطلقہ کا نان نفقہ بھی شوہر کے ذمے رکھا گیا ہے جو اسے عدت کے زمانے میں اس وقت تک ادا کرتا رہے گا جب تک عورت کو دوسری شادی کرنے کی اجازت نہیں ملتی۔

ان تمام رعایتوں کے باوجود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طلاق کی مذمت فرمائی ہے اور فرمایا ہے کہ "خدا اسے سخت ناپسند کرتا ہے" تاکہ مسلمان کو اس سے نفرت پیدا ہو۔ اس کے اور بہت سے احکام ہیں جنہیں ہم نے متعلقہ آیات کی تفسیر میں بیان کیا ہے اور حقوق نسواں کے بارے میں اپنی نئی کتاب "جنس لطیف سے خطاب" میں بھی ان کی کافی وضاحت کی ہے۔

۱۰۔ اسلام نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کو بہت اہمیت دی ہے اور اسکا عبادت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے والدہ کے حقوق کو باپ کے حقوق پر مقدم رکھا ہے اس کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی تربیت اور بہنوں کی کفالت پر صلہ رحمی کے سلسلے میں بہت زور دیا ہے بلکہ ہر عورت کے لئے ایک سرپرست کا ہونا ضروری قرار دیا ہے جو اس کی نگرانی اور نگہداشت کرے اور اگر کسی عورت کا کوئی رشتہ دار نہ ہو تو مسلمان حکام اس کے سرپرست ہوں گے اس سلسلے میں مزید ہدایات ہم نے مذکورہ بالا کتاب میں بیان کی ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ کسی دین یا ملکی قانون نے خواتین کو وہ حقوق اور عزت واحترام نہیں بخشا ہے جو اسلام نے انہیں عطا کیا ہے۔ کیا یہ سب باتیں اس حقیقت کا کھلا ثبوت نہیں ہیں کہ یہ علم و حکمت والے مہربان خدا کی وحی ہے جو اس نے اپنے امی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کی ہے، جو ناخواندہ عربوں میں بھیجے گئے تھے۔ بلکہ بے شک وشبہ یہ خدائی وحی ہے اور ہم اس کے گواہ ہیں۔

مقصد دہم :

غلاموں کی آزادی

قدیم ترین زمانے سے قوموں میں یہ دستور چلا آیا ہے کہ طاقتور انسان کمزوروں کو غلام بنالیتے تھے بلکہ یہ طریقہ چیونٹی جیسے حشرات الارض میں بھی رائج ہے جو مل جل کر رہتے ہیں۔ چنانچہ جب ایک بستی دوسری بستی کے ساتھ جنگ کرتی ہے تو فتح حاصل کر لینے کے بعد فاتح گروہ بچی کچھی مفتوح جماعت کو قید کر لیتا تھا اور انہیں غلام بنا کر مکان بنانے یا غلہ جمع کرنے یا دوسری خدمات میں لگالیتا تھا۔

قدیم متمدن قومیں مصری، بابلی، ایرانی، ہندوستانی، یونانی، رومی اور عرب وغیرہ کمزوروں کو غلام بنا کر ان سے سخت ترین محنت کے کام لیتے تھے۔ وہ ان پر انتہائی سنگدلی کے ساتھ سخت مظالم برپا کرتے تھے یہاں تک کہ یہودیوں اور عیسائی مذاہب نے بھی غلامی کو جائز قرار دیا ہے بلکہ اہل مغرب کے ہاں بھی غلامی کی رسم جاری رہی یہاں تک کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے اپنے ہاں غلاموں کو اٹھارھویں صدی عیسوی کے آخر میں آزاد کیا۔ اس کے بعد انیسویں صدی کے آخر میں انگلستان نے تمام دنیا سے غلامی کے انسداد کی مہم شروع کی۔ لیکن ان دونوں حکومتوں نے یہ کام محض انسانی فلاح اور مساوات کے قیام کے لئے شروع نہیں کیا تھا بلکہ اس بارے میں ان کے پیش نظر خاص مفادات تھے۔ اس کا کھلا ثبوت یہ ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حکومت عرصہ دراز تک سفید فام انسانوں کو امریکہ کے اصلی سرخ فام باشندوں پر ترجیح دیتی رہی اور ان سے ایسا سلوک کرتی رہی جو دوسرے لفظوں میں سیاسی غلامی کے مترادف ہے جسے تمام اہل مغرب جائز سمجھتے رہے ہیں بلکہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں سفید فام انسانوں نے اپنے مخالف رنگ کے انسانوں کو طرح طرح کی خلاف قانون تکلیفیں دیں۔ اسی طرح انگریز ہندوستانیوں کی بہت تذلیل و تحقیر کرتا رہا اسی وجہ سے ہندوستان میں تحریک آزادی شروع ہوئی جس سے ان کے غرور تکبر کا خاتمہ ہوا تاہم گزشتہ زمانے میں ان میں رنگ ونسل کا تعصب عام تھا۔ اور اب بھی کسی حد تک باقی ہے۔ یہی حال دوسری استعمار پسند

سلطنتوں کا ہے۔ وہ محکوم قوموں کے ساتھ ظلم وتعصب سے پیش آتی ہیں بلکہ وہ اپنے ہم مذہب محکوم قوموں کے ساتھ ان کے گرجاؤں میں نماز نہیں پڑھتے تھے۔

لیکن جب دنیا میں اسلام آیا اور اس کے نور نے چمک کر ہر ظلمت کو دور کیا تو جس طرح اس نے قوموں کی دوسری خرابیاں دور کیں اسی طرح اس نے غلاموں پر مظالم کا بھی انسداد کیا بلکہ بتدریج غلامی کا خاتمہ کرنے کے لئے ایسے احکام جاری کئے جس سے فریقین کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور نہ بغاوت ہو نہ سرکشی، کیونکہ یکدم غلامی کا خاتمہ کرنا اس زمانے کے سماجی نظام کے دونوں پہلوؤں کی رو سے بہت مشکل تھا۔ کیونکہ ایک طرف مالدار آقاؤں کے مفادات تھے اور دوسری طرف غلاموں کی روزی کا سوال تھا۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے جب غلامی کا انسداد کیا تو غلام ہر طرف روزی کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے جب کہیں روزی نہ ملی تو وہ پھر اپنے آقاؤں کے پاس واپس آگئے تاکہ وہ پہلے کی طرح ان سے کوئی خدمت لے سکیں۔ یہی صورت حال سوڈان میں بھی پیش آئی جب کہ انگریزوں نے یہ تجربہ کرنا چاہا کہ نوآزاد غلاموں کے لئے آزاد کام مہیا کریں تاکہ وہ اپنی روزی کے خود کفیل بن سکیں مگر وہ اس تجربہ میں ناکام رہے مجبوراً انہیں آزاد شدہ غلاموں کو اجازت دینی پڑی کہ وہ اپنے سابق مالکوں کی خدمت میں اس شرط کے ساتھ واپس جائیں کہ وہ انہیں فروخت نہیں کر سکیں گے۔

یہ واقعات اس بات کا صاف اور کھلا ثبوت ہیں کہ غلامی جو اس زمانے کے انسانوں میں عام طور پر رائج تھی۔ اسے بیک جنبش قلم روز اول ہی سے موقوف کر دینا اس زمانے کی نہ صرف انسانی مصلحت کے خلاف تھا بلکہ ناقابل عمل بھی تھا۔ چونکہ اسلام ایک عملی شریعت ہے اس لئے اس نے غلاموں کے بارے میں جو قوانین بنائے وہ اعلیٰ درجے کی حکمت عملی پر مبنی ہیں۔ ان میں عام بھلائی کے ساتھ ساتھ رحم وشفقت کا جذبہ بھی کارگر ہے جیسا کہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ بہر حال ان حقائق پر غور کر کے ہمیں یہ یقین ہو جاتا ہے کہ یہ خدائی ہدایت ہے اور محض فلسفہ محمدی نہیں ہے۔ البتہ محمد ﷺ، خدائی وحی کے سب سے زیادہ رحمدل اور انصاف پسند مبلغ تھے جنہوں نے وحی الٰہی کو عملی جامہ پہنایا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے بعثت سے پہلے اور اس کے بعد بھی اپنے مال سے اور اپنی بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہ کے مال سے بہت سے

غلاموں اور لونڈیوں کو آزاد کرایا حالانکہ بعض غلام آزاد ہو کر اپنے گھر والوں کے پاس جانے پر آپ ﷺ کی غلامی کو ترجیح دیتے تھے۔ اسی طرح آپ ﷺ کے سب سے پہلے صحابی اور یار غار حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے مال و دولت کا سب سے بڑا حصہ غلاموں کو آزاد کرانے میں صرف کیا۔

اسلام اور غلاموں کی آزادی:

اسلام نے غلامی کو موقوف کرنے کے دو طریقے اختیار کئے۔ اول یہ کہ مستقبل میں نئے غلام بنانے پر پابندی عائد کی جائے۔ دوم یہ کہ پرانے غلاموں کو بتدریج اس طرح آزاد کیا جائے جس سے جانبین میں سے کسی کو نقصان نہ پہنچے۔

پہلا طریقہ:

اسلام نے اس پرانے دستور کو بالکل منسوخ کر دیا تھا کہ طاقتور، کمزور کو ظلم و تعدی کے ہر ممکن طریقہ سے غلام بنائیں البتہ اس نے مذکورہ بالا اسلامی اصولوں کے مطابق جنگوں میں قید ہونے والے دشمنوں کو غلام بنانے کی اجازت دی ہے مگر وہ جنگ ایسی ہو جو لوگوں کی بھلائی کے لئے ہو اور اس سے فتنہ و شر دور ہو، نیز اس میں رحم وانصاف کا لحاظ بھی رکھا جائے۔ یہ شرائط اتنی سخت تھیں کہ بت پرست تو بت پرست مہذب قوموں کے ہاں بھی یہ رائج نہ تھیں۔ بہر حال ہم نے جنگی قیدیوں کا جو ذکر کیا ہے، تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دیگر اقوام کی طرح وہ بھی قیدیوں کو ضرور غلام بنائیں۔ بلکہ اس نے مسلمانوں کے ارباب اقتدار کو یہ اختیار دیا ہے کہ ان کے جنگی قیدیوں کے سلسلے میں ہمیشہ عام مصلحت کو پیش نظر رکھیں۔ یا تو احسان کر کے قیدیوں کو چھوڑ دیں یا فدیہ لے کر آزاد کر دیں۔ فدیہ کی دو صورتیں ہیں یا تو قیدی اپنے بدلے مال ادا کریں یا دشمن ان کے عوض مسلمان قیدیوں کو چھوڑ دیں۔ یہ اصول اس آیت میں بیان کیا گیا ہے جو ہم اصول جنگ کے پانچویں اصول میں بھی بیان کر چکے ہیں۔

جب ہمیں یہ اختیار دیا گیا ہے کہ قیدیوں کو کسی معاوضہ کے بغیر چھوڑ دیں یا فدیہ لے کر رہا کریں تو اس آیت کو شرعی بنیاد بنا کر نئے غلام بنانے کی ممانعت کی جا سکتی ہے۔

کیونکہ دونوں صورتوں میں سے ایک کا اختیار دینے کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ تیسری صورت یعنی غلام بنانا جائز نہیں ہے مگر یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ جب دوسری قومیں غلام نہ بناتی ہوں، مگر حقیقت اس کے برعکس تھی جنگی قیدیوں کو غلام بنانا بین الاقوامی اصول بن چکا تھا، اس لئے مسلمانوں کو یہ زبردست نقصان پہنچ سکتا تھا کہ دشمن ہمارے آدمیوں کو غلام بناتے رہیں اور ہم ان کے قیدیوں کو چھوڑتے رہیں گو مسلمان سب سے زیادہ رحمدل اور انصاف پسند ہیں جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا تاہم مذکورہ آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان صورتوں کے علاوہ تیسری صورت پر عمل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس آیت سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ غلامی ہر حالت میں حرام ہے لہٰذا یہ معاملہ ارباب اقتدار کے اجتہاد پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ موقع اور محل دیکھ کر فیصلہ کریں۔ خواہ جنگی قیدیون کو غلام بنالیں خواہ از راہ احسان آزاد کر دیں یا فدیہ لے کر چھوڑ دیں۔

بعض فقہاء کی یہ رائے ہے کہ غلام بنانا اور قید کرنا جنگی افسروں کے اختیار میں ہے، حکام بالا کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ لہٰذا نہ حاکم اعلیٰ اور نہ سپہ سالار اور اس کے ارکان جنگ کو، جن کی طرف سے لڑائی کا حکم دیا گیا ہو، یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ جنگجو سپاہیوں کو مجبور کریں کہ عام مصلحت کے پیش نظر مذکورہ بالا دو صورتوں میں سے کسی ایک صورت کو اختیار کریں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہوازن کے قیدیوں کو چھوڑنے کے لئے مسلمانوں کو مجبور نہیں کیا بلکہ اس معاملہ کو ان کی مرضی اور اختیار پر چھوڑ دیا تھا البتہ آپ ﷺ اپنے حصے سے دستبردار ہو گئے تھے۔

اس معاملے میں انہیں کئی طرح سے غلط فہمی ہوئی ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ اگر ایسے مسائل کا تعلق عوامی بھلائی سے نہیں ہے جس کے ارباب اقتدار ذمہ دار ہیں تو پھر اقوام عالم میں کوئی معاملہ قومی مفاد سے متعلق نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ واقعہ اپنی عملی شکل میں قرآنی آیت کے خلاف ہے۔ نیز یہ ممکن ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے اس معاملہ میں دینی مصلحت اور قومی مفاد کو مد نظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کو تربیت دینے کے لئے موقع و محل کا لحاظ رکھا ہو، مکہ کے نو مسلموں کی ایمانی طاقت و کمزوری کا خیال کرتے ہوئے ان کی حوصلہ افزائی کے لئے ایسا کیا گیا ہو۔ ایسی صورت میں آپ ﷺ نے ہوازن کے وفد سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ مال غنیمت یا قیدیوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کریں۔

بظاہر آپ ﷺ کو یہ معلوم تھا کہ وہ قیدیوں کو ترجیح دیں گے پھر یہ واقعہ بھی پیش آیا کہ آپ ﷺ نے نو مسلموں کو ان کی دلجمعی کے لئے دوسروں سے زیادہ مال غنیمت دیا اور انصار کو کچھ بھی نہیں دیا۔ اس کی تفصیل ہم نے سورہ توبہ کی آیات (۲۵و۲۶) کی تفسیر میں بیان کی ہے (ملاحظہ ہو تفسیر المنار جلد ۱۰ صفحہ ۲۵۷)۔

بعض حالات میں قیدیوں کو غلام بنانا انہیں چھوڑ دینے سے زیادہ قابل ترجیح ہوتا ہے مگر ایسے حالات شاذ و نادر ہی پیش آتے ہیں۔ کہ مسلمانوں کے لڑنے والوں کی تعداد کم ہو جیسے بدوی قبائل جن کے تمام کے تمام یا اکثر مرد فنا ہو جائیں۔ ایسی صورت میں اگر ان کی خواتین، بچے کمزور اور لاچار افراد یونہی چھوڑ دیئے جائیں تو ظاہر ہے کہ وہ خود مختار زندگی نہیں بسر کر سکیں گے لہٰذا ان کے لئے یہی مناسب ہے کہ فاتح ان کے سرپرست بن جائیں اور ان کی معاش کے ذمہ دار بنیں۔ اس کے بعد ان کی آزادی کے لئے دوسرے طریقے اختیار کئے جاسکتے ہیں۔ ان حالات میں ایسا بھی ہوتا تھا کہ مسلمان ان کی عورتوں کو اپنی حرم میں داخل کر لیتے تھے۔ اس طرح وہ ان کی اولاد کی مائیں اور ان کے گھروں کی مالک بن جاتی تھیں اس کے بعد آزاد ہو جاتی تھیں۔ ایسی صورت میں وہ بدکاری سے بچ جاتی تھیں اور کم از کم ان کی معاش کا مناسب بندوبست ہو جاتا تھا اسی طرح ان کے بچوں کی مسلمان پرورش کرتے تھے، انہیں اسلامی عقائد واخلاق کی تعلیم دیتے تھے پھر عام طور پر انہیں آزاد کر دیا جاتا تھا اور وہ دوسرے آزاد مسلمانوں کی طرح زبردست عالم، دولت مند حکام اور امراء بن جاتے تھے۔ چنانچہ یہی آزاد کردہ عجمی غلام (موالی) آگے چل کر صاحب اقتدار حاکم بن گئے تھے۔

بہر حال رسول اکرم ﷺ نے اپنی امت کے لئے یہی عملی نمونہ چھوڑا ہے کہ احسان کر کے قیدیوں کو چھوڑ دیا جائے۔ آپ ﷺ کا قول و فعل یہی تھا چنانچہ غزوہ "بنی مصطلق" فتح مکہ اور جنگ حنین میں آپ ﷺ نے یہی طریقہ اختیار فرمایا جیسا کہ کتب سیر میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان ان جنگوں میں ان پر پوری طرح غالب آگئے تھے اور دشمن کسی مسلمان کو قید نہیں کر سکے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی شریعت نے قدرت اور اقتدار کے موقع پر نیکی اور احسان کو ترجیح دی ہے اور یہ بھی بڑی زبردست نیکی ہے کہ قیدیوں کو نہ حال کے کسی فائدہ کی خاطر، نہ مستقبل کے

خوف سے متاثر ہو کر بلکہ محض انسانیت اور احسان کے طور پر آزاد کیا جائے۔

اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ اکثر مشرکین جو رسول اکرم ﷺ سے جنگ کرتے تھے وہ بدو تھے اور ان سے لڑائی ایک عرصے تک جاری رہی۔ اسی لئے یہ مصلحت کا تقاضا نہیں تھا کہ ان کے قیدیوں کو واپس کر دیا جائے تاکہ وہ واپس جا کر ان کے کفر و شرک کی بد بختیوں اور ان کے ظلم و سنگدلی کا شکار ہوں، وہ اپنی اولاد کو قتل کر دیتے تھے اور لڑکیوں کو زندہ دفن کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہودیوں کے قبیلہ بنو النصیر کے ساتھ آپ ﷺ کا حسن سلوک ملاحظہ ہو۔ جب ان لوگوں نے اپنی اولاد کو جو یہودی تھے، اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے انہیں اس کا اختیار دیا جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

غلاموں کی آزادی کے احکام:

اب ہم موجودہ غلاموں کو آزاد کرنے کے لئے ضروری اور غیر ضروری احکام بیان کریں گے۔ اس کی کئی قسمیں ہیں۔ پہلی قسم میں غلاموں کی آزادی کے ضروری مسائل اور احکام کا تذکرہ ہو گا اس میں دس مسائل ہیں۔

۱۔ اسلام نے آزادی کو انسان کا پیدائشی فرض قرار دیا ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن الخطاب نے مصر کے گورنر حضرت عمرو بن العاص کو ایک خط میں تحریر کیا تھا جب کہ ایک قبطی نے آکر آپ سے شکایت کی تھی۔ "اے عمرو! تم نے انسانوں کو کس وقت سے غلام بنالیا ہے حالانکہ ان کے ماؤں نے انہیں آزاد پیدا کیا ہے۔"

حضرت فاروق اعظم کے اس قول سے فقہاء نے یہ اصول مقرر کیا ہے کہ اگر کوئی غلام ہونے کا خود دعویٰ کرے تو اس کے قول کو تسلیم نہیں کیا جائے گا بلکہ منکر غلامی کے قول کو مدعی کے قول پر ترجیح دی جائے گی اور مدعی سے ثبوت طلب کیا جائے گا۔

۲۔ منصفانہ اور مذہبی جنگ کے قیدیوں کے سوا جس کے شرائط بیان کئے جا چکے ہیں۔ اسلام نے باقی آزاد لوگوں کو غلام بنانا حرام قرار دیا ہے اور اسے بہت بڑے گناہوں میں شمار کیا ہے۔ چنانچہ بخاری شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"قیامت کے دن میں تین آدمیوں سے جھگڑا کروں گا اور جس کے مقابلے میں خود آؤں گا وہ تباہ ہو جائے گا۔ پہلا آدمی وہ ہے جس نے میرے نام پر کچھ دیا اور پھر بیوفائی کی ہو۔ دوسرا وہ انسان ہے جس نے آزاد انسان کو فروخت کر کے اس کی قیمت کھالی ہو اور تیسرا آدمی وہ ہے جس نے مزدور سے پورا کام لیا مگر اس کی مزدوری نہیں دی۔"

ایک حدیث میں آیا ہے "تین آدمی ایسے ہیں جن کی نماز قبول نہیں ہو گی ان میں سے ایک آدمی وہ ہے جس نے آزاد انسان کو غلام کی طرح بنالیا اور اس سے زبردستی خدمت لی یا اس کی آزادی سے انکار کیا ہو یا ایسے پوشیدہ رکھا ہو۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ)

۳۔ اللہ تعالیٰ نے غلام کو یہ اجازت دی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے مالک سے پوری مقررہ رقم ادا کر کے یا قسطوں میں انہیں ادا کر کے آزاد کرالے۔ مذہبی اصطلاح میں اسے کتاب اور مکاتبہ کہتے ہیں جس کا بنیادی اصول قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْۤ اٰتٰىكُمْ (۲۴: ۳۳)

(تمہارے غلاموں میں سے جو کوئی (آزادی کے لئے) تحریری معاہدہ کرنا چاہے تو اگر تم اس میں بھلائی دیکھو تو تم ان سے تحریری معاہدہ (مکاتبہ) کرلو اور ان کی اپنے اس مال سے بھی امداد کرو جو خدا نے تمہیں دیا ہے۔)

اس آیت میں خدا نے حکم دیا ہے کہ اگر آقا کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا غلام روزی کمانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور مقررہ رقم کو ادا کر سکتا ہے اور آزادانہ زندگی گذارنے کا حق دار ہو گیا ہے تو نہ صرف وہ اس سے تحریری معاہدہ کر لے، بلکہ اس سلسلے میں اس کی مالی امداد بھی کرے۔ مالی امداد کی صورت اس طرح ہو سکتی ہے کہ وہ اپنا کچھ مال ہبہ کر دے یا کئی قسطیں معاف کر دے اور اپنی فرض زکوٰۃ کا کچھ حصہ اس مالی امداد میں شامل کرے۔ مالک کے علاوہ دوسرے اصحاب بھی اس کی مالی اعانت کر سکتے ہیں۔

بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ آیت میں دونوں احکام واجبی ہیں یعنی غلاموں سے اس قسم کا تحریری معاہدہ کرنا اور ان کی مالی مدد کرنا۔ لیکن اکثر علماء کے نزدیک پہلا حکم مستحب ہے اور دوسرا واجب ہے بخاری شریف میں اس آیت کے تذکرہ کے بعد روح کے واسطے ابن جریج کی یہ روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں "میں نے عطاء سے دریافت کیا کیا میرے

لئے یہ ضروری ہے کہ جب مجھے معلوم ہو جائے کہ میرے غلام کے پاس کافی سرمایہ ہے تو میں اس سے تحریری معاہدہ (مکاتبہ) کروں"۔ حضرت عطاء نے جواب دیا "میرے خیال میں یہ واجب ہے"۔ عمرو بن دینار فرماتے ہیں کہ میں نے عطاء سے دریافت کیا "کیا آپ نے یہ مسئلہ کسی سے سنا ہے"۔ انہوں نے کہا "نہیں"۔ اس کے بعد کہنے لگے کہ موسیٰ بن انس نے مجھے بتایا ہے کہ سیرین (محمد بن سیرین مشہور تابعی اور ان کے بھائیوں کے والد) نے حضرت انس سے درخواست کی کہ وہ ان سے (ان کی آزادی کے بارے میں) تحریری معاہدہ (مکاتبہ) کرلیں کیونکہ ان کے پاس بہت دولت تھی حضرت انس نے انکار کیا۔ اس پر حضرت سیرین نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر شکایت کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بلا کر ان سے فرمایا "اس سے مکاتبت کا معاہدہ کرلو"۔ انہوں نے پھر انکار کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں درے سے مارا اور مذکورہ بالا آیت تلاوت فرمائی۔ یہ سن کر حضرت انس نے حضرت سیرین سے معاہدہ کر لیا۔

۴۔ اگر غلام دارالکفر سے بھاگ کر دارالاسلام میں آجائیں تو وہ آزاد ہو جائیں گے اس وقت اسلامی حکومت کا فرض ہوگا کہ وہ ان کی آزادی کو تسلیم کرلیں۔ اس کا ثبوت کتب سنت میں عام طور پر موجود ہے۔ یہاں کفر سے غیر اسلام مراد ہے مگر آج کل معاملہ بالکل برعکس ہے آج کل غلام دارالاسلام سے بھاگ کر دارالکفر یا اس کے مشابہ ممالک میں جا کر آزادی حاصل کرتے ہیں۔

۵۔ اگر کسی غلام کی ملکیت میں کئی آقا حصہ دار ہیں تو اگر ایک نے بھی اسے اپنے حصہ سے آزاد کر دیا تو وہ بالکل آزاد ہو جائے گا بشرطیکہ اس کے پاس مال موجود ہو اگر دوسرے کا حصہ باقی رہے تو اس کے بارے میں مختلف احکام ہیں۔ اس بارے میں صحیحین اور دوسری کتب میں کئی احادیث موجود ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا "اگر کسی شخص نے غلام کی ملکیت کا کوئی حصہ چھوڑ دیا ہے تو غلام آزاد ہے بشرط یہ کہ اس کے پاس مال ہو ورنہ بقیہ حصوں کی قیمت کا اندازہ لگایا جائے اور اس پر کسی قسم کی زیادتی کئے بغیر اس کی کمائی سے قیمت وصول کر لی جائے"۔ (قیمت وصول کرنے کا اندازہ لگانے میں غلام پر بے جا رقم کا بار نہ ڈالا جائے) حضرت ابن عمر کی مرفوع حدیث ہے۔

"جس کسی نے غلام کو اپنے حصے میں سے آزاد کر دیا ہے تو وہ اپنی باقی قیمت دوسرے شریکوں کو انصاف کے ساتھ ادا کر کے آزاد ہو جائے گا۔"

۶۔ جو کوئی اپنے غلام کو بہت تکلیف پہنچائے یا اس کی صورت بگاڑے یا اسے خصی کر دے تو وہ غلام آزاد ہو جائے گا چنانچہ امام احمد بن حنبل نے یہ روایت بیان کی ہے "زنباع ابوروح نے اپنے ایک غلام کو ایک لونڈی کے پاس دیکھ لیا تو اس نے (غصہ میں آکر) اس کی ناک کاٹ لی اور اسے ہیجڑا کر دیا۔ غلام نے رسول اکرم ﷺ سے جا کر شکایت کی۔ آپ ﷺ نے مالک سے بازپرس کی اس نے اپنے فعل کا اقرار کیا اور اسی کے گناہ کا تذکرہ کیا۔ آپ ﷺ نے غلام سے فرمایا" جاتو آزاد ہے۔" اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ ہیجڑا بنانا اور خصی کرنا اسلام میں حرام ہے۔ اور غلام کی آزادی کا سبب ہے۔ حاکم کا فرض ہے کہ وہ اس حکم کو نافذ کرے۔ ایسی صورت میں اسلامی ممالک میں خواجہ سرا بنانے کا جو رواج تھا وہ اسلامی شریعت کے بالکل خلاف ہے کیونکہ انہیں خصی کرنا اور پھر آزادانہ کرنا دونوں چیزیں خلاف شریعت ہیں۔

امام احمد نے ایک اور حدیث بیان کی ہے جسے ابوداؤد اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔ وہ حدیث یہ ہے "ایک شخص رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں آکر چلانے لگا۔ آپ نے پوچھا۔ "تمہیں کیا ہو گیا ہے" اس نے کہا" مجھے میرے آقا نے دیکھا کہ میں اس کی ایک لونڈی کا بوسہ لے رہا ہوں تو اُس نے مجھے خصی کر ڈالا۔" رسول اکرم ﷺ نے حکم دیا" میرے پاس اُس آدمی کو لاؤ۔" اس نے اسے تلاش کیا مگر وہ نہیں مل سکا اس پر آپ ﷺ نے غلام سے فرمایا" جاؤ تم آزاد ہو" جامع الاصول میں سمرہ بن جندب اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جو شخص اپنے غلام کی شکل بگاڑ دے تو اس کا غلام آزاد ہے۔"

۷۔ صورت بگاڑنا نہ سہی، غلام کو دوسری سخت یا نرم سزائیں دینا بھی حرام ہیں اور اس گناہ کا کفارہ یہی ہے کہ اسے آزاد کر دیا جائے چنانچہ امام احمد، مسلم اور ابو داؤد نے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کی ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کسی نے اپنے غلام کو تھپڑ مارا یا زدوکوب کیا تو اس کا کفارہ یہی ہے

کہ اسے آزاد کر دیا جائے۔"

امام بخاری، مسلم اور ترمذی نے سوید بن مقرن سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ہمارے خاندان کے پاس صرف ایک کنیز خادمہ کے طور پر تھی، ہم میں سے ایک شخص نے اسے طمانچہ مار دیا۔ رسول اکرم ﷺ کو جب معلوم ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا "اسے آزاد کر دو"۔ آپ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ ہم لوگوں کے پاس صرف یہی ایک کنیز خدمت کے لئے ہے۔ اس پر آپ ﷺ نے اجازت دی کہ جب تک اس کی ضرورت ہو اس کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جائے اور جب ضرورت باقی نہ رہے تو اسے آزاد کر دیا جائے۔

امام مسلم وغیرہ نے ابو مسعود البدری سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں اپنے ایک غلام کو کوڑے مار رہا تھا، اچانک پیچھے سے آواز سنی "ابو مسعود سمجھ لے،" غصہ کی وجہ سے میں آواز کو پہچان نہیں سکا۔ جب آواز قریب سے آئی تو کیا دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ ہیں جو فرما رہے ہیں "اے ابو مسعود سمجھ لے"۔ آپ ﷺ کے رعب کی وجہ سے میرے ہاتھ سے کوڑا گر گیا۔ آپ ﷺ نے پھر ارشاد فرمایا' اے ابو مسعود تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ جتنی قدرت تمہیں اس غلام پر حاصل ہے خدا کو اس سے زیادہ تم پر قدرت حاصل ہے.... میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! خدا کے نام پر یہ آزاد ہے"۔ آپ ﷺ نے فرمایا "اگر تم ایسا نہ کرتے تو تمہیں دوزخ کی آگ میں جلنا پڑتا۔"

یہ اور اس قسم کے دوسرے واقعات رسول کریم ﷺ کی رحم و شفقت اور غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے۔ آپ ﷺ میں یہ اعلیٰ اخلاق کیسے موجود نہ ہوتے جب کہ آپ تمام دنیا کے لئے مجسم رحمت بن کر آئے تھے۔ مگر اہل کلیسا، مغربی سیاست دان اور ان کے خوشہ چین آپ ﷺ پر جھوٹ اور بہتان لگانے سے باز نہیں آتے۔

۸۔ تدبیر سے غلاموں کی آزادی لازم ہو جاتی ہے۔ مذہبی اصطلاح میں "تدبیر" اسے کہتے ہیں کہ آقا اپنے غلام سے کہے "تم میرے مرنے کے بعد آزاد ہو"۔ اگر آقا نے ایسے الفاظ کہے ہیں جن سے آزادی کا مفہوم واضح نہیں ہوتا تو ایسی حالت میں بھی بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ غلام اس کے مرنے کے بعد آزاد ہو جائے گا کیونکہ شریعت اسلامی کے بنیادی مقاصد میں یہ بات شامل ہے کہ غلام آزادی حاصل

کریں۔ بعض علماء نے وصیت کے پہلو کو ترجیح دی ہے۔

"تدبیر" کے احکام میں یہ بات شامل ہے کہ مذکورہ بالا الفاظ کہنے کے بعد ہی فوراً وہ قابل عمل ہو جاتے ہیں۔ وصیت کی طرح اس سے رجوع کرنا جائز نہیں ہے۔ ایسی صورت میں امام مالک اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک مدبر غلام کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر کوئی غلام کے پورے حصہ کا مالک ہے اور وہ یہ کہے کہ "میرے مرنے کے بعد تمہارا کچھ حصہ آزاد ہے"۔ تو غلام کا مکمل حصہ آزاد ہو جائے گا۔

تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اس قسم کی مدبرہ کنیز کی اولاد غلامی اور آزادی میں اس کی تابع ہے۔ جب وہ آزاد ہو جائے گی تو اس کے ساتھ ساتھ اس کی اولاد بھی آزاد ہو جائے گی۔

۹۔ جس کنیز کی اپنے آقا سے اولاد ہو جائے (ام الولد) تو وہ کنیز اپنے آقا کی موت کے بعد آزاد ہو جائے گی۔ آقا کے رشتہ دار اس کنیز کے وارث نہیں ہو سکتے بلکہ خود آقا بھی تمام متفقہ قول کے مطابق اسے اپنی زندگی میں فروخت نہیں کر سکتا۔ اُس مسئلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بہت پیش پیش تھے۔

امام مالک نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث بیان کی ہے "جب کوئی لونڈی اپنے آقا کی اولاد کی ماں بن جائے تو آقا نہ اسے فروخت کر سکتا ہے، نہ ہبہ کر سکتا ہے نہ اس کے رشتہ دار اس کے وارث بن سکتے ہیں البتہ وہ اسے زندگی بھر اپنی رفیقہ حیات بنا سکتا ہے اس کے مرنے کے بعد وہ آزاد ہو جائے گی۔" یہ اصول اس لئے رکھا گیا ہے اگر ایسی کنیزیں وارثوں میں تقسیم ہوں تو وہ خود اپنی اولاد کی ملکیت بنے گی جو اسلامی شریعت کے آداب اور اصول و مقاصد کے خلاف ہے۔

۱۰۔ اگر کوئی شخص اپنے کسی رشتہ دار کا مالک بن جائے تو وہ خود بخود آزاد ہو جائے گا۔ اس بارے میں سب سے زیادہ مشہور حدیث سمرہ بن جندب کی مرفوع حدیث ہے کہ آپ نے فرمایا "جو اپنے کسی قریبی رشتہ دار کا مالک بن جائے تو وہ رشتہ دار آزاد ہے۔ یہ حدیث نسائی اور حاکم کے سوا امام احمد اور دیگر اصحاب سنن نے روایت کی ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اس کی اصل وجہ بھی وہی ہے جو ام ولد کے بارے میں بیان کی جا چکی ہے۔

۳۔ کفارہ کے ذریعے غلاموں کی آزادی :

کفارہ سے مراد وہ عمل ہے جو گناہوں کو دور کرے۔ ایسا سب سے بڑا کام غلاموں کا آزاد کرنا ہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں

(۱) جس کے پاس غلام ہیں اگر وہ غلطی سے کسی انسان کو مار ڈالے یا اپنی بیوی کو ماں کہہ دے (ظہار) جس پر جاہلیت کے زمانے میں طلاق واقع ہو جاتی تھی، یا مقررہ قیود و شرائط کے مطابق قصداً روزہ توڑ دے تو ایسے شخص کا واجب کفارہ یہی ہے کہ وہ غلام کو آزاد کرے۔

(۲) جو شخص قسم کھا کر توڑ دے تو اس کے کفارہ میں اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ دس مسکینوں کو کھانا کھلائے یا کپڑا پہنائے یا غلام آزاد کرے جیسا کہ قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں کفارہ واجب ہے مگر کئی چیزوں کا حالات کے مطابق اختیار دیا گیا ہے، جس کی حکمت واضح ہے۔

(۳) غیر معین گناہوں کے کفارہ کے لئے غلاموں کا آزاد کرنا مستحب ہے۔ بہر حال غلاموں کو آزاد کرنا ایسا ثواب کا کام ہے کہ اس کے ذریعے بڑے بڑے گناہ دھل جاتے ہیں۔

۴۔ غلاموں کی آزادی کے دیگر ذرائع :

موجودہ غلامی کا خاتمہ کرنے کے لئے خداوند تعالیٰ نے زکوۃ کے آٹھ مصارف میں سے ایک مصرف غلاموں کی امداد کے لئے بھی مقرر فرمایا ہے، اس کے ذریعے غلاموں کو آزاد کرایا جاسکتا ہے اور غلاموں کو خود آزادی حاصل کرنے کے لئے کتاب کے مذکورہ بالا طریقے کے مطابق مالی اعانت بھی کی جاسکتی ہے۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ روئے زمین کے مسلمانوں کی زکوۃ کروڑوں اور اربوں روپے تک پہنچ سکتی ہے لہٰذا اگر صرف زکوۃ ہی سے اسلامی احکام نافذ کئے جائیں تو دارالاسلام کے تمام غلام آزاد کئے جاسکتے ہیں۔

۵۔ غلام آزاد کرنے کا ثواب :

خدا کی رضا مندی اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بھی غلاموں کو آزاد

کیا جاتا تھا۔ چنانچہ کتاب وسنت اور بزرگوں کے اقوال میں غلاموں کو آزاد کرنے کا جو ثواب بیان کیا گیا ہے اگر اس کے بارے میں تمام معلومات جمع کی جائیں تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔ قرآن کریم کی مذکورہ بالا آیت البر میں اسے بنیادی نیکیوں میں شامل کیا گیا ہے (۲: ۱۷۷) اور ایک عظیم عبادت بتایا گیا ہے۔ غلاموں کو آزاد کرنے کے ثواب کے بارے میں ایک مشہور حدیث یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص کسی مسلمان[11] غلام کو آزاد کرتا ہے تو خدا غلام کے ہر عضو کے بدلے اس آدمی کا ہر عضو دوزخ کی آگ سے آزاد کر دے گا۔" (حدیث ابوہریرہ متفق علیہ)

حضرت ابوذر کی حدیث ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا "سب سے بہتر عمل کیا ہے۔ فرمایا اللہ پر ایمان لانا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا۔ پھر میں نے دریافت کیا "افضل کس غلام کو آزاد کرنا ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا جو سب سے زیادہ قیمتی اور اس کے مالک کو سب سے زیادہ پسند ہو۔" (متفق علیہ)

حضرت ابو موسیٰ اشعری کی مشہور حدیث ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا۔

"جس مرد کے پاس کنیز ہو وہ اسے خوب اچھی تربیت دے اور اسے اچھی تعلیم دلائے پھر اس کے بعد اسے آزاد کر کے اس سے شادی کرے تو اسے دوگنا ثواب ملے گا۔" اسے امام بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ انہی کی یہ روایت بھی ہے کہ جب حضرت ابوہریرہ نے رسول اللہ ﷺ کا یہ قول نقل کیا "نیک غلام کو دوگنا ثواب ملتا ہے"۔ تو یہ کہنے لگے "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر جہاد، حج اور اپنی والدہ سے نیک سلوک کا خیال نہ ہوتا تو میں غلامی کی حالت میں مرنا پسند کرتا۔"

غیر مسلم غلام کی آزادی:

غلاموں کو آزاد کرنا اسلام میں عبادت ہے کیونکہ اس کا تمام انسانوں کے حقوق سے تعلق ہے، اس میں مسلمان اور کافر غلام دونوں شامل ہیں۔ تاہم یہ واضح ہے کہ مسلمان کا حق دوسرے پر مقدم ہے اور اس کی اہمیت زیادہ ہے۔ چونکہ انسان کو غلام بنانا

■ تمام علماء متفق ہیں کہ کافر غلام کو آزاد کرنا بھی جائز ہے اور ثواب کا کام ہے۔ البتہ اس بارے میں اختلاف ہے کہ آیا کفارہ میں ایسے غلام کو آزاد کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

حریت کشی ہے جس کے بغیر انسانیت کی تکمیل نہیں ہوتی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے قصاص نہ لینے کی حالت میں اسے قتل کا کفارہ قرار دیا ہے مگر یہ شرط رکھی گئی ہے کہ مسلمان غلام کو آزاد کیا جائے کیونکہ مومن اسلامی شریعت میں کامل انسان ہے اسی طرح ظہار کے کفارہ میں بھی یہی شرط ہے۔ اس وجہ سے کہ اس کا مذہبی مسائل زوجیت سے تعلق ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے قسم کے کفارہ میں مومن کی شرط نہیں لگائی ہے اس وجہ سے بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ اس میں دونوں قسم کے غلام آزاد کئے جاسکتے ہیں تاہم بعض علماء نے دیگر مسائل پر قیاس کرتے ہوئے مومن کی قید لگائی ہے۔ ہمارے خیال میں پہلی رائے زیادہ واضح معلوم ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں امام بخاری نے اپنی کتاب میں ایک باب "مشرک کی آزادی" کے عنوان سے مقرر کیا ہے جس میں ہشام اور ان کے والد عروہ بن زبیر کے واسطہ سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ حضرت حکیم بن حزام نے جاہلیت کے زمانہ میں سو اونٹ دیت دی تھی اور سو غلام آزاد کئے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا "یارسول اللہ! میں عہد جاہلیت میں نیک بننے کے لئے بہت سے نیکی کے کام کیا کرتا تھا" آپ ﷺ نے فرمایا چونکہ تم نیکی کے بہت سے کام کرتے تھے اس وجہ سے تم دولت اسلام سے مالامال ہوئے ہو" (صحیح مسلم میں بھی اسی قسم کا مضمون بیان کیا گیا ہے۔)

اس باب میں امام بخاری کے عنوان "عتق المشرک" کے دو مفہوم ہوسکتے ہیں۔ اس میں مشرک کے آزاد کرنے کے نیک کام اور مشرکوں کو آزاد کرنے کا مفہوم بھی لیا جاسکتا ہے یعنی فاعل کی طرف یا مفعول کی طرف اضافت کر کے دونوں چیزوں کو مراد لیا جاسکتا ہے۔ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اسلام لاکر ان کے نیک کاموں کی تکمیل ہوگئی ہے لہٰذا مسلمان ہونے کے بعد انہیں اپنا تزکیہ نفس کرنے کا زیادہ موقع ملے گا، بہر حال اگر وہ مسلمان نہ ہوتے تو ان کے ساتھ نیکی کے کام ان کے لئے آخرت میں نجات کا ذریعہ نہیں بن سکتے پھر تاہم اوروں کی بہ نسبت انہیں بہتر کہا جاسکتا تھا۔

غلاموں کے بارے میں ہدایات:

اس سلسلے میں ان ہدایات کو بھی شامل کرنا چاہئے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ

نے غلاموں کے بارے میں جاری کی ہیں۔ سب سے پہلی رعایت یہ ہے کہ ان کے فرائض میں تخفیف کر دی گئی ہے۔ بلکہ ان کی سزا بھی آزاد انسانوں کے مقابلے میں نصف رکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے والدین سے حسن سلوک کے ساتھ نیکی کی تاکید فرمائی ہے۔ یہاں تک کہ رسول اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ غلاموں کو "غلام" یا "کنیز" کہہ کر پکارا جائے بلکہ حکم دیا ہے کہ انہیں میرا لڑکا یا میری لڑکی، کہہ کر پکارا جائے۔ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا "جو کچھ تم کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ اور جو تم پہنو وہی ان کو پہناؤ اور اگر ان کی طاقت سے زیادہ انہیں کوئی کام دو تو اس کام میں خود ان کا ہاتھ بٹاؤ" جیسا کہ صحیحین وغیرہ میں حضرت ابوذر نے روایت کیا ہے اسی روایت کی اصل بنیاد یہ ہے کہ معرور بن سویہ فرماتے ہیں "میں نے حضرت ابوذر کو ابذہ میں دیکھا کہ وہ عمدہ پوشاک پہنے ہوئے تھے اور ان کا غلام بھی عمدہ پوشاک پہنے ہوئے تھا جب میں نے ان سے اس کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے یہ حدیث بیان کی جس کے اصل الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "غلام تمہارے بھائی ہیں جنہیں خدا نے تمہارے ماتحت کر دیا ہے لہٰذا جس کا بھائی اس کے ماتحت ہو اسے چاہئے کہ جو کچھ وہ کھاتا ہو وہی کھلائے اور جو پہنتا ہو، وہی اسے پہنائے اور ان کی طاقت سے زیادہ ان پر بوجھ نہ ڈالے اگر تم انہیں اس قسم کی تکلیف دو تو مساوی حیثیت سے ان کی مدد کرو۔"

صحیح احادیث میں یہ مذکور ہے کہ آپ ﷺ مرض الموت میں بھی عورتوں اور غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کے بارے میں صحابہ کو نصیحت فرماتے رہے یہاں تک کہ آپ کی روح مبارک اپنے اعلیٰ رفیق سے جا کر مل گئی۔ ایک دفعہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے دریافت کیا "خادم کو کتنی مرتبہ معاف کروں؟" آپ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا "روزانہ ستر ۷۰ مرتبہ اسے معاف کر دو"۔ ستر مرتبہ سے مراد یہ ہے کہ جب غلطی کرے معاف کر دو۔

بعض مستشرقین فلسفیانہ تنقیدی انداز میں آپ ﷺ کے اس حسن سلوک کا نفسیاتی تحلیل و تجزیہ اس طرح کرتے ہیں کہ چونکہ آپ ﷺ نے ایک کنیز کی گود میں پرورش پائی تھی، اس لئے آپ ﷺ نے غلاموں کے بارے میں حسن سلوک کی ہدایات جاری فرمائیں۔ ان کی اس سے مراد آپ ﷺ کی انا اور ابولہب کی آزاد لونڈی ثوبیہ ہے۔ مگر اس

تحقیق و توجیہ سے تاریخ، علم النفس اور فلسفہ سے گہری جہالت کا ثبوت دیا گیا ہے۔ مناسب یہ تھا کہ اس سے مراد ام ایمن لی جاتیں جو آپ ﷺ کی والدہ کی لونڈی تھیں۔ انہوں نے آپ ﷺ کی پرورش کی تھی جب آپ ﷺ ان کے وارث ہوئے تو آپ ﷺ نے آزاد کر دیا تھا۔ تاہم آپ ﷺ نے ادھیر عمر میں جو زبردست شریعت پیش کی وہ انسانوں کے تمام قوانین، فلسفہ اور ادب سے بڑھ کر ہے۔ اس کی توجیہ و تحقیق اس طرح نہیں بیان کی جاسکتی جس طرح ان لوگوں نے بیان کی ہے۔ اس کے علاوہ شریعت اسلامی کا صرف یہی ایک اصول توجہ کے قابل نہیں ہے بلکہ شریعت کے تمام اصول ایسے ہی ہیں لہٰذا ان تمام اصولوں کے بارے میں مجموعی صورت میں کیا کہا جائے گا؟

بہر حال یہی اسلامی ہدایات تھیں جن کی بناء پر اسلام کے ابتدائی دور کے مسلمان غلاموں کی بے حد خاطر مدارت کرتے اور ان کے ساتھ اس قدر حلم اور بردباری کے ساتھ پیش آتے تھے کہ وہ اپنی خدمات میں کوتاہی کرنے لگے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی زمانے میں غلام ان آزاد لوگوں سے زیادہ خودداری اور عزت کے ساتھ خوشگوار زندگی بسر کرتے تھے جو موجودہ زمانے میں مغربی حکومتوں کی غلامی میں ہیں یا ان کے زیر اثر ہیں۔

بحث کا خلاصہ :

ہم نے وحی نبوت پر اپنے مذہب کے اور عیسائیوں کے پیغمبروں کے معجزات کے بارے میں جو بحث کی ہے اسے بغور پڑھا جائے۔ نیز نفسیاتی شبہات کی تردید اور قرآن کریم کے لسانی اور علمی معجزات کے بارے میں جو کچھ تحریر کیا گیا ہے وہ بھی قابل ملاحظہ ہے۔ اس کے بعد قرآن کریم کے مذکورہ بالا دس مقاصد کے ابواب پیش نظر ہونا چاہئے جن میں روحانی، اخلاقی، سماجی، مالی اور سیاسی پہلوؤں سے انسانوں کی اصلاح و تکمیل کی تدابیر بیان کی گئی ہیں یعنی قرآن کریم نے ان تمام مسائل کی طرف رہنمائی کی ہے، جن کی موجودہ دور میں اقوام عالم اور ان کی حکومتوں کو سخت ضرورت ہے۔ اسلام نے ان مسائل کو عمدہ انداز سے ایسے اصولوں اور قوانین کے ذریعے واضح کیا ہے، جو بالکل صحیح اور مکمل ہیں اور عوام کے مفادات کی تکمیل کرتے ہیں، ان کی بدولت قدیم وجدید خرابیاں دور کی

جاسکتی ہیں۔ یہ اصول ہر زمانہ کے انبیاء کی تعلیمات، حکماء کے فلسفہ، بادشاہوں اور حکام کے قوانین سے زیادہ مکمل اور اعلیٰ ہیں۔ حالانکہ قطعی طور پر یہ معلوم ہوچکا ہے کہ محمد ﷺ امی تھے اور فطرتاً عزلت پسند تھے، نہ آپ ﷺ کو پیغمبروں کی اور دوسرے علوم وفنون اور قوانین کی کتابوں کے مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا اور نہ آپ ﷺ نے کسی علم کی جستجو کی نہ شعر گوئی، خطابت اور علمی مباحث میں حصہ لیا۔ نیز یہ بھی یقینی طور پر معلوم ہوگیا ہے کہ آپ ﷺ قرآن کریم کو لے کر اس وقت آئے جب آپ کی عمر چالیس سال کی ہوچکی تھی۔ یہ وہ عمر ہے جب انسانوں کی نفسیاتی ذھنی اور عقلی استعداد ایسی نہیں ہوتی کہ وہ ایسی نئی بات ایجاد و اختراع کرسکیں جس کی ابتداء انہوں نے اپنی جوانی کے زمانے میں نہیں کی تھی۔

اگر ان تمام باتوں پر یکدم غور کیا جائے تو انسانی عقل یہ یقین کرنے پر مجبور ہوگی کہ اس قسم کی شریعت کو پوری تفصیلات کے ساتھ پیش کرنا ناخواندہ یا تعلیم یافتہ انسان کی قابلیت سے باہر ہے اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ شریعت خدائی وحی کا نتیجہ ہے جو آپ ﷺ پر نازل ہوئی۔

اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ اس قسم کی کچھ باتیں آپ ﷺ کو وراثت، ماحول اور تربیت کے اثرات سے معلوم ہوئیں اور کچھ مسائل آپ ﷺ کو قوم کے دانشمندوں یا ان دوسرے لوگوں کے ذریعے معلوم ہوئے جو آپ ﷺ سے ایک دو سفروں میں ملے تھے بلکہ یہ بھی فرض کرلیا جائے کہ خود آپ ﷺ نے اپنی فطری ذہانت کی بدولت اور انسانوں کی بری حالت کو دیکھ کر یہ معلوم کرلیا تھا کہ انسانیت اصلاح کی محتاج ہے۔ لیکن یہ سب فرض کرلینے کے بعد کیا عقل یہ تصور کرسکتی ہے کہ اس طرح کی اڑتی ہوئی باتوں سے یا ایسے اچٹتے ہوئے خیالات کے ذریعے قوموں کی تمام ضرورتیں پوری کی جاسکتی ہیں؟ اور کیا یہ تمام اعلیٰ اصول بچپن سے جوانی تک جبکہ انسان خود نمائی کا طالب ہوتا ہے آپ ﷺ سے پوشیدہ رہے؟ یہاں تک کہ ادھیڑ عمر میں، کیسی معجز بیانی کے ساتھ ان کا ظہور ہوتا ہے کہ اس کی بلاغت کا اثر دلوں پر چھا جاتا ہے اور اس کے دلائل کی طاقت عقلوں پر مسلط ہوجاتی ہے۔ اس طرح عرب قوم میں ایسا زبردست انقلاب پیدا ہوجاتا ہے جو ان کی کایا پلٹ دیتا ہے اور وہ تمام مہذب قوموں کے سردار بن جاتے ہیں اور ان کے ذریعے دنیا

میں وہ انقلاب رونما ہوتا ہے جس کی کہانی تاریخ بیان کر چکی ہے۔ اس سے بھی زیادہ عجیب وغریب حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ قوموں کی بہ نسبت عہد حاضر کے وسیع علوم اور حیرت انگیز تمدن کی مالک قومیں اس شریعت کی زیادہ محتاج ہیں۔ نہیں ہرگز نہیں ایسی عجیب وغریب بات اب تک انسانوں میں نہیں ملاحظہ کی گئی۔ للذا یہ ثابت ہوا کہ ایسا علم خدائی وحی سے ہی حاصل ہوا اس لئے ہر دانشمند انسان کے لئے جس کے پاس یہ دعوت پہنچے، یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اس کو تسلیم کرے، اس پر عمل کرے اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دے۔ جب حقیقت ثابت ہو چکی ہے تو ہر فرد و بشر کا جس کے پاس یہ دعوت پہنچے، یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اسے قبول کرے اور اپنی انسانیت کی تکمیل، قوم کو ہدایت دینے اور دنیا اور آخرت کی شاد کامیوں کو حاصل کرنے کے لئے اس راہ پر گامزن ہو جائے۔ اگر اسے اس کے خلاف کوئی شبہ پیدا ہو تو وہ اس کی تحقیق کرے یا بالکل مسترد کر دے کیونکہ کوئی عقلمند، جو علم طب کے فوائد سے واقف ہو چکا ہو، کسی طبی مسئلہ میں شک و شبہ کی وجہ سے یا کسی طبیب کے ناکام علاج کی بنا پر حفظان صحت یا بیماری دور کرنے کے لئے طبیب سے استفادہ کو ترک نہیں کرے گا لیکن اسلام تو سب سے بڑا روحانی اور سماجی طبیب ہے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ (۶:۱۴۹)

(کہہ دیجئے اللہ ہی کے پاس کارگر دلائل ہیں اگر وہ چاہتا تو وہ تم سب کو ہدایت دیتا۔)

میں خوش ہوں کہ اللہ میرا رب ہے اور اسلام میرا دین ہے اور محمد ﷺ ہمارے پیغمبر ہیں۔

اشھد ان لآ الٰہ الا اللہ واشھد ان محمداً رسول اللہ وانہٗ خاتم النبین ورحمۃ العامۃ للعالمین وسلام علی المرسلین والحمد للہ رب العلمین O

خاتمہ

مہذب اقوام کو دعوت اسلام

اب وحی محمدی کی تعلیمات کے ذریعے مہذب اقوام کے سامنے مذہب اسلام کا چیلنج پیش کیا جاتا ہے۔ حضرت محمد ﷺ کے مذہب کے عقائد اور ان کی شریعت کے اصول و قواعد بیان کئے جا چکے ہیں۔ ان کے مذہبی، سماجی، مالی اور سیاسی اصلاحات کے اصول کو اجمالی طور پر بیان کیا گیا ہے جن کی شہادتیں قرآنی آیات سے پیش کی گئی ہیں۔ یہ تحریر اور بیان کے مبالغوں اور شاعرانہ تخیلات اور جذبات سے خالی ہے (بلکہ یہ سیدھی سادی تحریر ہے۔)

ہم مسلمان اقوام عالم کے فلاسفہ، مورخین، بالخصوص آزاد خیال مغربی علماء کو چیلنج دیتے ہیں کہ محمد ﷺ جو شریعت لائے ہیں اس جیسی یا اس کے لگ بھگ کوئی چیز پیش کریں اور بڑے سے بڑے پیغمبروں، مشہور حکماء، ادباء اور ماہر سیاست دانوں کی تعلیمات میں سے اس کے برابر کوئی چیز ہمارے سامنے لائیں۔

حالانکہ آنحضرت ﷺ اول و آخر امی تھے اور آپ ﷺ نے یہ اسلامی تعلیمات عمر کے اس حصہ کو مکمل کرنے کے بعد پیش کیں جس کے بارے میں ماہرین کا یہ فیصلہ ہے کہ اس عمر کے حصہ میں انسان کسی علم و فن کا آغاز یا اس میں ایجاد و اختراع نہیں کر سکتا۔ اور کوئی نئی شریعت اور قانون وضع کرنے کے قابل نہیں ہوتا ہے۔ چہ جائیکہ وہ دنیا میں ایک انقلاب عظیم برپا کرے یا کسی عظیم الشان کام کی بنیاد ڈالے جب کہ نو عمری کے زمانے میں اس کے اندر کام کی قابلیت و استعداد کے آثار نظر نہ آئیں۔ علاوہ ازیں آپ ﷺ کے ماحول میں اور بنو اسرائیل کے اولوالعزم پیغمبروں یعنی حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے ماحول میں جو زبردست فرق تھا، اسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

عہد حاضر کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ سائنسی دور میں ہم علمی، اصلاحی اور سیاسی حیثیت سے قرآن کریم کو دنیا کے سامنے چیلنج کے طور پر پیش کرتے ہیں جیسا کہ ہمارے اسلام نے قرآن کریم کو اس کی معجز بیان عربی بلاغت اور اسلوب فکر کے لحاظ سے اپنے زمانے میں چیلنج کے طور پر پیش کیا تھا۔ کیونکہ حضرت محمد ﷺ نے اس کے برق رفتار اثرات کی بدولت قرآنی اصلاح وہدایت کو جس قدر تیزی کے ساتھ دنیا میں نافذ کیا وہ قرآن کریم کا سب سے بڑا معجزہ ہے جو انسانی طاقت سے باہر تھا۔ یہ انقلاب کیوں نہ ہوتا جب کہ اس کے اندر اس کی علمی اور عملی صلاحیتیں دونوں کارفرما تھیں۔

اس دعویٰ کی وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ انسانی افراد، جماعتوں اور قوموں کے طریقہ اصلاح کا علم بہت وسیع ہے۔ ذہین اور ہونہار افراد میں سے بہت کم ایسے ہیں جو کتابوں اور مدارس کی تعلیم سے اس فن میں مہارت حاصل کر سکیں اور ان میں سے بہت کم افراد قیادت اور حکومت حاصل کرنے کے بعد معلوم کی ہوئی اصلاحات کو عملاً نافذ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جب کہ علم وعمل کے جامع انسانوں کا اس قدر قحط ہو۔ تو کیا یہ ممکن ہے کہ ایک انسان اس شاخ درشاخ ہمہ گیر علم بلکہ اعلیٰ علوم کو خود وضع بھی کر لے اور پھر خود ہی ان علوم واصلاحات کو عملی جامہ پہنا کر انہیں نافذ بھی کردے اور اس کا نتیجہ اس قدر جلد برآمد ہو جائے کہ اس کے ذریعے خود اسی کے زمانے میں ایک بڑی قوم کی اصلاح ہو جائے اور وہ اپنے ہی دور میں اپنی تحریک کو کامیاب ہوتا ہوا دیکھ لے؟

یقیناً یہ بات ہر فرد بشر کی طاقت سے باہر ہے اور نہ گذشتہ زمانہ میں اس کی کوئی نظیر موجود ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کے تمام اصول وفروع آج تک محفوظ ہیں۔ اگر آج کل انسانوں کی ایک بڑی تعداد بگڑی ہوئی نظر آتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اس چشمۂ ہدایت سے سیراب ہونا چھوڑ دیا ہے۔

اسلامی تعلیمات کا عملی نفاذ

حضرت محمد ﷺ نے یہ اسلامی تعلیمات ہجرت کے بعد، جو آزادی کا زمانہ تھا، صرف دس (۱۰) برس کے اندر عملی طور پر نافذ فرمادی تھیں، اس سے پہلے آپ ان اصولوں کی مجمل دعوت پہلے پوشیدہ طور پر، اس کے بعد اعلان دیتے رہے۔ اس سلسلے میں

آپ کو ہر قسم کی تکالیف اور پریشانیاں برداشت کرنی پڑیں۔ یہاں تک کہ قتل اور جلاوطنی کی دھمکیاں بھی دی جاتی تھیں۔ لہٰذا مجبور ہو کر مسلمانوں نے بار بار ہجرت کی۔ آپ کی ہجرت کے ساتھ تمام مسلمانوں نے مکہ معظمہ سے ہجرت اختیار کی۔ اس وقت مسلمانوں کو سیاسی طاقت حاصل ہوئی اس لئے مشرکین مکہ ان کے گھر پر آکر ان پر حملہ کرتے تھے لہٰذا مسلمان ہمیشہ مشرکین مکہ کے ساتھ جنگ کرتے رہے۔ مسلمانوں کے پڑوسی اہل کتاب کی حالت بھی اس طرح تھی۔ اس لیے آپ نے یہودیوں کے ساتھ معاہدہ کیا کہ ان کی جان و مال اور ان کا مذہب محفوظ رہے گا بشرطیکہ وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں بت پرستوں کی مدد نہ کریں مگر انہوں نے بار بار معاہدہ شکنی کی بلکہ جنگ کی اور اپنے علاقہ سے انہیں جلاوطن کر دیا گیا۔ دوسری طرف مسلمان چھ سال تک مشرکین مکہ سے مدافعانہ جنگ لڑتے رہے کیوں کہ وہ کمزور تھے تاہم خدائی مدد ان کے شامل حال رہی جب کہ ان کا طاقتور دشمن ہمیشہ شکست کھاتا رہا۔ ۶ھ کے آخر میں آنحضرت ﷺ نے مشرکین سے حدیبیہ کا معاہدہ کیا تھا کہ دس سال تک جنگ نہ ہو مگر مشرکین نے غداری کر کے معاہدہ شکنی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فریقین میں پھر جنگ شروع ہوگئی آخر کار مسلمانوں نے قریش کا مذہبی اور دنیاوی پایۂ تخت اور تمام عرب کے مرکزی مقام مکہ معظمہ کو ۸ھ میں فتح کر لیا۔ ۱۰ھ کے آخر میں رسول اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع ادا فرمایا اسی موقع پر عرفہ کے دن یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (پ۶: ۳)

(آج میں نے تمہارے مذہب کو مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت کی تکمیل کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کے دین کو میں نے پسند کر لیا ہے۔)

اسی طرح دس سال کے اندر وہ عرب قوم متحد ہوگئی جو دنیا کی تمام قوموں سے زیادہ ہمیشہ نااتفاقی، تفرقہ اندازی اور باہمی اختلافات کا شکار رہی۔ یہ حیرت انگیز کارنامہ کتاب اللہ کی تاثیر اور خدائی مدد کا نتیجہ تھا جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (۸: ۶۲ - ۶۳)

(وہ خدا ہی ہے جس نے تمہاری اور مسلمانوں کی امداد کی اور ان کے دلوں میں محبت پیدا کی اگر تم روئے

زمین کی ساری دولت صرف کر دیتے تو اس وقت بھی تم ان کے دلوں کو نہیں جوڑ سکتے تھے مگر یہ اللہ ہی ہے جس نے ان کو دلوں کو جوڑا، وہی عزت والا اور حکمت والا ہے۔)

خدا ہی نے آپ ﷺ کے اندر شریفانہ اخلاق کی تکمیل فرمائی اور آپ ﷺ کو عمدہ سیاست کی توفیق وہدایت عطا فرمائی جیسا کہ اس آیت کریمہ میں مذکور ہے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (۳: ۱۵۹)

(اے پیغمبر) اللہ کی مہربانی کی وجہ سے ان لوگوں کے لئے آپ کا دل نرم ہو گیا ہے اگر آپ سخت مزاج اور سخت دل ہوتے ہیں تو یہ لوگ آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے لہٰذا آپ ان سے درگذر کیجئے ان کے لئے بخشش طلب کیجئے ان سے کاموں میں مشورہ لیجئے۔)

عربوں کا باہمی اختلاف اسی وجہ سے تھا کہ عرب قوم کسی کے آگے جھکنا اور اس کی اطاعت کرنا جانتے ہی نہ تھے کیونکہ وہ ہمیشہ خود مختار اور آزاد رہے تھے اور سخت جنگجو تھے اسی وجہ سے وہ ان ظالم وجابر بادشاہوں اور سرکش مذہبی رہنماؤں کے ظلم واستبداد کا شکار نہیں رہے جو قوموں کو ذلیل ورسوا کر کے چھوڑتے تھے اور انہیں ہر طاقتور حکمران کے سامنے جھکنے کا خوگر بنا دیتے تھے۔

مؤرخین کو چیلنج :

اب ہم مورخین کو چیلنج دیتے ہیں کہ وہ ہمیں کوئی ایسا پیغمبر، فلسفی فاتح یا قانون ساز بادشاہ کا نام بتائیں۔ جس نے اپنی قوم کی تربیت دس سال یا بیس سال کی مدت میں مکمل کرلی ہو اور اسے اس قابل بنایا ہو کہ وہ دوسرے ممالک کو فتح کرلے اور مہذب اقوام پر عادلانہ منصافانہ سیاست کے ساتھ حکمرانی کرے یہاں تک کہ وہ ان قوموں کو اپنے اعلیٰ نمونہ سے اپنا گرویدہ بنالے کہ وہ اپنے مذاہب اور اپنی زبان کو چھوڑ کر ان کی زبان اور مذہب اختیار کرلیں۔

یہ ہمارا کھلا اور غیر مشروط چیلنج ہے۔ اس سلسلے میں ہم یہ شرط بھی نہیں لگاتے کہ وہ قوم جس کی کسی انسان نے تعلیم وتربیت کی ہو وہ اپنی سرکشی اور خرابی میں عرب قوم کے برابر ہو اور ان کا مربی حضرت محمد ﷺ کی طرح امی اور ناخواندہ ہو۔

علوم و فنون، فلسفہ، قوانین، تہذیب و تمدن اور اعلیٰ سماجی، جنگی نظام کے دور حاضر میں جرمن اور اطالوی قومیتیں محمد ﷺ کے اس بین الاقوامی اتحاد کا مقابلہ نہیں کر سکیں جو ناخواندگی اور جہالت کے زمانہ میں تکمیل پذیر ہوا تھا بلکہ اس اسرائیلی اتحاد کا، جو معجزات اور عجائبات کے زمانہ میں قائم ہوا اس خاص عرب اتحاد اور عام اسلامی اتحاد سے مقابلہ نہیں ہو سکتا جو قرآن کریم کی آیات اور اسی کے علوم الٰہیہ کے عہد میں رونما ہوا۔ پھر اس اعلیٰ شریعت اور مثالی ہدایت کو محمد ﷺ کے خلفائے راشدین اور بہت سے مسلمان نیک بادشاہوں نے جس طرح نافذ کیا اس کی شہادت تاریخ دے رہی ہے۔ چنانچہ مغربی اور دوسرے انصاف پسند مورخین بھی یہ اعتراف کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے انصاف کے ساتھ رحم و شفقت کو بھی ملحوظ رکھا۔ انہوں نے انسانی تہذیب و تمدن کو از سر نو زندہ کیا اور اسے ترقی دی بلکہ مردہ علوم و فنون کو بھی زندگی بخشی، انہیں سنوارا اور بار آور کیا۔ اس طرح وہ علم و فن میں تمام دنیا کے استاد بن گئے۔

پھر اس مذہب کی صداقت اور نیکی کی زبردست طاقت کا ثبوت یہ ہے کہ مغرب کی تمام متمدن اور وحشی قوموں نے اپنی تمام صلیبی قوتوں سے اس کی دشمن بن کر اس سے جنگ کی۔ اس کے بعد ابھی تک وہ اپنے موجودہ علوم و فنون اور اپنے حیرت انگیز تمدنی نظام کے ذریعے اس سے جنگ کر رہی ہیں بلکہ کروڑوں روپیہ اسی مقصد کے لیے صرف کیا جا رہا ہے کہ کسی طرح اس مذہب سے اس کے ماننے والوں کو برگشتہ کر دیا جائے حالانکہ ان کی سلطنتیں مٹ چکی ہیں اور ان کی قوموں پر جہالت مسلط ہے تاہم ان تمام خرابیوں کے باوجود مغرب کی مشنری طاقتیں اپنے پورے نظام اور زبردست وسائل کے ساتھ زور و شور سے کام کر رہی ہیں بلکہ اس مقصد کے لیے قادیانی جیسے ملحد فرقے بھی ان کی امداد کر رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ عیسائی سلطنتیں اور ان کی مذہبی انجمنیں بیہودہ طریقوں سے ظلم و سرکشی اور دروغ گوئی کا اسلام کے خلاف ایک ایسا انبار جمع کر رہی ہیں جسے دیکھ کر بدترین مجرم بھی شرما جائیں۔ مگر ان تمام کوششوں کے باوجود یہ لوگ آج تک اس مذہب کی عمارت کو نہ منہدم کر سکے اور نہ کسی مسلمان کو عیسائی بنا سکے (جیسا کہ مشہور فرانسیسی مستشرق ڈاکٹر مارڈریس نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں مشنری پادریوں کی متفقہ رائے نقل کی ہے ملاحظہ ہو دیباچہ طبع اول)

يُرِيدُونَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝

(پ۹: ۳۲-۳۳)

(دشمن چاہتے ہیں کہ خدا کے نور کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھادیں مگر اللہ کا فیصلہ ہے کہ وہ اپنے نور کی تکمیل کر کے رہے گا خواہ کافر اسے ناپسند کریں۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ اسے تمام مذاہب پر غالب کرے خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی برا لگے۔)

مغربی اقوام کو دعوت اسلام:

یورپ، امریکہ اور جاپان کی مہذب اقوام کو اسلام کی دعوت دی جاتی ہے تاکہ عالم انسانیت کی مادی اصلاح ہو۔ اس طرح ایک عالمگیر انسانی برادری کا وجود عمل میں آئے گا اور انسانیت سلامتی اور امن وامان سے لطف اندوز ہوگی۔ اگر عہد حاضر کے مغربی اور غیر مغربی سائنس داں، ماہرین اجتماع واخلاق اور مورخین ہمارے سامنے محمد ﷺ جیسی کوئی شخصیت نہیں پیش کر سکتے۔ وہ شخصیت جو تاریخ کی جانی پہچانی شخصیت ہے جو نہ صرف قرآن کریم جیسی عظیم الشان کتاب لائی جس کی تعلیمات کا خلاصہ اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے۔ بلکہ اس کی تعلیمات کو عرب قوم میں نافذ بھی کیا اور اس میں ایسا انقلاب پیدا کیا کہ ان کے مذہب وتمدن سے تمام دنیا متاثر ہوئی۔

لہٰذا اگر یہ سب افراد ایسی شخصیت کا جواب پیش کرنے سے قطعی طور پر عاجز ہیں تو کیا ان کی یہ بے بسی اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ محمد ﷺ کا مذہب، ان کی کتاب، ان کی تعلیم وتربیت جس نے نظام کائنات میں انقلاب پیدا کر دیا تھا خلاف عادت معجزہ ہے۔

اگر یہ فی الواقع معجزہ ہے تو کیوں نہ محمد ﷺ کی تعلیمات کو علم وحکمت والے خدا کی وحی تسلیم کی جائے کیونکہ وحی کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ ایک ایسا علم ہے جسے اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کی روح وقلب کو ایک ایسے مخفی طریقہ سے عطا فرمایا جو تحصیل علم کے مروجہ طریقہ سے مختلف تھا اور ان نفسی الہامات سے بھی مختلف تھا، جن سے بعض خاص افراد متاثر ہوتے ہیں۔ اس علم کے معجزہ ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ایسے طریقے سے حضرت محمد ﷺ کو حاصل ہوا جو انسانوں کے مروجہ علمی طریقوں سے جدا

تھا جن کا بیان نفسیات، فلسفہ، علم الاجتماع، تاریخ اقوام اور حکماء علماء وسلاطین کے حالات میں کیا گیا تھا۔ بلکہ یہ طریقہ خود پیغمبروں کے طریقہ سے بھی الگ تھا۔ گو اس کا تعلق انبیاء کی قسم سے ضرور تھا کیونکہ پیغمبروں نے اپنے زمانے میں بعض غیبی امور کی اور بعض آئندہ باتوں کی پیشین گوئی کی تھی لیکن محمد ﷺ کی پیشین گویاں ان کی تمام پیشینگوئیوں سے زیادہ صاف، واضح اور تعداد میں زیادہ ہیں۔ آپ ﷺ نے اپنے زمانے سے صدیوں برس پہلے کی غیبی باتوں کی خبر دی نیز آپ ﷺ کے علم وحکمت اور قوانین کے جو مذکورہ بالا اصول پیش کیے ویسے اصول کوئی پیغمبر بھی پیش نہیں کر سکا۔

اے روشن خیال علماء! ہم ان تمام شکوک وشبہات اور توجیہات کی تردید کر چکے ہیں جن کی بناء پر آپ ﷺ کے منکرین نبوت آپ ﷺ کی پیش کردہ اعلیٰ علم الٰہی، بلند ترین تمدنی شریعت اور برتر اخلاقی حکمتوں کو آپ ﷺ کی ذاتی معلومات واستعداد اور ماحول کا نتیجہ بتاتے ہیں یا سفر میں بعض بدوؤں کے اقوال سے ماخوذ ثابت کرتے ہیں حالانکہ ایسی بے سروپا باتیں یاد کرنے کے قابل نہیں ہوتیں۔ یا وہ انہیں بعض اہل کتاب کے خیالات کا عکس بتاتے ہیں حالانکہ وہ ان کے پرانے قصے قابل اعتبار نہیں بن سکتے اور یہ آپ کے شان سے بھی بعید تھے۔ آپ لوگوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ جو باتیں انہوں نے کہی ہیں وہ تاریخ پر بہتان اور جھوٹے الزامات ہیں اور یہ سب باتیں ناکارہ اور علم وفلسفہ، قانون فطرت اور تاریخی واقعات کے سراسر خلاف ہیں اور ان کی گفتگو کا جس قدر حصہ صحیح ہے اس سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان کا دعویٰ سچا ہے۔

لہٰذا اب ہم تمھیں چلینج کرتے ہیں کہ گذشتہ صفحات میں ہم نے اللہ تعالیٰ کی وحی اور محمد ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب اور آپ کی قطعی تاریخ کے بارے میں جو کچھ تمہارے سامنے پیش کیا ہے اس کی تردید ایسے دلائل کے ساتھ کرو جو عقل کی ترازو یعنی منطق، قوانین قدرت اور علم الاجتماع کے معیار پر پورے اتر سکیں۔

لیکن اگر تم کوئی ایسا ثبوت نہ پیش کر سکو جسے عقل قبول کر سکے اور منقول کتب بھی اس کی تائید کر سکیں تو ایسی صورت میں تمہارا یہ فرض منصبی ہے کہ تم محمد ﷺ کی نبوت ورسالت پر اور ان کی اس کتاب پر ایمان لے آؤ جو اللہ تعالیٰ نے ان پر انسانی اصلاح کے لیے نازل فرمائی ہے۔ تم پر یہ بھی فرض ہے کہ تم ایمان کی اس تحریک کی حمایت کرو اور اس

کے ذریعہ موجودہ معاشرہ کی بیماریوں کا علاج کرو بالخصوص جب کہ تمہارا وسیع علم اور دقیق فلسفہ اسی معاملہ میں ناکام ہو چکا ہے اور وہ ان کی شہوت پرستی اور قوموں کے فکر و ذہن کی پریشانی اور ابتری کا کوئی علاج نہیں کر سکا ہے۔

تمہارا علم و فلسفہ اس میں بھی ناکام رہا ہے کہ وہ تمہاری مہذب حکومتوں کو ظالمانہ جنگوں اور تباہ کن لڑائیوں سے روکے تاکہ روئے زمین کی قومیں عداوت اور دشمنی کے شعلوں سے محفوظ رہیں مگر ایسا نہیں ہوا بلکہ قوموں میں دشمنی اور عداوت کی آگ بھڑکتی ہی رہی اور ان مہذب قوموں نے وہ خون ریزی برپا کی، جنھیں دیکھ کر وحشی قبائل وحشی درندے پرندے اور مچھلیاں بھی شرما جائیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان مہذب سلطنتوں کے نزدیک سائنس اور ان تمام وسیع علوم کا انتہائی مقصد یہ ہے کہ عالم انسانیت پر بڑی سے بڑی مصیبتیں نازل کی جائیں۔

اے روشن خیال علماء! اگر تم ان سب حقیقتوں کو معلوم کر لینے کے بعد بھی اسلام کے "پیغام امن" سے منہ موڑو گے تو تم اپنی قوموں، اپنی حکومتوں اور دنیا کے تمام انسانوں کے جرائم اور گناہوں کے ذمہ دار ہو گے۔

انسانی علوم کی ناکامی:

احساس اور مشاہدہ سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ محض انسانی علم انسانوں کی اصلاح نہیں کر سکتا کیونکہ افراد انسان اپنے قومی اور انفرادی مفادات کو صرف اس وجہ سے نہیں چھوڑیں گے کہ وہ انہی کے اپنے افراد کے بنائے ہوئے اصولوں کے خلاف ہیں۔ انسان اگر جھکتا ہے تو صرف خدا کے فطری قوانین کے آگے جھکتا ہے جن کا سمجھنا انسانی علوم کی دسترس سے باہر ہے۔ یعنی وہ صرف اپنے پروردگار کے احکام کو مانتا ہے اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ روئے زمین پر اسلام کے سوا اور کوئی عالمگیر صحیح اور مکمل مذہب موجود نہیں ہے۔

ہم تمھیں بتا چکے ہیں کہ اسلام کے روحانی، سیاسی اور سماجی قوانین کے اصول کیا ہیں اور وہ کس طرح ہر مقام اور ہر زمانے کے لیے مناسب ہیں۔ یہ بھی واضح کیا جا چکا ہے کہ اسلام ہی امن و صداقت، انصاف اور مساوات کا مذہب ہے جو ہر قوم اور ہر فرد کو اس کا حق دیتا ہے۔ صرف اسلام ہی دنیا کی تمام مالی سیاسی جنگی اور سماجی بیماریوں کا علاج ہے۔ کیونکہ

یہودیت ایک عارضی اور وقتی مذہب تھا جس کا زمانہ ختم ہو چکا۔ عیسائیت بھی یہودیوں کے لیے محض ایک روحانی اصلاح کی تحریک تھی، اس کے اپنے کوئی مستقل شرعی قوانین نہیں ہیں اور اس کی عاجزانہ اور زاہدانہ ہدایات موجودہ زمانے کے تمدن کے لیے مناسب نہیں ہیں۔ یہ مذہب بھی وقتی طور پر یہودیوں اور رومیوں کی دنیاوی طمع اور شہوت پرستی کی اصلاح کے لیے آیا تھا۔

ہندو مذہب، بدھ مت اور مجوسیت میں جیسا کہ آپ لوگوں کو معلوم ہے، بت پرستی اور مقامی رنگ جھلکتا ہے اس میں خرافات، باہمی عداوت اور طبقاتی کشمکش کا بیان ہے بلکہ وہ قابل احترام انسانوں کے جانوروں اور حشرات الارض میں تبدیل ہونے کے قائل ہیں اور اس طرح ان میں اور بہت سی قابل اعتراض چیزیں پائی جاتی ہیں۔ اس لیے ان تمام مذاہب میں طبائع کو روشن کرنے کے لیے توحید، معرفت خداوندی اور عالمگیر انسانی برادری کے اصول نہیں ہیں۔ ایسی حالت میں انسانوں کے لیے مذہب اسلام کے علاوہ اور کوئی پناہ گاہ نہیں ہے جیسا کہ خداوند تعالیٰ خود فرماتا ہے۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْعِلْمُ بَغْیًا بَیْنَھُمْ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ فَاِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾ (۳:۱۹)

(اللہ کے نزدیک دین اسلام ہی ہے اہل کتاب میں اسی وقت سے اختلاف واقع ہوا جب ان میں علم سرکشی بن کر آیا اور جو اللہ کی آیات سے انکار کرے تو وہ جلد حساب لینے والا ہے۔)

لہٰذا اگر کوئی منظم اور طاقتور قوم اس کی ہدایت کو قبول کرے تو اس کی بدولت نہ صرف تمام قوموں کو ہدایت حاصل ہو جائے گی بلکہ خود اس قوم کو روئے زمین پر اعلیٰ قیادت حاصل ہو گی۔ ایسی صورت میں عالم انسانیت ترقی کے نئے دور کا آغاز کرے گا جس میں مادی طاقتوں کے مفادات روحانی علوم کے ساتھ ملے جلے ہوں گے اور مادیت اور روحانیت کا اجتماع ہی انسانیت کی انتہائی شادکامی ہے۔

آزاد خیال علماء سے توقعات:

ہمیں یہ معلوم ہوا تھا کہ تم میں سے بعض علماء نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ بڑے بڑے علماء کی ایک کانفرنس منعقد ہو اور وہ ان وسائل پر غور کرے جن کے ذریعے

موجودہ تہذیب کو قوموں اور سلطنتوں کی باہمی عداوتوں اور رقابتوں کی تباہیوں سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر یہ کانفرنس منعقد ہوتی تو ان کانفرنسوں سے زیادہ نتیجہ خیز نہ ثابت ہوتی جنہیں موجودہ سلطنتیں "مجلس اقوام" میں یا اپنے سیاسی مرکزی مقاصد پر منعقد کرتی ہیں جن کے ذریعے قومی بیماریاں زیادہ پیچیدہ ہوتی گئیں اور خطروں میں کہیں زیادہ اضافہ ہوتا گیا اور وہ قومیں جو دنیا کی دولت کو استعمال کرتی ہیں وہ اور زیادہ مفلس ہوتی گئیں۔

حالانکہ ان کے سامنے وہ دوا موجود ہے جو تمام بیماریوں کے لیے اکسیر ہے مگر وہ انہیں نظر نہیں آرہی ہے۔ اس کے کھلے دلائل انہیں پکار پکار کر اپنی طرف بلا رہے ہیں مگر وہ نہیں سن رہے ہیں۔

وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ۭ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ (۸: ۲۳)

(اور اگر اللہ ان میں بھلائی دیکھتا تو وہ ضرور انہیں سنوارتا اور اگر وہ انہیں سنوارتا تو وہ منہ موڑ کر کنارہ کشی کر لیتے۔)

لیکن اے روشن خیال علماء! تم سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ تم سنو گے اور دیکھو گے اور معلوم کر کے اس پر عمل کرو گے۔ اگر اصلاح انسانی کی ضامن قرآنی تحریک کی حقیقت تمہیں ایسے صحیح طریقے سے نہیں معلوم ہوئی جو دعوت فکر و نظر دے سکے، اس وجہ سے کہ اس پر پردے پڑے ہوئے تھے یا اس وجہ سے کہ تم نے اپنی مسلمہ رسوم و روایات اور طبعی رجحانات سے الگ ہو کر خلوص دل کے ساتھ اس کی تحقیق کی کوشش نہیں کی تھی یا اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس وقت اسلام صحیح قسم کی قیادت سے خالی ہے اور نہ اس کی کوئی تبلیغی جماعتیں موجود ہیں اور نہ کوئی ایسی سلطنت ہی باقی رہی ہے جو اسلامی احکام کو جاری کرے اور اسلامی تہذیب و تمدن کو نافذ کرے بلکہ موجودہ مسلمان خود ہی مجموعی طور پر اپنی حالت سے اسلام کے دعووں کی عملی تردید کر رہے ہیں اور اس کی روشنی کے سامنے پردہ بنے ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں اور بہت سے حجابات اور اسباب ہیں جنھیں میں نے اس کتاب کے مقدمہ میں بیان کیا ہے۔

اگر حقیقت یہی ہے تو مجھے توقع ہے کہ یہ کتاب موجودہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق تمہیں قرآنی تحریک کو سمجھانے کی لیے کافی ہوگی۔ اگر اس کے ذریعہ تم پر حق ظاہر

ہوگیا تو تمام عالم انسانیت کی بھلائی کے لیے میری یہی دلی تمنا اور عین آرزو ہے لیکن اگر تمھیں اس میں کوئی شک وشبہ درپیش ہو تو مجھے تمہاری علم دوستی اور حق پسندی سے یہ امید ہے کہ تم اپنے شبہات ہمارے سامنے پیش کرو گے تاکہ ہم جواب دے سکیں اور جیسا کہ تمھیں معلوم ہے، صداقت بحث وتمحیص کے بعد ہی آشکار ہوتی ہے۔

مجھے یہ توقع نہیں ہے کہ اس کتاب میں اسلامی اصولوں کا مطالعہ کرنے کے بعد تم محض اس وجہ سے شک وشبہ میں پڑ جاؤ گے کہ اسلام میں غیب کی خبریں اور غیر محسوس باتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ درحقیقت تمہارا یہ شبہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ ان چیزوں کے برخلاف تمہارے پاس کوئی دلیل موجود نہیں ہے پھر یہ بھی ذہن نشین کرنا چاہیے کہ مذہب کا سرچشمہ عالم غیب ہی ہے۔ اگر انسان یہ سب باتیں اپنے ذاتی علم کے ذریعے معلوم کر سکتا تو اسے وحی کے ذریعے معلوم کرانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ جب ہم نے قرآنی تعلیمات کے ذریعے یہ ثابت کر دیا ہے کہ قرآن کریم عالم غیب کی وحی کا نتیجہ ہے۔ نیز جب خدا کے وجود اور اس کے علم وحکمت کو ثابت کیا جاچکا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس کی تمام خبریں تسلیم کرلی جائیں۔ تمہارے لیے بھی معلوم کرلینا کافی ہے کہ قرآن کریم میں کوئی ایسی بات موجود نہیں ہے جو عقل کی رو سے محال ہو بلکہ قرآن کریم میں بکثرت ایسی باتیں موجود ہیں جنھیں پہلے عقلی طور پر محال سمجھا جاتا تھا مگر بعد میں علمی ترقیوں نے ان کا وجود ثابت کر دیا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جنت والے دوزخ والوں سے آپس میں باتیں کریں گے اور وہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے حالانکہ ان میں بہت فاصلہ ہوگا۔ (مگر ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی ایجادات کے بعد یہ بات ممکن ہوگئی ہے) تم ان لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جن کے بارے میں خداوند تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے۔

هَاَنۡتُمۡ هٰۤؤُلَآءِ حَاجَجۡتُمۡ فِيۡمَا لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِيۡمَا لَيۡسَ لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ‌ ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۶﴾ (۳:۶۶)

(دیکھو! تم اس معاملہ میں جھگڑ چکے ہو جس کے بارے میں تمھیں علم تھا لہٰذا تم اس بات میں کیوں جھگڑا کررہے ہو جس کے بارے میں تمھیں کچھ علم نہیں ہے۔ خدا (زیادہ) جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو۔)

قرآن کے طبیعاتی اور فلکیاتی معجزات :

قرآن کریم نے مادی عالم غیب کی تکوین و تاریخ کے بارے میں جو معلومات بتائی ہیں ان میں اس کا مثبت معجزہ یہ ہے کہ اس نے انہیں ایسے عجیب انداز بیان میں بیان کیا ہے کہ موجودہ زمانہ میں علم و تاریخ کی روشنی میں ان کا مفہوم واضح ہوتا جارہا ہے حالانکہ اس زمانے میں جب یہ قرآن کریم نازل ہوا تھا لوگوں کے وہم و گمان میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ ان کا یہ مطلب ہو سکتا ہے۔

اس کا منفی معجزہ یہ ہے کہ صدیاں گذر گئیں مگر آج تک کسی قطعی دلیل سے قرآن کریم کی کسی بات کی تردید و تکذیب نہیں ہو سکی، حالانکہ قرآن کریم میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ محض وعظ و نصیحت اور عبرت و تہذیب کے لیے ہیں، ایسی خبریں لوگوں کی روز مرہ زبان میں ان کی معلومات کے مطابق بیان کی جاتی ہیں لہٰذا ان خبروں اور قصوں پر یہ اعتراض نہیں کیا جاسکتا کہ ان میں فنی حقائق اور تاریخی واقعات کی تشریح کیوں نہیں کی گئی۔ کیونکہ پیغمبر تاریخ یا فنی حقائق بیان کرنے کے لیے بھیجے نہیں جاتے ہیں۔ پھر ان حقائق و واقعات میں کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں وسیع علم اور آلات کی مدد کے بغیر نہیں معلوم کیا جاسکتا تھا اور یہ آلات وحی کے اول مخاطبین کے زمانے میں موجود نہ تھے۔ اسی لیے پیغمبروں کے لیے ایسی باتیں بیان کرنا ہرگز مناسب نہیں تھا جنھیں سننے والے اپنی علمی استعداد کی کمی کی وجہ سے نہ مان سکیں اور نہ سمجھ سکیں۔ اسی طرح ایک فتنہ کھڑا ہو سکتا ہے لہٰذا ہمارے پیغمبر انسانیت نے اس وقت صحیح فرمایا تھا۔ انتم اعلم بامورد نیاکم (تم اپنے دنیا کے کاموں کو زیادہ جانتے ہو۔ (مسلم)

قرآن کریم کے دقیق انداز بیان کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ لوگوں کا اس بات کے سمجھنے میں اختلاف رہا ہے کہ کائنات کی پیدائش کا مادہ دخان (دھواں) ہے۔ یہ وہی لفظ ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں ایتھر (سدیم) کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ آسمان و زمین دونوں رتقا تھے یعنی ایک ہی متصل مادہ تھا پھر خدا نے انہیں الگ الگ کر کے ہر ایک کو جداگانہ صورت دی اور ان میں مختلف جانداروں کو آباد کیا۔ اس وقت کوئی بھی یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ ان اجرام سماویہ میں کوئی جاندار چیز موجود ہے۔

قرآن کریم نے یہ بھی فرمایا کہ خدا نے ہر زندہ چیز کو پانی سے بنایا ہے اور اس نے

تمام بناتات وحیوانات کو جوڑے جوڑے پیدا کیا ہے اور ہر ایک میں نر ومادہ رکھے ہیں۔ اس میں یہ بھی ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اس نے ہر نباتات کو موزون بنایا ہے یعنی اس کے عناصر مقررہ تناسب کے مطابق متوازن ہیں۔ یہ بھی ارشاد ہے کہ اس نے جوڑا لگانے والی (بار آور) ہوائیں چلائیں اور یہ بھی آیا ہے۔

يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ (۳۹:۵)

(خدا رات کو دن پر لپیٹتا ہے اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے۔)

تکویر کے معنی یہ ہیں کہ گول جسم پر کسی چیز کا لپیٹنا۔ اس لفظ کے استعمال سے یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ زمین گول ہے اور وہ گردش کرتی ہے حالانکہ یہ مسئلہ اسلام کے بعد کے زمانہ تک اس زمانے کے علماء میں محل نزاع بحث بنا ہوا تھا۔ اس قسم کی مثالیں قرآن کریم میں بہت سی ہیں۔ یہاں تک کہ آفتاب چاند ستاروں اور ان کا آسمان میں تیرنا اور مقرر مدت تک اس کے چلنے کا حال بھی بیان کیا گیا ہے۔ نیز یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دنیا کی تباہی کے موقع پر ستارے بکھر جائیں گے۔ اب یہ سب باتیں جدید علم فلکیات کی روشنی ہی میں صحیح طریقے سے سمجھی جاسکتی ہے۔

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ قرآن کریم نے یہ بیان کیا ہے کہ کائنات کے اٹل اور نہ بدلنے والے قوانین ہیں۔ نیز اس نے ایسے سماجی قوانین بھی بیان کئے ہیں جن کا پتہ انسانوں کو بڑی علمی تحقیقات سے سینکڑوں برس کے بعد ہوا۔ میں نے اس قسم کے قوانین کا اس کتاب میں اس لئے ذکر نہیں کیا ہے کہ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ یہ چیز تو عقل سے بھی معلوم کی جاسکتی ہے۔ لہٰذا اس کے لئے وحی کی ضرورت نہیں ہے۔ (اگر ممکن ہوا تو میں کتاب کے دوسرے حصے میں انشاء اللہ بیان کروں گا۔)

آخر میں اپنے اس پیغام کو ان آیات کریمہ پر ختم کرتا ہوں۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهٖ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ۝ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَاۗءِ رَبِّهِمْ ۭ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ ۝ (۴۱: ۵۲، ۵۴)

(کہہ دیجئے بتلایہ تو بتاؤ کہ اگر قرآن کریم اللہ کے پاس سے آیا ہوا ہو اور تم اس سے انکار کرو تو اس شخص سے زیادہ کون گم کردہ راہ ہوگا جو حق سے اتنی لمبی مخالفت میں مبتلا ہے۔ عنقریب ہم اپنی نشانیاں انہیں

آفاق میں دکھائیں گے اور ان کی ذات اور نفس میں بھی (یہ نشانیاں ظاہر کی جائیں گی) یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے کہ قرآن کریم ہی حق ہے۔ کیا تمہارے پروردگار کی یہ بات کافی نہیں ہے کہ وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔ یہ لوگ اپنے پروردگار کے سامنے جانے کے بارے میں شک وشبہ میں مبتلا ہیں۔ یاد رکھو خدا ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔)

اے خدا! میں نے اسلام کا پیغام پہنچا دیا ہے! اے خدا! جہاں تک مجھ سے ہو سکتا ہے میں اصلاح کی کوشش کرتا ہوں۔ اے خدا! تو اس بات پر گواہ رہ کیونکہ تو ہی بہترین شاہد ہے۔

تمام شد۔

حکمتِ قرآن انسٹیٹیوٹ

ترجمان القرآن

مترجم: امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ

برصغیر میں قرآن فہمی کی روایت کا آغاز شاہ ولی اللہؒ کے خاندان سے ہوا، جسے امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد جیسے مجدد العصر نے اپنی خداداد صلاحیت، فطری ذہانت، عبقری دماغ اور مجتہدانہ بصیرت کے ذریعے مسلمانوں کے لیے ارمغان ہدایت بنادیا۔ مولاناؒ کی مادری زبان عربی تھی، جس کے باعث انہوں نے قرآن مجید کی اردو ترجمانی کو قرآن فہمی کا سب سے بڑا شاہکار بنادیا۔ برصغیر کی اس بلند پایہ تفسیر ترجمان القرآن سے ماخوذ مبسوط ترجمہ:

صفحات 832 ہدیہ: =/300 روپے

حجۃ الاسلام حضرت امام شاہ ولی اللہ کی دینی فکر کے شارحِ اعظم

حکیم الاسلام امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھیؒ

کی قرآن فہمی دنیائے اسلام میں ممتاز مقام رکھتی ہے۔ یہ کتاب قرآن حکیم کی متعدد سورتوں کا تفسیری مجموعہ ہے، جس میں حکمت ودعوتِ قرآن، رموز غلبۂ اسلام اور دین اسلام کے سیاسی و معاشی اصولوں کو قرآن حکیم کی روشنی میں جامع تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

صفحات 480 ہدیہ: 300 روپے

برصغیر میں قرآن فہمی کی روایت کا آغاز شاہ ولی اللہؒ کے خاندان سے ہوا، جسے امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد جیسے مجدد العصر نے اپنی خداداد صلاحیت، فطری ذہانت، عقبری دماغ اور مجتہدانہ بصیرت کے ذریعے مسلمانوں کے لیے ارمغان ہدایت بنادیا۔ مولاناؒ کی مادری زبان عربی تھی، جس کے باعث انہوں نے قرآن مجید کی اردو ترجمانی کو قرآن فہمی کا سب سے بڑا شاہکار بنادیا۔ برصغیر کی اس بلند پایہ تفسیر ترجمان القرآن سے ماخوذ مبسوط ترجمہ:

صفحات 832 ہدیہ: =/300 روپے

حجۃ الاسلام حضرت امام شاہ ولی اللہؒ کی دینی فکر کے شارح اعظم حکیم الاسلام امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی قرآن فہمی دنیائے اسلام میں ممتاز مقام رکھتی ہے۔ یہ کتاب قرآن حکیم کی متفرقہ سورتوں کا تفسیری مجموعہ ہے، جس میں حکمت و دعوتِ قرآن، رموز غلبۂ اسلام اور دین اسلام کے سیاسی و معاشی اصولوں کو قرآن حکیم کی روشنی میں جامع تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ قرآن کے انقلابی فکر کی شارح دنیائے اسلام کی یکتا تفسیر

صفحات 480 ہدیہ: 300 روپے

پیغمبرِ انسانیت ﷺ کی حیات طیبہ پر برصغیر کے جید حکیم علماء کی کتابوں سے ماخوذ جامع سیرت مبارکہ تعلیمات وحی اور مقاصدِ نبوت کی روشنی میں انقلاب مکہ اور سیرت النبی ﷺ کا جامع مطالعہ جس میں امت کے لیے اعلیٰ انسانی شخصیت کے تعمیر، تہذیب اخلاق، تعمیر ملت، دعوت و تبلیغ اور غلبہ اسلام کے قرآنی اصول آیات و احادیث کی روشنی میں شرح و بسط سے بیان کیے گئے ہیں۔

صفحات: 536 ہدیہ =/300 روپے

حکمتِ قرآن انسٹیٹیوٹ

6- سندھی جماعت کوآپریٹو سوسائٹی
نیشنل ہائی وے کراچی
رابطے کیلئے 21-4213117

الوحی المحمدی ﷺ

مصنفہ

...یدرضا

...ار

ترجمہ

حافظ سید رشید احمد ارشد